ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ

ترجمہ و توضیح : پروفیسر خالد پرویز

اللهم صل على سيدنا محمد النبی
الامی وعلی آلہ وصحبہ وبارک وسلم

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

ترجمہ و توضیح: پروفیسر خالد پرویز

297.63 محمد حمید اللہؒ، ڈاکٹر
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم / ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ
ملتان، لاہور -: بیکن بکس، 2013ء۔
320ص
1. سیرت۔

اشاعت : 2013ء

عبدالجبار نے
شرکت پرنٹنگ پریس 43 نسبت روڈ لاہور (042-37351007)
سے چھپوا کر بیکن بکس ملتان-لاہور
سے شائع کی۔

قیمت : -/480 روپے

ISBN : 969 - 534 - 047 - 4

انتساب

نبی آخرالزماں

حضرت محمد مصطفےٰ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے

نام

پروفیسر خالد پرویز

6/11 فیصل اسٹریٹ، گلگشت ملتان

061-6522252/300-6302548

حسن ترتیب

چند کھری باتیں!

مگر میں سوچتا ہوں کہ کیا ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ رب رحمٰن و رحیم مجھے میرے آقا جی، رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں ہی پیدا فرماتے اور یوں میں سردار دو جہاں، ہادیٔ کون و مکاں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں دن رات گزارتا جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ذاتی خدمت گاروں کے ساتھ مجھے معاون غلام کے طور پر ہی خدمت کا موقع فراہم فرماتے اور کٹ مرتا میں حکمِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور پائے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سر رکھ کر میں موت کی لذت پاتا اور امر ہو جاتا!

اور ایسا نہیں ہو سکا مگر ایسا تو ممکن ہے کہ رب قادر و قدیر کی منشاء و مرضی سے شافع محشر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم روز جزا میری شفاعت فرما دیں لیکن ایک سوال لحہ لحہ میرے جسم و جاں پر کپکپی طاری کرتا رہتا ہے کہ کیا میں شفیع عاصیاں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت کے اہل بھی ہوں؟

تاہم میں اپنے قلم کو محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف و توصیف میں متحرک و متموج رکھتا ہوں اور یہ سب کچھ رب کریم و عظیم کی عنایت اور لطف و کرم کی بدولت ہی ہوتا ہے۔ دعا کیجیے کہ رب تعالیٰ جل شانہٗ میری اس استطاعت کو فزوں تر فرمائیں تاکہ میں اپنے شب و روز اسی سعادت ہی کے لیے وقف رکھوں۔

سیرتِ رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ترجمہ کے پس منظر میں بھی یہی سوچ کارفرما ہے۔ میں نے حتی الوسع کوشش و کاوش کی ہے کہ ترجمہ کے لیے سلیس اور بامحاورہ زبان استعمال کروں۔ لفظوں کے انتخاب، جملوں کی ساخت، روانی کے رنگ کے ساتھ صوتی آہنگ کا بھی خاص خیال رکھوں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے ہمہ قسم کے قاری کیلیے قابل فہم بنا دوں۔

اس کے لیے میں نے ضرورت کے مطابق وضاحت بھی کرنے کی سعی کی ہے جس کے لیے موقع محل کے مطابق تین قسم کی بریکٹ کا استعمال کیا گیا ہے (1) ﴿ ﴾ (2) [ ] (3) ( ) اس کے ساتھ ساتھ کچھ ضروری اہم اضافے بھی کئے گئے ہیں۔

میں اپنے محسن محترم فیض محمد قریشی کا شکرگزار ہوں کہ جو نہ صرف اس کام کے لیے مجھے نت نئی راہیں بھاتے رہتے ہیں بلکہ ایک سچے عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے میری ان کوششوں کو زیورِ طبع سے بھی آراستہ کرنے کا انتظام والصرام فرماتے ہیں۔

میں اپنی بیٹیوں انیلا خالد اور راحیلہ خالد کے لیے دعا گو ہوں کہ جو اس سعادت آفریں قلمی سفر میں میرے ہمرکاب رہتی ہیں اور محترم عبدالجبار کو بھی رب تعالیٰ جل شانہٗ خوش و خرم رکھیں کیونکہ طباعت کا تمام تر حسن انہی کے دم قدم سے ہے۔

غلامِ خیر الانام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
پروفیسر خالد پرویز

باب 1

تعارفی کلمات

(1) صحرائے عرب میں ایک دُوردراز مقام مکہ میں 17 رجون 569 عیسوی کو پیر کے روز ایک بچہ پیدا ہوا جس نے مذہب، سیاست اور تاریخ میں ایسا انقلاب برپا کیا کہ دوست دشمن سب نے اس کی تعریف کی۔ 1400 سال سے زائد کا عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی اس کی نہ صرف ہدایات زندہ ہیں بلکہ ان ہدایات پر عمل کرنے والے بین الاقوامی معاملات میں مؤثر کردار ادا کرتے ہوئے دنیا کے تین براعظموں پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ اس بچے کو دنیا پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے جانتی ہے۔

(2) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے والد حضرت عبداللہ جبکہ والدہ حضرت آمنہ تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کے بارے میں دستاویزات کی قلت سے نہیں بلکہ کثرت سے ایک سوانح نگار کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے (یعنی بعض اوقات روایات کے اختلاف کی وجہ سے اور بعض اوقات جزئیات کی زیادتی کی وجہ سے)۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سیرت نگار کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے رہبر و رہنما کی سوانح لکھنا ہوتی ہے جو سابقہ رسولوں کے برعکس صرف ایک مکمل دینی نظام کے بانی ہی نہ تھے بلکہ بیک وقت ایک حکمران، ایک قانون ساز، ایک فاتح، ایک سالک اور ایک معلم اخلاق بھی تھے۔ مزید یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی شخصیت تھے کہ جن کے اقوال و افعال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لیے زندہ جاوید قوانین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چاہے ان کا تعلق زندگی کے کسی بھی شعبہ سے ہو یعنی دنیا ہو، آخرت ہو، معاشرت ہو یا اخلاق ہو۔ یوں یہ ایک قدرتی امر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح حیات میں مافوق الفطرت اور غیر معمولی باتیں بھی سامنے آئیں گی۔

خاندان اور ولادت:

(3) قرآن حکیم اور بائبل دونوں کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام (تقریباً 800 قبل مسیح) کے دو بیٹے تھے۔ ایک حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تھے اور دوسرے حضرت اسحٰق علیہ السلام تھے۔ انجیل میں حضرت اسحٰق علیہ السلام کے خاندان کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اس لیے اس میں

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا ذکر محض اتنا ہے کہ وہ اپنے والد محترم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کفن دفن کے دوران اپنے بھائی حضرت اسحٰق علیہ السلام کے ہمراہ تھے۔ قرآن مجید خاندان اسمٰعیل علیہ السلام کے فرد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے کی بناء پر ایسی تفصیلات کا حامل ہے جو انجیل میں نہیں ملتیں۔ ان تفصیلات کا ذکر یہاں از حد ضروری ہے۔

قدیم زمانے میں یہ دستور تھا کہ رب رازق ورزاق کی طرف سے عطا کی جانے والی پہلی عنایت چاہے وہ پالتو جانور کا بچہ ہو یا زمین سے اُگنے والی فصل ہو رب تعالیٰ جل جلالہٗ کے راستے میں قربان کر دی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ پیدا ہونے والا پہلا بیٹا بھی رب ذوالجلال کی خوشنودی کی خاطر اس کی راہ میں قربان کرنے کا دستور تھا۔ (بحوالہ انجیل کتاب خروج xiii، 2 اور 12 نیز حزقی ایل XX، 26)

وقت کے ساتھ ساتھ پیدائش کے لحاظ سے پہلے (پہلوٹی) بیٹے کو قربان کرنے کے بدلے میں کسی جانور کی قربانی کا رواج پڑ گیا۔ (بحوالہ کتاب خروج XXXIV، 19-20)
تاہم آثار قدیمہ کی تحقیق سے یہ ثابت ہے کہ قدیم ابتدائی دور میں پہلا بیٹا ہی خدائے بزرگ و برتر کی بارگاہ میں ذبح کر دیا جاتا تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو رب رحمٰن ورحیم نے بڑھاپے کی عمر میں پہلا بیٹا حضرت اسمٰعیل علیہ السلام عطا فرمایا تو انہیں بھی رائج الوقت دستور (رواج) پر عمل کرنا تھا مگر آپ علیہ السلام اس دستور کو بھول گئے تو رب تعالیٰ جل شانہٗ نے آپ علیہ السلام کو یہ بات خواب میں یاد دلائی جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کسی ہچکچاہٹ ورکاوٹ کے بغیر فوری عمل کیا۔ رب تعالیٰ جل شانہٗ ان کی فرض سے لگن اور بندگی کے اس چلن سے اس قدر خوش ہوئے کہ نہ صرف حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ذبح ہونے سے بچا لیا بلکہ دوسرے بیٹے حضرت اسحٰق علیہ السلام کی پیدائش کی خوشخبری بھی دے دی۔

﴿وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾

سورۃ الصافات: 112

"اور خوشخبری دی ہم نے اُن کو (پھر) اسحٰق کی (کہدیا) یہ نیک بندوں میں سے ہوں گے اور نبی"﴾

جبکہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بدلے میں ایک دنبے کو قربان کر دیا گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے دنبے کی اس قربانی نے عوامی مقبولیت حاصل کرتے ہوئے رسم

کی شکل اختیار کرلی جو کہ عربوں میں آمد از اسلام سے پہلے تک قائم رہی مگر یہ رسم صرف اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں جاری تھی حضرت اسحٰق علیہ السلام کی اولاد میں نہیں تھی۔

(4) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی بیوی محترمہ حاجرہ اور اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو صحرا کے ایک ایسے مقام پر لے جا کر ٹھہرا دیا تھا جس نے بعد ازاں مکہ معظمہ کا نام پایا۔ اس صحرا میں پانی کا نام ونشان تک نہیں تھا مگر رب رحمٰن ورحیم کی عنایت سے زم زم کا چشمہ ان کی زندگیوں کی بقا کی ضمانت بن کر اُبل پڑا .... جبکہ حضرت اسحٰق علیہ السلام اپنی والدہ محترمہ سارہ کے ہمراہ فلسطین میں رہائش رکھے رہے البتہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی دونوں بیویوں اور دونوں بیٹوں کے پاس باری باری آتے جاتے رہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے گھر کی نئے سرے سے تعمیر کی اور اسلام کے ایک اہم رکن حج کی بنیاد رکھی۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے قصیٰ (حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچویں پشت) تک کوئی ایسا اہم واقعہ نہیں جو قابل ذکر ہو۔ مکہ معظمہ پر باری باری مختلف قبائل کی حکمرانی رہی۔ پہلے قبیلہ جرہم کی حکمرانی تھی، پھر قبیلہ ایاد نے نظام حکومت سنبھالا۔ ایاد کے بعد قبیلہ خزاعہ کے حصے میں انتظام سلطنت آیا۔ حکمران تبدیل ہوتے رہے مگر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے آباء واجداد مکہ معظمہ ہی میں آباد رہے۔ مکہ معظمہ کے سیاسی وسماجی حالات واصلاحات اور تہذیب وتمدن کے متعلق قصیٰ کے وقت سے ہمارے پاس معلومات واطلاعات کا بہتر خزانہ موجود ہے۔ ان معلومات کے مطابق اس وقت مکہ معظمہ میں ظالمانہ بادشاہت اور مطلق العنانی کی بجائے جمہوریت اور منتخب حکومت کے ساتھ ساتھ نظام مشاورت قائم ہوا۔ ابن قتیبہ نے حتیٰ کہ بازنطین (استنبول) سے باہمی تعلقات کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ بظاہر اس کا تعلق تھیوڈوسس اوّل (395ء-379ء) سے ہے۔ قصیٰ کے فرزند عبد مناف نے خارجہ تعلقات کو خاص طور پر تجارتی مقاصد کیلئے فروغ دیا اور بازنطین، ایران، حبشہ اور کندہ (یمن) کے حکمرانوں کے ساتھ مشہور معاہدہ ایلاف کیا جسے قرآن مجید نے ذکر کر کے زندہ جاوید کر دیا ہے۔ اس معاہدہ کے تحت عبد مناف کو ان ممالک میں تجارتی قافلے لے جانے کا مکمل اختیار حاصل ہو گیا۔ ابن سعد کے مطابق عبد مناف کے تجارتی قافلے بازنطینی حکومت میں انقرہ تک جاتے تھے۔ عبد مناف کے پوتے عبد المطلب کے دور میں بین الاقوامی صورت حال از حد نازک وکشیدہ ہو گئی۔ یمن میں کندی سلسلہ حکمرانی ختم ہو گیا اور وہاں حبشہ والوں کی حکومت قائم ہو گئی جنہوں نے اپنے سردار ابرہہ کی سربراہی میں ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ مکہ معظمہ پر حملہ کیا۔ قدرت نے ہاتھی اور طاقتور فوج کے مقابلہ میں مکہ معظمہ کے شہریوں

کی مدد و معاونت کی۔ ابرہہ کو شکست فاش ہوئی جس کے بعد وہ ایک وبائی مرض میں مبتلا ہو کر موت کے منہ میں چلا گیا۔ بعد ازاں ایرانیوں نے یمن پر حملہ آور ہو کر ابرہہ کے خاندان والوں سے سلطنت چھین لی۔ شروع میں انہوں نے ایک یمنی شہزادے کو سلطنت کی حاکمیت دے دی۔ عبدالمطلب ایک وفد کے ہمراہ اس شہزادے کو حکمرانی کی مبارکباد دینے کے لیے یمن گئے مگر ایرانیوں نے اس یمنی شہزادے سے بھی حکومت چھین لی۔ بعد ازاں یمن کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ مدائن (جسے طیسفون بھی کہا جاتا تھا) کے ایک صوبہ یا کالونی کی صورت اختیار کر گیا۔

(5) زمزم کے چشمہ کو قبیلہ خزاعہ نے ایک مقامی جنگ میں شکست کے بعد بند کر دیا تھا یہ چشمہ مکہ معظمہ میں کعبہ کے سامنے تھا۔ عبدالمطلب نے اس چشمہ کو پھر سے جاری کیا۔ عبدالمطلب نے یہ منت مانی کہ اگر اس کے بیٹوں کی تعداد 12 ہو گئی تو وہ اس خوشی میں اپنے ایک بیٹے کو اللہ کے راستے میں قربان کر دیں گے۔ جب رب رحمٰن و رحیم نے ان کی یہ خواہش پوری کر دی تو انہوں نے اپنی منت پوری کرنے کا مکمل ارادہ کر لیا۔ چنانچہ قرعہ اندازی کے ذریعے اس بات کا فیصلہ ہوا کہ عبدالمطلب اپنے بیٹے عبداللہ کو اللہ کی راہ میں قربان کریں گے۔ رشتہ داروں اور خاندانی قرابت داروں کی یہ خواہش تھی کہ کسی طرح عبداللہ بچ جائے اور قربانی کی کوئی اور صورت نکل آئے۔ اس کے لیے انہوں نے عبدالمطلب کو اس بات پر راضی کیا کہ وہ اس سلسلہ میں کسی کاہن سے مشورہ کریں تو بہتر ہوگا۔ چنانچہ اس زمانے کی ایک مشہور کاہنہ سے عبدالمطلب نے رابطہ کیا تو اس نے اس مسئلے کا یہی حل تجویز کیا کہ قرعہ اندازی کے ذریعے روایتی طریقہ استعمال کرتے ہوئے خون بہا ادا کر دیا جائے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اگر قرعہ عبداللہ کے نام ہی نکلے تو خون بہا میں اضافہ کر کے دوبارہ، سہ بارہ قرعہ ڈالا جائے حتیٰ کہ خون بہا کا تعین ہو جائے۔ اس تجویز پر عمل کرتے ہوئے عبدالمطلب نے دس اونٹوں اور عبداللہ کے مابین قرعہ اندازی کی تو قرعہ عبداللہ کے نام ہی نکلا۔ چنانچہ اونٹوں کی تعداد بڑھائی گئی مگر قرعہ پھر بھی عبداللہ کے نام نکل آیا۔ اس طرح تین دفعہ کے اس عمل میں جب اونٹوں کی تعداد 100 کی گئی تو قرعہ عبداللہ کی بجائے اونٹوں کے لیے نکلا۔ یوں عبدالمطلب نے دیانت داری کے ساتھ اپنی منت پوری کرتے ہوئے عبداللہ کی جان کے بدلے 100 اونٹ قربان کر دیئے۔

(6) عبداللہ نے بنو زہرہ کی ایک خاتون آمنہ سے مکہ معظمہ میں شادی کی۔ رب تعالیٰ نے انہیں ایک ایسے بیٹے سے نوازا جس کا بعد ازاں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم بننا مقدر تھا۔ یہ بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ عبداللہ اپنے ہونہار فرزند کی پیدائش سے چند ہفتے پہلے ہی راہیٔ ملک عدم

ہو چکے تھے لیکن کئی مسلمہ سوانح نگار اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ عبداللہ اپنے بیٹے کی پیدائش سے چند ہفتے بعد فوت ہوئے تھے۔ دراصل عبداللہ ایک تجارتی سفر پر شمال کی طرف گئے ہوئے تھے اور جب وہ اپنی دادی کے شہر مدینہ میں تھے تو فرشتۂ اجل کو انہوں نے لبیک کہا۔ مدینہ منورہ ہی میں انہیں دفن کر دیا گیا۔ ان کا روضہ ترک حکومت نے تعمیر کیا جو آج بھی سعودی حکومت کے دور میں موجود ہے (چند سال پہلے اس جگہ سڑک تعمیر کر دی گئی ہے)۔

(7) عظیم شخصیات کی ولادت ہمیشہ غیر معمولی واقعات کا باعث بنتی ہے چاہے ان کا تعلق مستقبل کے عظیم ہیرو کی اس دنیا میں آمد سے ہو یا نہ ہو۔ آتش پرست (مجوس) آگ کی پرستش کرتے ہیں۔ یہ ان کا معمول ہے کہ ان کے آتش کدوں میں ہر وقت آگ روشن رکھی جاتی ہے اور وہ اسے کبھی بجھنے نہیں دیتے مگر سوموار 17/جون 569 عیسوی کی رات مدائن کے سب سے بڑے آتش کدہ میں جلتی ہوئی آگ یک لخت بجھ گئی حالانکہ یہ آگ صدیوں سے جلتی آ رہی تھی اور کبھی نہیں بجھی تھی۔ اسی رات ایک زلزلہ بھی آیا جس نے شہنشاہِ ایران کے محل کے 14 کنگرے گرا دیئے۔ اسی نوعیت کے اور بھی کئی واقعات عمل میں آئے۔ عبداللہ کی زوجہ آمنہ اپنے بیٹے کی پیدائش کے وقت بالکل اکیلی تھیں۔ یکا یک انہوں نے اس مشکل وقت میں چند دراز قد خواتین کو اپنے پاس پایا۔ جب آمنہ نے ان سے ان کے بارے میں پوچھا تو ان میں سے ایک نے کہا کہ وہ فرعون کی بیوی آسیہ ہے (جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جان بچائی تھی جب انہیں ایک صندوق میں بند کر کے دریائے نیل کی لہروں کے سپرد کر دیا گیا تھا) دوسری خاتون نے بتایا کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ مریم ہیں جبکہ باقی تمام خواتین جنت کی حوریں تھیں (جب نئی نبوت، نئی وزارت کا آغاز ہوتا ہے تو اس سے پہلے یہ فریضہ سرانجام دینے والے اس کے استقبال کے لیے آتے ہیں ایک خاتون کے ہاں بچے کی ولادت کے وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آنا تو ناممکن تھا چنانچہ آسیہ اور مریم اس فریضہ کی ادائیگی اور نمائندگی کرنے کے لیے تشریف لے آئیں۔) پھر حوروں نے آمنہ کے جسم کو اپنے پروں سے ڈھانپ کر حرارت پہنچائی تاکہ وہ ٹھنڈی ہوا سے محفوظ و مامون رہیں۔ جلد ہی بچے کی ولادت ہو گئی۔ یہ بچہ مختون پیدا ہوا۔ پیدا ہوتے ہی وہ زمین پر سجدے میں گر گیا اور شہادت کی انگلی اس طرح اُٹھائی جیسے رب وحدہٗ لاشریک کی وحدانیت کی گواہی دے رہا ہو۔ بچے کو یکا یک سفید رنگ کے ایک بادل نے یوں اپنی لپیٹ میں لیا جیسے کہ بچہ گم ہو گیا ہو۔ پھر غیب سے آواز آئی "اسے مشرق و مغرب کے گرداگرد گھماؤ اور سمندروں کے اندر لے جاؤ تاکہ ہر قسم کی مخلوق درند، پرند، مچھلیاں اور ساتھ ہی فرشتے وغیرہ اپنے نئے پیغمبر سے آشنا

ہو جائیں۔" یہ بادل تحلیل ہوا تو بچے کی صورت سامنے آئی۔ چند لمحوں بعد ہی بچے کو ایک اور بادل نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اب آواز آئی "اسے تمام گزشتہ پیغمبروں کے اوصاف حمیدہ سے منور کر دو۔ اسے آدم علیہ السلام کا اخلاق، شیث علیہ السلام کا علم، نوح علیہ السلام کی جرأت، ابراہیم علیہ السلام کی محبت الٰہی، اسمٰعیل علیہ السلام کی زبان دانی، اسحٰق علیہ السلام کی تسلیم و رضا، صالح علیہ السلام کی خطابت، لوط علیہ السلام کی ذہانت، یعقوب علیہ السلام کا علم غیب، یوسف علیہ السلام کا حسن، موسیٰ علیہ السلام کی استقامت، ایوب علیہ السلام کا صبر، یونس علیہ السلام کی اطاعت، یوشع علیہ السلام کی کاوش، داؤد علیہ السلام کا لحن، دانیال علیہ السلام کی محبت، الیاس علیہ السلام کی عظمت اور عیسیٰ علیہ السلام کی بے نیازی سے نواز دو۔ اسے پیغمبروں کی تمام خوبیوں کے تمام رنگوں میں رنگ دو۔ پھر جب یہ بادل صاف ہوا تو بچہ نظر آنے لگا۔ اس کے بعد تین فرشتوں نے اس بچے کو چاندی کے ایک ٹب میں تین بار غسل دیا۔ پھر اسے سفید ریشمی کپڑے سے ڈھانپا اور کچھ دیر کے لیے اپنے پروں سے حرارت پہنچائی۔ پھر اسے اس کی والدہ کے حوالے کیا اور غائب ہو گئے۔ یہ وہ متاثر کن مختصر روداد ہے جسے مسلمہ قدیم مصنفین نے بیان کیا ہے۔

(8) حضرت آمنہ نے اپنے نومولود بیٹے کا نام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) رکھا اور اس بات کا حکم انہیں خواب میں ایام حمل کے شروع میں دیا گیا تھا البتہ بچے کے دادا حضرت عبدالمطلب نے اپنے نومولود پوتے کو محبت و شفقت سے احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہنا شروع کر دیا۔ عربوں میں یہ رواج و دستور تھا کہ شہری بچوں کو صحرائی رضاعی ماؤں کے حوالے کر دیا جاتا تھا تاکہ بچے صحرا کی کشادہ فضا اور تازہ ہوا میں صحت مندانہ انداز میں پرورش پا سکیں۔ یہ رواج و دستور موجودہ صدی میں بھی قائم دائم ہے۔ طائف کے قبیلہ ہوازن کی ایک خاتون حلیمہ جب نومولود بچے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ولادت سے چند روز بعد مکہ معظمہ سے گزریں تو انہیں اس بچے کو گود لینے کی سعادت نصیب ہوئی جس کے لیے وہ کبھی پریشان و پشیمان نہیں ہوئیں اس لیے کہ یہ بچہ اپنے ساتھ خوشحالی و خوش بختی لے کر آیا تھا۔ جب حلیمہ نے بچے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دودھ پلانا شروع کیا تو اس نے یہ دیکھا کہ بچہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) صرف ایک طرف سے دودھ پیتا ہے اور یوں وہ دوسری طرف کو اس لیے منہ نہیں لگاتا کیونکہ وہ اسے اپنے رضاعی بھائی کا حق اور امانت سمجھتا ہے (پیغمبروں کو بچپن ہی سے لازماً امین ہونا چاہیے) یہ بچہ تقریباً چار سال تک صحرا میں رضاعی ماں حلیمہ کے پاس رہا۔ اس دوران وہ اپنی حقیقی والدہ حضرت آمنہ سے ملاقات کیلئے وقتاً فوقتاً مکہ معظمہ میں آتا جاتا رہا۔ اس موقع پر اس کی رضاعی ماں حلیمہ کو اس کی پرورش، پرداخت اور نگہداشت کا معاوضہ بھی ادا کیا جاتا

تھا۔ حضرت آمنہ کا بیٹا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی رضاعی والدہ کے ساتھ علاقائی میلوں ٹھیلوں (میلہ عکاظ وغیرہ) میں بھی جاتا رہا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بڑی رضاعی بہن شیما اُسے اٹھا کر جا رہی تھی کہ راستے میں اس نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس طرح گدگدایا کہ اُسے یہ بُرا لگا اور اُس نے غصے میں آ کر شیما بہن کو اس کے کندھے پر اس زور سے کاٹا کہ وہاں اس کے دانتوں کے مستقل نشان پڑ گئے۔ اس واقعہ کے تقریباً 55 برس بعد اسلامی فوج کے ایک دستے نے بوڑھی شیما کو پکڑ کر سپہ سالار اعظم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا تو بوڑھی شیما نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہی رضاعی بہن ہے جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بچپن میں کندھے پر کاٹا تھا۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بچپن کا وہ واقعہ یاد دلایا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد آ گیا اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رضاعی بہن شیما کو وہی عزت اور قدر و منزلت دی جو ایک شفیق اور مہربان بھائی کو دینا چاہیے۔

(9) اگرچہ زمانے کے رواج کے مطابق بچے کی رضاعی ماں کے ہاں پرورش کی مدت گزر چکی تھی مگر حضرت حلیمہ کمی بچے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنے پاس رکھنے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کر لیتی تھیں۔ ایک روز حضرت حلیمہ کا حقیقی بیٹا تیزی سے بھاگتا ہوا گھر آیا۔ اس نے حضرت حلیمہ کو بتایا کہ صحرا میں اچانک چند افراد آئے۔ انہوں نے آتے ہی میرے مکی بھائی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پکڑا اور اس کا سینہ چاک کر دیا۔ حضرت حلیمہ اور ان کے شوہر نے جب یہ بات سنی تو وہ خوفزدہ ہو کر صحرا کی طرف بھاگے۔ جب وہ جائے وقوعہ پر پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک چٹان پر بیٹھے آسمان کی طرف منہ کیے حیرت سے کچھ دیکھ رہے ہیں۔ انہوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے واقعہ کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ کچھ اجنبی افراد آئے۔ انہوں نے میرا سینہ چاک کیا۔ اس میں سے میرا دل باہر نکالا۔ دل پر سے ایک سیاہ دھبہ کاٹ کر پھینک دیا اور کہنے لگے کہ یہ شیطانی ٹکڑا تھا۔ بعد ازاں انہوں نے میرے دل کو دھو کر صاف کیا۔ اسے سینے کے اندر اپنی جگہ پر رکھا۔ چھاتی کو بند کیا اور آسمان کی طرف اُڑ گئے۔ اور جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رضاعی ماں حضرت حلیمہ اور ان کا شوہر وہاں پہنچے تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اس وقت انہی افراد کو آسمان کی بلندیوں اور وسعتوں میں پرواز کرتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ اس واقعہ کے بعد مکی بچے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رضاعی ماں حضرت حلیمہ نے یہی سوچا کہ اس غیر معمولی اور معجزاتی بچے کو اس کی حقیقی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ کے حوالے ہی کر دینا چاہیے تاکہ آنے والے دنوں میں کسی قسم کی اور پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

(10) حضرت آمنہ اپنے بیٹے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو لے کر مدینہ منورہ اپنے شوہر کی قبر پر گئیں۔ حضرت عبدالمطلب کی مدینہ منورہ میں ننھیال بنونجار کے مکہ معظمہ میں اپنے عزیز و اقارب سے بہتر تعلقات تھے۔ اس بناء پر حضرت آمنہ بنونجار (مدینہ منورہ) میں تقریباً دو سال تک قیام پذیر رہیں۔ وہاں ایک قریبی تالاب میں نوعمر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تیراکی سیکھی۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو بچپن میں قیام مدینہ کی بعض تفصیلات یاد تھیں۔ حتیٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان لڑکوں اور لڑکیوں کے نام بھی یاد تھے جن کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بچپن میں قیام مدینہ کے دوران کھیلا کرتے تھے۔

(11) حضرت آمنہ مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ کی طرف واپس آ رہی تھیں کہ ابواء کے مقام پر ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی خادمہ ام ایمن ان کے بچے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو لے کر مکہ پہنچیں اور یتیم بچے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ان کے دادا حضرت عبدالمطلب کے حوالے کر دیا جو مکہ معظمہ کے ایک عمر رسیدہ سردار تھے اور اپنے پوتے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ جب حضرت عبدالمطلب کے پوتے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عمر آٹھ سال کی ہوئی تو حضرت عبدالمطلب نے اس فانی دنیا کو خیر باد کہا۔ آٹھ سالہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دادا حضرت عبدالمطلب کی وفات کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حقیقی چچا ابو طالب نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پرورش کی ذمہ داری سنبھالی مگر اس نوعمر بچے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے محسوس کیا کہ انہیں اپنی روزی خود کمانا چاہیے چنانچہ انہوں (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے ایک پڑوسی ابو معیط کی بھیڑیں چرانا شروع کر دیں۔ اس طرح ان (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خاندان کی آمدنی میں قدرے اضافہ ہوا۔ اس کے ساتھ ہی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے چچا کی کپڑے وغیرہ کی دکان پر بھی کام کرنا شروع کر دیا اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بہتر کارکردگی کی بناء پر چچا نے اپنی جگہ دکانداری کا تمام انتظام آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کے سپرد کر دیا کیونکہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے چچا ابو طالب نے محسوس کیا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے حقیقی بیٹوں کی نسبت زیادہ ذہین و فطین اور قابل بھروسہ تھے۔

(12) ابو طالب ایک تجارتی قافلہ لے کر فلسطین کی طرف روانہ ہونے لگے تو انہوں نے محسوس کیا کہ ان کا نو سالہ بھتیجا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کی عارضی جدائی سے پریشان ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے بھتیجے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھی قافلے کے ساتھ لے لیا۔ اس دور میں فلسطین عیسائی خانقاہوں کا مرکز تھا۔ ان عیسائی خانقاہوں کے راہب فلسطین میں آنے والے مسافروں

کو عیسائیت کی پُرزور الفاظ میں تبلیغ کرتے تھے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ جب ابوطالب کا قافلہ فلسطین پہنچا تو وہاں کے ایک عیسائی راہب بحیرا نے ابوطالب اوران کے ساتھیوں کو کھانے کی دعوت دی۔ اس دعوت میں کمسن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی موجود تھے۔ اس دعوت میں بحیرا نے شاید ٹوٹی پھوٹی عربی میں جتنی وہ جانتا تھا اپنے مہمانوں سے خطاب کیا لیکن ایک فرانسیسی مستشرق Carra de Veaux کی خیالی پرواز کس قدر حیران کن اور مضحکہ خیز ہے کہ اس نے ایک مکمل کتاب "On Bahira, the author of the Quran" کے نام سے تحریر کی ہے۔ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ ایک نو سال کی عمر کا بچہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) قرآن مجید کی 114 سورتوں کو چند منٹوں میں حفظ کر لے اور پھر ایک نسل کے بعد اپنے لوگوں کو یہ کہہ کر پیش کرے کہ یہ کلام و پیغام الٰہی ہے؟؟

(13) اگرچہ یہ شاید اسی دور کا عام سا واقعہ ہے مگر یہ انتہائی سنگین نتائج کی بنیاد بنا۔ ایک دن ابو طالب اور اس کا بھائی ابولہب آپس میں کسی بات پر جھگڑ پڑے اور نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ ابو لہب نے ابوطالب کو زمین پر گرا کر ان کی چھاتی پر سواری کر لی اور انہیں بے تحاشا مارنے پیٹنے لگا۔ اس صورت حال کو جب ابو طالب کے نوعمر بھتیجے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دیکھا تو وہ اپنے سرپرست ابوطالب کو بچانے کے لیے ان کی مدد کو پہنچے۔ انہوں (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ابولہب کو اس زور سے دھکا دیا کہ وہ نیچے گر گیا۔ یوں ابوطالب کو موقع مل گیا کہ اب وہ نیچے سے اُٹھ کر ابولہب کو گرالیں۔ چنانچہ ابوطالب نے فوراً ہی ابولہب کو نیچے گرالیا اور اس کے منہ پر زوردار تھپڑ مارے۔ اس بات پر ابولہب کو اپنے کمسن بھتیجے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اس ردعمل پر سخت غصہ آیا اور اس نے چلا کر کہا "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میں بھی تو ابوطالب کی طرح تمہارا چچا ہوں۔ تم نے دوڑ کر ابو طالب کی مدد تو کی ہے لیکن میری مدد کیوں نہیں کی؟ اللہ کی قسم! میرے دل میں تمہارے لیے کبھی محبت نہیں ہوگی۔ کبھی بھی نہیں۔" اور یہ حقیقت ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ اپنے بھتیجے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لیے ابولہب کے تعصب اور نفرت کے جذبات بڑھتے ہی چلے گئے۔

(14) چند سال بعد حج کے دنوں کے دوران مکہ میں ایک مقامی لڑائی چھڑ گئی۔ یہ کہا جاتا ہے کہ اس موقع پر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے ایک چچا حمزہ کی اپنی ڈھال کے ذریعہ حفاظت کی؟ جبکہ حمزہ نے دشمن پر تیر برسائے۔ ایک اور روایت کے مطابق اس جنگ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دشمن قبیلہ کے سپہ سالار مہلب الاسینا کو نیزے کی ضرب سے زخمی کر دیا۔ اسی وجہ سے یہ قبیلہ بھی ایک لمبے عرصہ تک اسلام کا بدترین دشمن بنا رہا۔

(15) مکہ معظمہ کے باضمیر اور شریف النفس افراد کیلئے حج کے مبارک و متبرک مہینوں میں قتل و غارت اور خونریزی باعث تکلیف واذیت تھی۔ اس ضمن میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے تایا اور خاندان کے سربراہ الزبیر نے اس مسئلے کا حل نکالنے کیلئے مکہ معظمہ کے ایک معزز و مکرم رئیس عبداللہ ابنِ جدعان کے ہاں ایک عام اجلاس بلایا جس میں ایک منشور، ایک ضابطہ ایک معاہدہ طے کیا گیا جسے تاریخ میں ''حلف الفضول'' کا نام دیا گیا (اس معاہدہ میں زیادہ تعداد ان افراد کی تھی جن کے نام میں لفظ 'فضل' آتا تھا۔ اس لیے فضل کی جمع فضول کے حوالے سے اس معاہدہ کو حلف الفضول کہا جانے لگا) اس منشور، اس ضابطہ اور اس معاہدہ کی رو سے یہ عہد کیا گیا کہ اس معاہدہ کے ارکان ہر مظلوم شخص کی ہر ممکن مدد کریں گے۔ معلم کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس معاہدہ میں نمایاں کردار ادا کیا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت نوجوان تھے (محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس معاہدہ کے اہم ارکان میں سے تھے) بعد ازاں جب ہادیٔ کون و مکاں صلی اللہ علیہ وسلم نبوت و رسالت سے سرفراز فرمائے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے ''میں 'حلف الفضول' کے اعزاز و افتخار سے دستبردار نہیں ہوں گا چاہے مجھے سرخ اونٹوں کا ایک پورا گلہ ہی کیوں نہ پیش کر دیا جائے۔ آج بھی اگر کوئی مظلوم مجھے اس معاہدے کے تحت مدد کے لیے پکارے گا تو میں اس کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اس کی مدد کو پہنچوں گا۔'' اس منشور، اس ضابطہ اور اس معاہدہ میں ہاشم، مطلب، زہرہ اور تیم کے قبائل مدد و اعانت کے جذبہ کے تحت شامل ہوئے تھے۔

(16) شاید یہ قبائلی رقابت تھی کہ قبیلہ سعد ابن سہام نے معاہدہ ''حلف الفضول'' میں شرکت نہ کی تاہم وہ اسی قسم کا کوئی اور معاہدہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ان کے رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ کے قبیلہ بنو زہرہ سے انتہائی خوش گوار اور خوش کن روابط اور تعلقات تھے۔ چنانچہ ان دونوں قبیلوں نے باہمی مشاورت اور مفاہمت سے ایک منشور، ایک ضابطہ اور ایک معاہدہ طے کیا جسے تاریخ میں ''حلف الصلاح'' (معاہدہ صلح) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس معاہدہ کی رو سے یہ قرار پایا کہ اگر قبیلہ بنو قریش یا ان کے حلیف قبائل احابیش (ان کا حبشہ کے ملک سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ دراصل غیر عرب پیشہ ور سپاہی تھے) میں سے کسی کے مابین کوئی تنازعہ یا جھگڑا ہو تو وہ فریقین کی آپس میں صلح و مفاہمت کرائیں گے۔ قبیلہ بنو زہرہ چونکہ دونوں معاہدوں ''حلف الفضول'' اور ''حلف الصلاح'' میں شامل اور نمایاں کردار کا حامل تھا چنانچہ اس طرح دونوں معاہدوں میں بھی ایک نوعیت کا ربط اور تعلق شاید موجود تھا۔

شادی اور ازدواجی زندگی

(17) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی زندگی کی چوبیس بہاریں دیکھ چکے تھے۔ تجارت اور لین دین میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی بے مثل دیانت اور بے داغ کردار کی وجہ سے لوگوں میں ''امین'' کے لقب سے مشہور ہو گئے۔ اب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے چچا اور سرپرست ابو طالب اس قدر نحیف اور عمر رسیدہ ہو چکے تھے کہ وہ تجارت کی غرض سے سفر کرنے سے قاصر تھے۔ اس صورت حال میں یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذمہ داری اور فرض تھا کہ وہ مختلف علاقوں میں سالانہ میلوں ٹھیلوں کے اجتماعات میں فروخت کی غرض سے تجارت کا سامان لے کر جائیں۔ مکہ معظمہ کی ایک امیر اور جوان بیوہ خدیجہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنا سامان تجارت دیا تا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) فلسطین جا کر اسے فروخت کریں۔ اُس نے اپنا ایک غلام بھی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ کیا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سامان تجارت کے ساتھ فلسطین تشریف لے گئے۔ اپنی بے مثل دیانت داری اور بے مثال پیشہ ورانہ مہارت کی وجہ سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خدیجہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) کی توقعات سے دوگنا منافع کمایا اور مکہ معظمہ واپس پہنچے۔ خدیجہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) ایک دیانتدار خاتون تھیں۔ انہوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اس سفرِ تجارت کے لیے جو معاوضہ طے کیا تھا اس سے دوگنا دیا۔ خدیجہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) کی کاروباری قربت و رفاقت نے احساسات و جذبات کی شکل اختیار کی۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اتنے شرمیلے اور غریب تھے کہ خدیجہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) جیسی امیر خاتون کا رشتہ مانگنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے البتہ خدیجہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) نے اپنی سہیلیوں سے مشورہ کیا اور اپنی ایک سہیلی کے ذمہ یہ کام لگایا کہ وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ تجویز دے کہ وہ خدیجہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) کا رشتہ طلب کریں۔

(18) عرب معاشرے میں خواتین اعلیٰ و ارفع مقام کی حامل دکھائی دیتی ہیں۔ ابن ہشام کے مطابق عبدالمطلب کی والدہ سلمٰی النجاریہ جب بھی شادی کرتی تھیں تو اس شرط کے ساتھ کرتی تھیں کہ انہیں یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ کسی وقت بھی اپنے شوہر کو طلاق دے سکتی ہیں۔ اگرچہ یہ بات صحیح ہے کہ عرب میں بیٹیوں کو پیدائش کے بعد زندہ دفن کرنے کے واقعات ہوئے مگر یہ واقعات بہت ہی کم ہیں بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ مزید یہ کہ یہ واقعات افراد کا انفرادی اور ذاتی فعل ہیں اور ان واقعات کے پس منظر میں بھی عورت کا ازحد احترام و توقیر کا جذبہ کارفرما

ہے۔ انسان بھی عجیب وغریب منطق کا حامل ہے۔ عرب معاشرے میں چونکہ ہر شخص ایک دوسرے سے کوئی نہ کوئی جھگڑا یا تنازعہ رکھتا تھا اس لیے والدین یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی بیٹیاں کبھی بھی وقت اور کسی بھی حوالے سے دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہوں یا کوئی غلط کار شخص ان کی بیٹیوں کو اغوا کر کے ان کی عزت و آبرو خاک میں ملا دے۔ خدیجہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شادی کا معاملہ پہلے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور خدیجہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) کے پیام بر کے مابین طے ہوا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس بات کا یقین دلایا گیا کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے لیے خدیجہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) کا رشتہ طلب کریں تو وہ واضح طور پر رضامندی کا اظہار کریں گی (مؤرخین بیان کرتے ہیں کہ خدیجہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) کے حسین وامیر ہونے کی وجہ سے مکہ معظمہ کے کئی صاحب حیثیت اور بااثر افراد نے ان سے شادی کی پیش کش کی مگر خدیجہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) نے سب کو انکار کیا) چنانچہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے چچاؤں، دوسرے رشتہ داروں اور دوستوں کے ہمراہ خدیجہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) کے گھر گئے۔ وہاں ایک محفل منعقد ہوئی۔ اس محفل میں سب سے پہلے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے چچا کھڑے ہوئے۔ انہوں نے مختصر خطاب کیا اور کہا ''آپ سب لوگ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جانتے ہیں۔ تمام قریش میں سے کوئی نوجوان ان کا ہمسر نہیں۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی عزت و وقار، شرافت، نیابت اور ذہانت کی وجہ سے قریش کے تمام نوجوانوں پر فضیلت کے حامل ہیں۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس مال و دولت کی کثرت نہیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ مال و دولت کی حیثیت ڈھلتے سائے کی طرح ہے۔ دولت آتی ہے تو چلی بھی جاتی ہے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خدیجہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) کے اخلاق و اطوار از حد پسند ہیں جبکہ خدیجہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) بھی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ان کی خوبیوں کی وجہ سے پسند کرتی ہیں۔'' اس کے بعد خدیجہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) کے چچا عمرو ابن اسد اُٹھے۔ انہوں نے اپنے خطاب میں جہاں اور باتیں کیں وہاں یہ بھی کہا کہ ''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) عمدہ اور اعلیٰ نسل کے اونٹ کی مانند ہیں جسے بٹھانے کیلئے مہار کھینچنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔'' چونکہ خدیجہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) کے والد محترم اللہ کو پیارے ہو چکے تھے اس لیے چچا عمرو ابن اسد نے اپنی بھتیجی خدیجہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) کی شادی کے سلسلہ میں تمام ضروری فرائض سرانجام دیئے دونوں میاں بیوی نے شادی کی پہلی رات ابو طالب کے گھر پر گزاری۔ پھر خدیجہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) اپنے شوہر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہمراہ اپنے گھر

تشریف لے گئیں۔ اس امر پر سب متفق ہیں کہ اس وقت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عمر 25 برس تھی مگر جہاں تک خدیجہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) کا تعلق ہے اس ضمن میں بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ اس وقت ان کی عمر 40 سال تھی جبکہ متعدد مؤرخین ایسے ہیں جن کا کہنا ہے کہ اس وقت خدیجہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) کی عمر 28 سال تھی۔ ان مؤرخین کی تحقیق کی تصدیق وتوثیق اس حیاتیاتی حقیقت سے بھی ہوتی ہے کہ سرور کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بطن سے سات بچے پیدا ہوئے جن میں تین بیٹے قاسمؓ، طاہرؓ، اور طیبؓ جبکہ چار بیٹیاں حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا، حضرت رقیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، حضرت ام کلثوم رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا شامل تھیں۔

(19) یوں شادی کے بعد خدیجہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) کے گھر منتقل ہونے کی وجہ سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنے پیارے چچا ابو طالب سے علیحدہ ہونا پڑا۔ اس طرح ابو طالب اپنی کثیر اولاد کیلئے روزی کمانے میں ایک مددگار و معاون سے محروم ہو گئے مگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمام صورتحال سے بخوبی آگاہ تھے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے چچا پر اُن کے خاندان کی کفالت کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اُن کے بیٹے علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو اپنے ذمہ لے لیا جبکہ اپنے ایک اور چچا عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو ابو طالب کے ایک اور بیٹے کی کفالت کی ذمہ داری لینے پر راضی کرلیا۔

(20) یہ ایک قدرتی بات تھی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تجارت کر کے اپنی زوجہ خدیجہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) کے مال و دولت میں اضافہ کا باعث بنے۔ مؤرخین کے مطابق جب بھی کسی مستحق اور ضرورت مند کا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو علم ہوتا تو وہ انہیں امداد کی غرض سے خدیجہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) کے پاس بھیجتے اور خدیجہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) ہمیشہ دل کھول کر مستحقین کی امداد فرماتیں۔ ایک قحط کے دوران محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی رضاعی ماں حضرت حلیمہ کی اس طرح مدد فرمائی۔ ان کے ساتھ ساتھ یتیموں، بیواؤں اور بے سہارا مسافروں کی بھی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی زوجہ خدیجہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) کے ذریعے مدد فرماتے۔ یہ بات اس حقیقت کا پتہ دیتی ہے کہ عرب میں خواتین کو اپنے مال و دولت پر مکمل اختیار حاصل تھا بلکہ ان کے شوہر بھی اپنی بیویوں کی مرضی کے بغیر ان کے مال و دولت میں سے خرچ نہیں کر سکتے تھے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تجارت کی غرض سے کئی دفعہ یمن تشریف لے گئے اور کم از کم ایک بار قبیلہ عبدالقیس کے علاقے عمان بھی گئے کیونکہ وہاں ایک بین الاقوامی تجارتی میلہ دبا منعقد ہوتا

تھا۔آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) شاید اس تجارتی میلے میں شرکت کی غرض سے گئے ہوں گے۔اس بارے میں ابن الکلبی تحریر کرتا ہے:''سوہار کا میلہ عمان میں منعقد ہوتا تھا۔ وہ یکم رجب کو مُشقر سے روانہ ہوئے اور 20 رجب کو سوہار پہنچے۔ پانچ روز تک میلہ جاری رہا۔اس موقع پر عمان کے حاکم الجلندہ ابن المستکبر نے تاجروں پر عُشر لگا دیا۔ بعد ازاں دبا میں تجارتی میلہ منعقد ہوا۔عرب کی دو بڑی بندرگاہوں میں سے ایک کا نام دبا ہے۔ سندھ، ہند (برصغیر پاک و ہند)، چین اور مشرق و مغرب کے تاجر اور سوداگر اس میلہ میں شریک ہوئے۔ دبا کا میلہ رجب کے آخری روز آغاز ہوتا تھا۔ باقاعدہ بھاؤ تاؤ کے بعد ہی سودا طے ہوتا۔عمان کے حاکم الجلندہ ابن المستکبر نے سوہار کے میلہ کی طرح دبا کے میلہ میں بھی تاجروں پر عشر (کسٹم ڈیوٹی) نافذ کر دیا۔عمان کے حاکم کا رویہ دوسری سلطنتوں کے حکام سے قطعاً مختلف نہیں تھا۔'' اس دلچسپ پیراگراف سے ایک خوش کن حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ عرب کے ایک تجارتی میلے میں ہندوستانی تاجر بھی شریک ہوتے تھے۔امام ابن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت کے مطابق ظہور اسلام سے پیشتر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس تجارتی میلہ میں شرکت کی تھی۔اس روایت کی تصدیق ابن ہشام کی بیان کردہ حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ قبیلہ بل حارث کا ایک وفد مدینہ منورہ میں قبول اسلام کے لیے سرور کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا تو رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں پوچھا''یہ کون لوگ ہیں جو وضع قطع اور چال ڈھال سے رجال الہند (ہندوستانی) نظر آتے ہیں؟'' پیراگراف میں چینیوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔المسعودی نے واضح طور پر لکھا ہے کہ چینی کشتیوں میں آیا کرتے تھے۔ یہ لوگ بحرین، عمان اور حتیٰ کہ ابولہ (بصرہ) بھی جاتے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ رسول امین صلی اللہ علیہ وسلم کی چینیوں سے ملاقات وہیں ہوئی ہو اور ہادیٔ کون ومکاں صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی صنعت و حرفت کے ساتھ ساتھ اس بات نے بھی متاثر کیا ہو کہ یہ لوگ بہت دُور سے آتے ہیں۔ معلم کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث شاید اسی تاثر کا اظہار ہے جس میں کہا گیا ہے کہ''علم حاصل کرو خواہ تمہیں اس کے لیے چین ہی کیوں نہ جانا پڑے کیونکہ علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔'' ایک آخری بات یہ کہ مکی تاجر تجارت کی غرض سے نہ صرف اس طرح کے تجارتی میلوں میں شریک ہوتے تھے بلکہ ان کے تجارتی قافلے حبشہ، عراق، شام اور انقرہ تک جاتے تھے۔

(21) خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دُور دراز مقامات کے سفر کے حوالے سے

امام ابن حنبل رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ جب دبا کے قبیلہ ابوالقیس کا وفد آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کرنے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد کے ارکان سے ان کے ملک دبا اور وہاں کے لوگوں کے بارے میں کئی سوالات کئے۔ وہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوالات سن کر ازحد حیران اور متعجب ہوئے اور ان کے منہ سے بے اختیار نکلا ''آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) تو ہمارے ملک دبا کو ہم سے بھی بہتر جانتے ہیں۔'' اس پر رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میں نے وہاں ایک عرصہ تک قیام کیا ہے۔'' محبوب خدا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح نگاروں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یمن، شام اور فلسطین کا ذکر بار بار کیا ہے۔ خلیج باب المندب ایک ایسی خلیج ہے جو حبشہ کو یمن سے جدا کرتی ہے۔ اس امر سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مکہ معظمہ کے لوگ اکثر خلیج باب المندب کو پار کر کے حبشہ جاتے تھے اور اسی طرح حبشہ کے لوگ بھی اس خلیج کے ذریعے عرب اور مکہ معظمہ آیا جایا کرتے تھے۔ اشاعت اسلام کے ابتدائی دور میں مکہ معظمہ سے مسلمان ہجرت کر کے بھی حبشہ تشریف لے گئے تھے۔ بعض جدید سوانح نگاروں کا خیال ہے کہ خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم بھی حبشہ تشریف لے گئے ہوں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شاہ نجاشی سے ملاقات ہوئی ہو گی۔ ایسے سوانح نگاروں کے اس خیال کا مرکز اور بنیاد اس تعارفی خط کا انداز خطابت ہے جو سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچازاد جعفر ابن ابو طالب کے ذریعے شاہ نجاشی کے نام بھجوایا تھا۔ یہ خط کافی حد تک بے تکلفانہ اور دوستانہ ہے۔ طبری کی تحقیق کے مطابق اس میں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھا تھا کہ ''میں آپ کے پاس اپنے چچازاد جعفر کو چند اور مسلمانوں کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ جب یہ لوگ آپ کے پاس پہنچیں تو آپ ان کی مہمان نوازی کیجیے گا اور ان پر ظلم نہ کیجیے گا''۔

(22) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اعلیٰ اخلاق اور ارفع معاشرتی کردار کو اس دور کا ایک چھوٹا مگر پُر اثر واقعہ منور و مزین کرتا ہے۔ زید بن حارثہ نام کا ایک نوعمر عرب لڑکا مکہ معظمہ کی منڈی میں بطور غلام فروخت کیا گیا جسے خدیجہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) نے خریدا اور اپنے شوہر نامدار محمد مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت اقدس میں ذاتی خدمت گاری کیلئے پیش کیا۔ لڑکا خوبصورت اور ذہین تھا۔ اس لڑکے کا تعلق شمالی عرب کے ایک بڑے قبیلہ کلب سے تھا۔ ایک ہمسایہ قبیلہ کا قبیلہ کلب سے تصادم ہوا۔ اس جھگڑے کے دوران ہمسایہ قبیلہ نے اس لڑکے کو گرفتار کر لیا اور مکہ معظمہ لا کر فروخت کر دیا۔ اس لڑکے کا والد قبیلہ کلب کا سردار تھا۔ اس نے

اپنے گمشدہ بیٹے کو جگہ جگہ تلاش کیا۔ دُور و نزدیک کی کوئی جگہ نہ چھوڑی۔ آخر کار اسے معلوم ہوا کہ اس کا بیٹا کس جگہ پر ہے۔ چنانچہ وہ زر فدیہ ادا کر کے اپنے بیٹے کو آزاد کرانے کی غرض سے ایک بھاری رقم لے کر مکہ معظمہ پہنچا۔ جب وہ رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا اور اپنی بپتا سنائی تو رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم از حد متاثر ہوئے۔ رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''بچے کو زر فدیہ ادا کر کے اس طرح واپس خریدنے کی بجائے ایک اور بہتر صورت یہ ہے کہ بچے سے پوچھ لیا جائے کہ کیا وہ آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہے یا نہیں۔ اگر وہ آپ کے ہمراہ جانے کے لیے تیار ہو جائے تو آپ اُسے بغیر قیمت حتیٰ کہ ایک کوڑی بھی ادا کیے بغیر اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں۔'' پھر آنحضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے زید (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو بلایا۔ وہ فوراً آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور آتے ہی اپنے والد محترم کو پہچان لیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زید (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سے پوچھا ''کیا تم اپنے والد کے ہمراہ جانا چاہتے ہو؟'' زید (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے جواب دیا ''آپ نے مجھ سے جس محبت و شفقت کا برتاؤ کیا ہے اس کے بعد آپ کے پاس بطور غلام رہنے کو اپنے والد محترم کے گھر بطور آقا کے زندگی گزارنے پر ترجیح دیتا ہوں۔'' رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اس متاثر کن جواب سے اس قدر جذبات میں آئے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے زید (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کا ہاتھ پکڑا اور اسے کعبہ کے صحن میں لے گئے اور علی الاعلان کہا ''میں زید کو آزاد کرتا ہوں اور اسے اپنے بیٹے کے طور پر اپناتا ہوں۔'' زید (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے والد محترم بھاری دل کے ساتھ واپس گئے مگر انہیں اس بات کا مکمل اطمینان تھا کہ ان کے بیٹے کی فلاح و بہبود اور پرورش کا بہتر خیال رکھا جائے گا۔

(23) خدیجہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) کے سابقہ دو شوہروں سے دو بچے تھے۔ ایک شوہر سے بیٹا تھا جبکہ دوسرے شوہر سے بیٹی تھی۔ دونوں بچوں کا نام ''ہند'' تھا۔ دونوں بچے اپنے اپنے والد کے خاندان والوں کے پاس ہی رہتے تھے۔ کبھی کبھی یہ بچے اپنی والدہ خدیجہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) سے ملاقات کیلئے آتے تھے۔ خدیجہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) اپنے بچوں کو محبت و شفقت کے ساتھ ساتھ تحائف بھی دیتی تھیں خدیجہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) کا بیٹا ہند ابن ابی ہالہ اپنے سوتیلے والد پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے از حد مانوس ہو گیا تھا اور بعد میں وہ سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے سراپا اور حلیہ مبارک کے بارے میں سب سے بڑا، اہم اور پُر جوش راوی بنا۔ وہ بڑے دلنشین اور دلفریب انداز میں بیان کرتا ہے کہ ''...........ان (صلی اللہ علیہ

وسلم) کا منہ یاقوتوں سے بھرے ہوئے صندوقچہ کی طرح تھا۔ اُن (صلی اللہ علیہ وسلم) کا چہرہ چودھویں کے مکمل چاند سے زیادہ خوبصورت اور حسین تھا ....'' ہند ابن ابی ہالہ کے ان الفاظ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ناقابل بیان اُنس، غیر معمولی محبت اور بے پناہ احترام وعقیدت کا اظہار واضح ہے۔

(24) غیر ممالک کی جانب تجارتی قافلوں کی قیادت تاجرینِ مکہ معظمہ باری باری کرتے تھے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خدیجہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) سے شادی سے پہلے ایک شخص سائب کے ساتھ شراکتی کاروبار کیا۔ وہ شخص آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حسن عمل کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ''میں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ کاروبار میں شرکت کی۔ وہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سامانِ تجارت لے کر جب مکہ سے باہر تشریف لے جاتے تو واپسی پر گھر جا کر آرام کرنے یا اپنے اہل خانہ سے ملاقات کرنے کی بجائے پہلے میرے پاس آتے اور میرے تمام سامان کی خرید وفروخت کا مکمل حساب کتاب پیش کرتے۔ تاہم جب مالِ تجارت لے کر غیر ممالک جانے کی میری باری ہوتی تو میری وطن واپسی پر صرف میرا استقبال کرتے اور میری خیر وعافیت دریافت کرتے مگر اپنے مال کی خرید وفروخت کے سلسلے میں کبھی بھی حرف زبان پر نہ لاتے۔ ہم دونوں کا شراکتی کاروبار بہت خوش اسلوبی سے چلا اور کبھی اختلاف کی نوبت تک نہیں آئی۔''

روحانی جستجو

(25) مکہ کفار کا بہت بڑا مذہبی مرکز تھا۔ مکہ والے ایک خدا کو ضرور مانتے تھے مگر بتوں کی پرستش بھی کرتے تھے کیونکہ وہ بتوں کو خدا کی بارگاہ میں اپنا "سفارش کنندہ" سمجھتے تھے۔ ان کے جدامجد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ اور حج کا جو سلسلہ شروع کیا تھا اسے بھی انہوں نے جاری وساری رکھا ہوا تھا اور اس کی شہرت اس قدر زیادہ تھی کہ جزیرہ نمائے عرب کے ہر حصہ سے ہر سال لوگ حج کی ادائیگی کے لیے پہنچتے تھے جس کا ٹھوس، سچا اور ناقابلِ تردید ثبوت ان قبائلی وفود کی فہرست فراہم کرتی ہے کہ جن کو حضرت محمد مصطفٰے، احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت سے پہلے ملاقات کا شرف بخشا تھا۔

(26) اللہ کے گھر کعبہ کے اندر اور اس کے اردگرد بہت سے بُت رکھے گئے تھے۔ ہبل ان بتوں میں سے سب سے بڑا اور نامور بُت مشہور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے کعبہ کی چھت پر رکھا گیا تھا۔ ہبل کو فلسطین کے ایک مقام مآب سے لایا گیا تھا۔ اس بات کے بارے میں نہیں بتایا گیا کہ ہبل کو خریدا گیا یا کسی نے تحفہ کے طور پر پیش کیا یا کسی اور طریقے سے پہنچا۔ پتھر کی تراش خراش سے ہبل کو بنایا گیا تھا اور شاید یہ دوسرے تمام بتوں سے زیادہ خوبصورت تھا۔ روایت کے مطابق کعبہ کی عمارت کے گردا گرد 360 بت تھے جو شاید سال کے دنوں کی تعداد کے مطابق تھے۔ دوسرے قبائل کے بتوں کی نقل مطابق اصل بھی وہاں موجود تھے مثلاً منات وغیرہ اور مکہ والے تمام بتوں کی مساوی تعظیم وتکریم کرتے تھے۔

(27) روایت ہے کہ کفار مکہ کعبہ کے سامنے صبح کی نماز ادا کرتے تھے اور ان میں مذہبی رواداری اور تحمل وبرداشت موجود تھی۔ ہر شخص جس طرح چاہتا رکوع، سجود، یا اسی قسم کے اور انداز سے عبادت کرتا تھا۔

(28) جہاں تک بتوں کی پوجا اور پرستش کا تعلق ہے ایک مسلمان نے بتایا کہ "میں اسلام قبول کرنے سے پہلے ایک بُت پرست آقا کے پاس غلام تھا۔ میرا آقا روزانہ صبح سویرے کچھ مکھن اور دودھ کا ایک جگ دیتا اور کہتا کہ اسے اس کے معبود بُت منات کے سامنے رکھ آؤ۔ وہ مجھے خبردار کرتا کہ اس نذر نیاز کو خود نہ کھانا ورنہ وہ بُت تمہیں اس بے عزتی کی سزا دے گا۔ اور اللہ کی قسم! میں روزانہ یہ دیکھتا کہ میں جیسے ہی مکھن اور دودھ منات کے سامنے رکھ کر تھوڑا سا دُور ہوتا تو ایک کتا آتا جو مکھن چاٹ کر، دودھ پی کر اُس بت پر پیشاب کرتا اور پھر دوڑ جاتا۔"

(29) کعبہ کے سامنے دو ایسے بت بھی تھے جن میں سے ایک مرد کا تھا اور دوسرا عورت کا تھا۔ مرد کا نام اساف جبکہ عورت کا نام نائلہ تھا۔ ان کے بارے میں یہ کہانی زبان زد عام تھی کہ دونوں مرد عورت تخلیہ چاہتے تھے۔ جب انہیں کوئی تنہا جگہ نہ ملی تو وہ دونوں کعبہ میں آ گئے اور گناہ کیا جس سے انہوں نے متبرک اور پاکیزہ کعبہ میں ناپاکی پھیلائی۔ خدا نے انہیں اپنے گھر میں اس گناہ کی اسی لمحے اسی جگہ یہ سزا دی کہ انہیں پتھر کر دیا۔ لوگوں نے دیکھا کہ ان دونوں مرد اور عورت کے اجسام پتھر ہو کر کعبہ کے احاطے میں موجود تھے تاکہ وہ دوسروں کے لیے عبرت کا باعث بنیں۔ اسلام سے پہلے لوگوں کی جہالت اور ذلالت اس درجہ عروج پر تھی کہ لوگ ان دونوں مجسموں کی بھی پرستش کرتے تھے اور انہیں حاجت روا اور نجات دہندہ سمجھتے تھے (شاید یہ کام وہ غیر ملکی کرتے ہوں جو ان مجسموں کی حقیقت سے ناآشنا تھے)۔ بہر حال وہاں جانور قربان کئے جاتے تھے اور ان کا لہو کعبہ کے قابل تعظیم حجر اسود پر چھڑکا جاتا تھا۔

(30) کعبہ کے اندر دیواروں پر روغنی تصویریں بنائی گئی تھی ان تصویروں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تصویر کے علاوہ کنواری مریم کی اپنے بچے عیسیٰ مسیح کے ساتھ تصویر بھی تھی۔ کعبہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تصویر اس حقیقت کا ٹھوس ثبوت ہے کہ قبل از اسلام بھی مکہ کے لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جانتے تھے اور ان کی تعظیم و توقیر کرتے تھے۔

(31) حتیٰ کہ مکہ کے ہر گھر میں الگ الگ بُت اور دوسری چیزیں ہوتی تھیں جن کی وہ عزت و توقیر اور پرستش کرتے تھے۔ اس مختصر کہانی سے بھی واضح ہوتا ہے: جب سردار دو جہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ فتح کر لیا اور لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تو ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے اپنے گھر میں موجود بتوں کو مار مار کر توڑا اور کہا ''ہم تمہاری وجہ سے ایک عرصہ تک دھوکہ میں رہے۔'' روایت ہے کہ حتیٰ کہ خدیجہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) بھی جبکہ آمدِ اسلام سے پہلے ان کی شادی آنحضور (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ہوئی رات کو سونے سے پیشتر چند بتوں کی تعظیم و تکریم کرتی تھیں مگر جب خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خدیجہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) کو بتایا کہ بت کوئی قدرت و قوت اور طاقت و عظمت نہیں رکھتے تو انہوں نے ایسا کرنا چھوڑ دیا۔

(32) کعبہ کی عمارت کی خدائے بزرگ و برتر کا گھر ہونے کی بناء پر اس کے شایان شان عزت و توقیر کی جاتی تھی۔ خوبصورتی کی اور چیزوں کے علاوہ کعبہ کے اندر اور باہر پردے لگائے گئے تھے جن سے کعبہ ڈھکا رہتا تھا اور ایک محافظ ان پردوں کو لوبان جلا کر خوشبو سے معطر

رکھتا تھا۔ یہ 605 عیسوی کا سال تھا جب ایک ہولناک طوفان کی آمد سے آگ کی چنگاریاں ہوا کے ذریعے کعبہ کے پردوں پر گریں جس سے پردوں میں آگ لگ گئی۔ یوں کعبہ کی پوری عمارت جل گئی۔ طوفان کے بعد تند و تیز اور موسلا دھار بارش ہوئی جس سے کعبہ کی عمارت کو آخری دھچکا لگا اور وہ گر کر مٹی کا ڈھیر ہو گئی۔

(33) لوگوں نے اپنی اس مقدس عمارت کو فوری طور پر دوبارہ تعمیر کرنے کا سوچا۔ ان کی یہ سوچ ایک فطری امر تھا۔ طوفانِ باد و باراں نے سمندر میں بھی تباہی مچائی۔ مصری سامان لے کر یمن کی طرف جانے والا ایک بحری جہاز اس طوفان بلاخیز کی زد میں آ کر تباہ ہو گیا تاہم اس کے بعض مسافروں کو کسی نہ کسی طور بچا لیا گیا۔ مکہ والوں کو جیسے ہی تجارتی بحری جہاز کی تباہی کا پتہ چلا تو وہ جہاز والوں کی مدد کو پہنچے۔ انہوں نے جہاز کا بچا کھچا سامان بھی خرید لیا اور سامان پر روایتی عشر بھی معاف کر دیا حتیٰ کہ انہوں نے تباہ شدہ جہاز کی لکڑی بھی خرید لی (اُن کا خیال تھا کہ اس لکڑی سے کعبہ کی چھت تعمیر ہو سکے گی) جہاز کے غیر ملکی افراد میں باقوم نامی ایک قبطی ترکھان بھی تھا۔ اس نے کعبہ کی تعمیر کے لیے اپنی خدمات کی رضامندی ظاہر کی۔

(34) کعبہ کی تعمیر کے لیے مکہ معظمہ کے ہر شہری کو کہا گیا کہ وہ چندہ جمع کرائے اور قسم دے کر یہ اعلان کیا گیا کہ اس متبرک اور پاکیزہ عمارت کی تعمیر کے لیے صرف اور صرف نیک کمائی پیش کی جائے جبکہ طوائفوں اور سود خوروں کو اس تعمیر کے لیے چندہ دینے سے مکمل طور پر منع کر دیا گیا۔

(35) کعبہ کی تعمیر کوئی آسان کام نہیں تھا۔ نئی تعمیر سے پہلے بچی کھچی عمارت کو گرانا اور ملبہ ہٹانا ضروری تھا۔ خدا کے گھر کی شکستہ دیواروں پر ضربیں لگانے کا محض خیال اور تصور ہی ان لوگوں کے لیے خوفناک تھا۔ مزید یہ کہ کعبہ کے اندر ایک گہرا گڑھا تھا جس میں وہ افراد نذر نیاز ڈالتے تھے جو کعبہ کی زیارت کے لیے آتے تھے۔ بعض اوقات انجام سے بے خبر لوگ اس گڑھے سے چیزیں چُرا کر لے جاتے۔ اس طرح کا ایک واقعہ ابولہب کے بارے میں بھی بیان کیا جاتا ہے۔ نوجوانی کے دنوں میں جب اُس کے پاس شراب اور رقص کی ایک محفل میں شریک ہونے کے لیے پیسے نہیں تھے تو اُس نے کعبہ کے نذر و نیاز والے گڑھے سے چوری کی تھی۔ پھر کچھ ایسا ہوا کہ اس گڑھے میں ایک اژدھے نے ٹھکانہ بنا لیا۔ جب اس گڑھے کی چھت ختم ہو گئی تو یہ اژدھا اکثر اوقات گڑھے سے باہر نکل کر کنارے پر آ بیٹھتا تھا جس سے لوگوں میں ڈر اور خوف پیدا ہو گیا تھا۔ اور پھر جب لوگ اس بارے میں سوچنے لگے کہ کعبہ کے بچے کھچے کھنڈرات کو گرایا جائے یا نہ گرایا جائے تو سانپ کھانے والا ایک پرندہ اچانک کہیں سے آیا۔ اُس نے اژدھے کو دبوچا اور

اُسے اُٹھا کر دُور آسمان میں کہیں غائب ہو گیا۔ اژدھے کے جانے سے مکہ معظمہ کے باشندوں نے خوشی کا اظہار کیا اور جو افراد کعبہ کے بچے کھچے کھنڈرات کو گرا کر صفائی چاہتے تھے انہیں ایسا کرنے کا کھلا موقع مل گیا۔ انہیں اُن کی رائے کے حق میں جواز فراہم ہو گیا اور وہ کہنے لگے کہ "رب تعالیٰ جل شانہٗ کی مرضی یہی ہے کہ ہم اُس کے گھر کو نئے سرے سے تعمیر کریں۔ یہی وجہ ہے کہ رب تعالیٰ جل شانہٗ نے کعبہ سے اژدھا اُٹھوالیا ہے" چنانچہ موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے مکہ معظمہ کا ایک معزز بوڑھا آگے بڑھا اور اُس نے کعبہ کے بچے کھچے کھنڈرات کو صاف کرنے کے لیے پہلی ضرب لگا کر اس کی صفائی کا آغاز کیا۔ اُس نے چند زوردار ضربیں لگائیں اور پھر وہ اچانک رُک گیا اور کہنے لگا "ہم ایسا کرتے ہیں کہ آج کی رات انتظار کر لیتے ہیں۔ اگر رب تعالیٰ جل شانہٗ کی مرضی ہمارے ارادے میں شامل ہے تو کل صبح تک کچھ بھی ظاہر نہیں ہو گا۔ یوں ہم کعبہ کی نئے سرے سے تعمیر کا کام مکمل خوشی اور لگن کے ساتھ شروع کر دیں گے۔" اور وہی ہوا جس کی انہیں توقع تھی۔ رات کے وقت کوئی بھی ایسا واقعہ پیش نہ آیا جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ کعبہ کی نئی تعمیر میں رب تعالیٰ جل شانہٗ کی مرضی شامل نہیں۔ چنانچہ کعبہ کی نئی تعمیر کا کام شروع کر دیا گیا اور جب دیواریں گرا کر انہیں بنیادوں تک کھودا گیا تو نیچے سبز رنگ کا پتھر نظر آنے لگا جو انتہائی مضبوطی کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ یہ دراصل کعبہ کی وہ بنیاد تھی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت بنائی گئی تھی۔ مکہ معظمہ کے باشندے اس بنیاد میں کوئی تبدیلی کرنا نہیں چاہتے تھے کیونکہ اس سے کعبہ کی صحیح لمبائی اور چوڑائی کے ساتھ ساتھ صحیح سمت کا بھی پتہ چلتا تھا۔ درحقیقت کعبہ کی دیواریں شمال جنوب اور مشرق مغرب کی جانب نہیں بلکہ شمال مشرق اور جنوب مغرب کی سمت ہیں۔

(36) خواتین کے علاوہ مکہ معظمہ کے ہر شخص نے کعبہ کی صفائی اور نئے سرے سے تعمیر میں بھرپور حصہ لیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کندھے پر کوئی کپڑا رکھے بغیر بھاری پتھر اُٹھا کر لاتے رہے جس کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کندھا زخمی ہو گیا۔ درحقیقت کعبہ کی چاروں دیواروں کی تعمیر کی ذمہ داری مکہ معظمہ کے مختلف قبیلوں کو سونپی گئی تھی (تاکہ کوئی اس سعادت سے محروم نہ رہے)۔

(37) کعبہ کی عمارت میں جو پتھر استعمال کئے گئے تھے ان تمام پتھروں میں ایک پتھر ایسا تھا جو سب سے جدا رنگ کا تھا۔ اس کا رنگ سیاہ تھا اور یہ کعبہ کے دروازے کے بائیں جانب ایک کونے میں لگا ہوا تھا۔ لوگ اس پتھر کے سامنے سے ہی کعبہ کے طواف کا آغاز کرتے تھے۔ طواف کے دوران اس پتھر کو انتہائی عقیدت واحترام کے ساتھ چومتے تھے اور قربان کئے جانے

والے جانوروں کا خون اس پر چھڑکتے تھے۔ (جب نئی تعمیر کی خاطر کعبہ کی دیواریں گرائی گئیں تو اس پتھر کو علیحدہ سے رکھ دیا گیا تا کہ اسے دوبارہ اپنے مقام پر لگایا جا سکے۔) زمین سے اس پتھر کی بلندی تقریباً ایک میٹر ہے۔ اس پتھر کو اپنے مقام پر نصب کرنا مکہ معظمہ والوں کے نزدیک ایک عظیم اعزاز تھا اس لیے جب اسے لگانے کا وقت آیا تو بہت بڑا جھگڑا پیدا ہو گیا۔ ہر قبیلہ اس اعزاز کو حاصل کرنے کا آرزومند تھا۔ پتھر کو کسی ایک دیوار کی بجائے دو دیواروں کے ملاپ کی جگہ پر نصب کرنا تھا اس لیے کوئی قبیلہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا تھا کہ یہ پتھر (حجرِ اسود) لگانے کا حق اس بناء پر اس کا بنتا ہے کیونکہ وہ اس دیوار میں لگایا جا رہا ہے جو اُس نے تعمیر کی ہے۔ جھگڑا اس قدر بڑھا کہ ہر قبیلہ نے تلواریں نکال لیں تا کہ دوسرا یہ اعزاز حاصل نہ کر سکے۔ اس صورت حال میں ایک عمر رسیدہ ذہین و فطین شخص آگے بڑھا اور اُس نے مختلف قبیلوں کے لوگوں کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے کہا ''یہ زمین پاک ہے۔ اس پر خونریزی کسی طور بھی جائز نہیں۔ میری یہ تجویز ہے کہ اس پتھر (حجرِ اسود) کو نصب کرنے کی سعادت کا فیصلہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیا جائے۔ جو شخص بھی کل صبح اللہ تعالیٰ کے گھر کعبہ میں سب سے پہلے آئے اُسے ثالث مان کر اُس سے فیصلہ لیا جائے کہ اس منفرد اعزاز کا حقدار کون ہے؟'' (سب اس بات پر متفق ہو گئے) اگلی صبح کعبہ میں سب سے پہلے پہنچنے والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ ہر شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ''الامین، الامین'' کہہ کر خوشی کا اظہار کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جھگڑے کو حل کرنے کے لیے ایک چادر منگوائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس چادر میں متبرک ''حجرِ اسود'' کو رکھا اور کہا: ''ہر قبیلے کا ایک ایک نمائندہ آگے بڑھے اور اس چادر کو مل کر اُٹھائے۔'' یوں ''حجرِ اسود'' کو اس جگہ کے عین سامنے لایا گیا جہاں اُسے کعبہ میں لگانا تھا۔ بعد ازاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود متبرک ''حجرِ اسود'' کو اُٹھایا اور اُسے مخصوص مقام پر لگا دیا۔ اس طرح ہر قبیلے کا ہر شخص مطمئن ہو گیا۔ مکہ معظمہ کے معزز خاندانوں میں ایک خاندان الجدیر (معمار) کو کعبہ کی صفائی ستھرائی، خوبصورتی اور مرمت بوقت ضرورت جیسے اہم کام کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ یہ بات یقینی ہے کہ اس خاندان کے بانی نے کعبہ کی ازسرِ نو تعمیر کے کام میں تکنیکی مشورے ضرور دیے ہوں گے چنانچہ یہ کام جلد ہی مکمل ہو گیا البتہ تباہ شدہ مصری جہاز والی جو لکڑی خریدی گئی تھی وہ کعبہ کی پوری چھت کے لیے کم پڑ گئی۔ اس صورت حال میں یہ پُرخلوص فیصلہ کیا گیا کہ کعبہ کے ساتھ ایک برآمدہ سا بنایا جائے جو بغیر چھت کے ہو اور کعبہ کے اس برآمدہ میں لوگوں کو ہر وقت داخلے کی مکمل اجازت ہو جبکہ چھت والی عمارت کو سال کے مخصوص مقررہ دنوں اور اوقات ہی میں کھولا جائے اور یہ کہ

اس عمارت میں ایک دروازہ بھی لگایا جائے۔شاید کعبہ کے اس حصے میں داخلے کی کوئی فیس بھی مقرر کی گئی تھی۔کعبہ کا یہ کھلا حصہ جو حطیم یا حجر کہلاتا ہے شاید وہی گڑھا ہے جہاں کسی دَور میں لوگ نذرو نیاز پھینکا کرتے تھے۔اس طرح کعبہ ایک چار دیواروں والا چوکور کمرہ بن گیا جس کے ایک جانب نیم دائروی تعمیر موجود ہے اور اس کی وجہ سے کعبہ انسانی دل کی بناوٹ کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ کعبہ کے لیے انسانی دل کی تشبیہ قائم کرنا کعبہ کی اہمیت کم کرنے والی بات نہیں۔ایک مشہور حدیث قدسی ہے جس میں رب تعالیٰ جل شانہٗ فرماتے ہیں کہ "میں آسمان و زمین میں کہیں بھی نہیں سما سکتا البتہ میرا مکان مومن کا دل ہے۔" لہٰذا رب تعالیٰ جل شانہٗ کا گھر بھی مومن کے دل کی شکل کا ہی ہونا چاہیے۔یہ ایک حیران کن اتفاق ہے کہ کعبہ کے عربی زبان میں لفظی معنی "مربع" اور "دائروی" دونوں ہیں۔

(38) کعبہ کی عمارت کی دیواروں کے بیرونی جانب 360 بُت آراستہ کیے گئے تھے جبکہ اندرونی جانب نہایت خوبصورت تصاویر بنائی گئی تھیں۔یہ معلوم نہیں کہ یہ آرائش و زیبائش کس نے کی تھی۔ہوسکتا ہے کہ دیواروں پر تصاویر بنانے والا مصور عیسائی مذہب کا حامل ہو کیونکہ ایک دیوار پر حضرت مریم (کنواری) اور ان کے کم سن بیٹے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصویر پانی والے رنگوں سے بنائی گئی تھی۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد کعبہ کی دیواروں کی ان تصاویر کو صاف کرادیا تھا لیکن ان کے مٹنے کے باوجود کچھ آثار پچاس سال بعد تک بھی نظر آتے رہے حتیٰ کہ حضرت عبداللہ ابن الزبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس عمارت کو ازسرِنو تعمیر کرانے کے لیے گرادیا۔یہ بات ہمیں ایک پُرتجسس حقیقت کی یاد دلاتی ہے۔حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے ذرائع کی رُو سے "حجر اسود" کو حضرت آدم علیہ السلام جنت سے اپنے ہمراہ لائے تھے۔شروع میں اس کا رنگ سفید تھا مگر گنہگار حاجیوں کے چھونے کی وجہ سے یہ سیاہ ہوگیا۔"العقد الفرید" (جلد سوئم صفحہ 364) میں ابن عبدربہٗ نے اسے مکمل تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔وہ لکھتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "گنہگاروں کے چھونے اور قربانی کے جانوروں کا خون چھڑکنے سے اس (حجر اسود) کا رنگ سیاہ ہوگیا"۔وہ مزید لکھتا ہے کہ جب حضرت عبداللہ ابن الزبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دَور میں کعبہ کی عمارت کی نئے سرے سے تعمیر کی گئی تو یہ دیکھا گیا کہ حجر اسود دراصل سفید رنگ کا تھا تاہم اس کا بیرونی دائروی سرا سیاہ ہوچکا تھا اور یہ کہ یہ تقریباً تین کیوبٹ (18 سے 22 انچ کا قدیم پیمانہ) کا بلاک تھا۔

(39) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک اُس وقت 35 برس ہوچکی تھی۔اللہ تبارک و

تعالیٰ کا گھر جسے بڑی پاکیزگی کے ساتھ تعمیر کیا گیا تھا لاتعداد بتوں کی رہائش گاہ بنا ہوا تھا۔ اس صورت حال سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ روح کو ضرور صدمہ پہنچا ہوگا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات پر غور فرمانے لگے کہ کیا اپنے ہاتھ سے بنائے گئے بت کو خدا اور قابل تعظیم سمجھا جانا چاہیے؟ اس کے بعد کیا ہوا ہم قطعی طور پر نہیں جانتے تاہم اتنا ضرور جانتے ہیں کہ جو قرآن کہتا ہے:

﴿ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصْدِيَةً

سورۃ الانفال: 35

"کعبے میں انکی نمازیں کیا تھیں (فعل رائیگاں)
سیٹیاں (اکثر) بجانی یا بجانی تالیاں" ﴾

بعض ممالک میں اب بھی بت پرستی کے دوران یہ طریق کار اپنایا جاتا ہے جہاں شور مچانے اور تالیاں بجانے کو بدروحوں کے بھگانے کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک رشتہ دار زید ابن عمرو ابن نوفل جیسے حق کے متلاشی نے نہ صرف یہ کہ بتوں کی پوجا چھوڑ دی تھی بلکہ وہ بتوں کو پیش کی جانے والی قربانی کے جانور کے گوشت کو بھی حرام قرار دیتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے۔

"اے میرے خدا! اگر مجھے اس بات کا علم ہو جائے کہ آپ کو میری عبادت کا کون سا انداز پسند ہے تو میں وہی انداز اختیار کروں گا۔ چونکہ میں اس انداز کے بارے میں علم نہیں رکھتا اس لئے میں آپ کے سامنے ایسا کرنے کو ترجیح دیتا ہوں جس میں میرا چہرہ اور ہتھیلیاں زمین پر رکھی ہوں۔"

(40) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس زید ابن عمرو ابن نوفل کے انتہائی قریبی دوست تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مذہبی اور روحانی مسائل (سوالات) پر نہ صرف خود غور وفکر کرنے لگے بلکہ اپنے دوستوں کے ساتھ بھی تبادلہ خیالات فرمانے لگے جس کی تفصیل ہمیں معلوم نہیں تاہم یہ روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم جن دوستوں سے اکثر ملاقات کیا کرتے تھے۔ اُن میں ایک عیسائی غلام عداس بھی تھا جو اپنے مالک کی دکان چلاتا تھا۔ (جبکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی تجارت کرتے تھے)۔

(41) جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فکرمندی (مذہب کے حوالے سے) میں اضافہ ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ کے قریبی پہاڑ "جبل النور" میں واقع مشہور "غارِ حرا" میں

(غور وفکر کے لئے) ایک مکمل مہینہ گزارنے کا فیصلہ کیا۔ (یہ ایک حیرت انگیز حقیقت ہے کہ ''حرا'' کے معنی ''تحقیق'' اور ''جبل النور'' کے معنی ''روشنی کا پہاڑ'' ہیں) یہ بھی روایت ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوست زید ابن عمرو ابن نوفل اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا حضرت عبدالمطلب بھی بعض اوقات غار حرا میں جا کر عبادت کیا کرتے تھے۔ بہر حال محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھانے پینے کا کچھ سامان ہمراہ لے کر غار حرا میں تشریف لے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کھانے پینے کے سامان میں سے وہاں سے گزرنے والے مسافروں کی خاطر تواضع بھی کیا کرتے تھے تاہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی وقتاً فوقتاً غار میں کھانے پینے کا سامان آپ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچاتی رہیں۔ غار حرا میں رہ کر ایک ماہ تک غور وفکر کرنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لے آئے تاہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے غور وفکر کی تفصیل ہم تک نہیں پہنچ سکی۔ غار حرا سے واپسی پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے سات بار کعبہ کا طواف کیا اور پھر اپنے گھر تشریف لے گئے۔

(42) غار حرا کے اس (ایک ماہ کے) قیام سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قدر خوشی حاصل ہوئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنا سالانہ معمول بنا لیا تھا ہمارے علم میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام تر دنیاوی کاموں حتیٰ کہ اپنے اہل خانہ سے بھی علیحدگی اختیار کر کے مسلسل پانچ سال تک ہر سال ایک مہینے کیلئے غار حرا میں تشریف لے جاتے تھے وہاں پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکمل توجہ اور یکسوئی کے ساتھ عبادت کرتے اور ان سوالات پر غور وفکر کرتے تھے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن میں ابھرتے تھے۔ ہوسکتا ہے وہ سوالات اس قسم کے ہوں جیسے کہ کائنات کا پیدا کرنے والا کون ہے؟ انسانی زندگی کا اصل مقصد کیا ہے؟ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

(43) یہ میرے لئے اعزاز اور خوش قسمتی کی بات ہے کہ مجھے اس غار کو دیکھنے کا موقع ملا۔ پہاڑ ''جبل النور'' مکہ معظمہ کے مشرقی مضافات میں شہر کے مرکز (وسط، درمیان) سے تقریباً تین سے چار کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے اور کوئی شخص جو حج کی خاطر منیٰ جاتا ہے تو وہ اس پہاڑ کو اپنے بائیں جانب دیکھتا ہے۔ یہ مخروطی شکل کی ایک اونچا پہاڑ ہے جو اردگرد کے پہاڑی سلسلے سے بالکل الگ تھلگ ہے۔ کوئی شخص اسے دیکھ سکتا ہے حتیٰ کہ جب وہ جدہ سے مکہ معظمہ کی طرف آ رہا ہو اور وہ اس کی بھاری جسامت اور اونچائی سے متاثر ہوتا ہے۔ اس پہاڑ کی چوٹی تک پہنچنے میں کافی وقت لگتا ہے۔ میں نے پہاڑ پر چڑھائی کے دوران ایک چھوٹا سا حوض دیکھا جو پہاڑ کو کاٹ کر بنایا گیا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ حوض ترکوں کے دور حکومت کے دوران بنایا گیا

تھا۔ یہ حوض کبھی کبھار ہونے والی بارش سے بھر جاتا ہے۔ جس سے کچھ عرصہ تک جنگلی جانور فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ غارِ حرا اس پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہے اور ایسی چٹانوں پر مشتمل ہے جو ایک دوسرے کے اوپر کھڑی ہیں۔ اس کے اندر سے مٹی صاف ہو چکی ہے اور پتھروں کے بڑے بڑے بلاک اس الگ تھلگ تنہا غار کی دیواروں اور چھت کو وجود دیتے ہیں۔ یہ غار اس قدر اونچا ہے کہ ایک شخص پورے قد کے ساتھ اس کے اندر کھڑا ہو سکتا ہے۔ غار کی لمبائی اور چوڑائی بھی اتنی ہے کہ کوئی شخص اس میں آسانی کے ساتھ لیٹ سکتا ہے۔ یہ غار چوڑائی کی نسبت لمبائی زیادہ رکھتا ہے اور قدرتی طور پر اس کا رُخ کعبہ کی طرف موڑا گیا ہے۔

(44) مکہ معظمہ میں مختلف ممالک اور مختلف مذاہب کے لوگ رہائش پذیر تھے۔ اگرچہ وہاں کی اکثریت بت پرست تھی مگر وہاں ایسے افراد بھی موجود تھے جو ''سچ'' کی تلاش میں مادہ پرست (مادے کو قدیم ماننے والے، اللہ کی ذات کے منکر) یا عقل پرست (ہر چیز کو عقل اور منطق کی کسوٹی پر پرکھنے والے) وغیرہ ہو گئے تھے۔ مکہ معظمہ کی تاریخ میں ایسے دو افراد کا ذکر بھی ملتا ہے جنہوں نے عیسائیت قبول کر لی تھی۔ وہ اس لئے کہ ان میں سے ایک بازنطینی عیسائیوں کی مدد و معاونت سے مکہ معظمہ کی بادشاہت کے حصول کا خواہش مند تھا جبکہ دوسرا اپنے آپ کو غسان کے ظالم و جابر حکمران سے محفوظ و مامون رکھنا چاہتا تھا۔ یہ ایک تجسس آمیز حقیقت ہے کہ مکہ معظمہ کے بعض بے دین لوگ ایک خدا پر ضرور یقین رکھتے تھے مگر موت کے بعد دوبارہ اُٹھائے جانے اور روزِ حساب کو نہیں مانتے تھے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ابھی صرف 35 سال کے جوان تھے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب زوجہ محترمہ (حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا) آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محض تین برس بڑی تھیں تاہم آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے من میں رب تعالیٰ کی ذات و صفات سے متعلق علم کے حصول کی پیاس پوری شدت کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس رجحان کے بعد حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

(45) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کے بارے میں لکھنے والے قلمکاروں نے لکھا ہے کہ ان دنوں جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم روحانی طور پر متحرک و متجسس تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا زیادہ تر وقت عبادت و ریاضت اور غور و فکر میں گزرتا تھا۔ انہی ایام میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو غیر معمولی تجربات کا بھی سامنا ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سے کوئی شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلا رہا ہے مگر جب آپ

صلی اللہ علیہ وسلم پیچھے کی جانب متوجہ ہوتے تو وہاں کوئی بھی نہ ہوتا تھا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم درختوں اور پتھروں (چٹانوں، پہاڑوں) کے قریب سے گزرتے تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلند آواز سے سلام کرتے ہوئے محسوس ہوتے۔ یہ ایک قدرتی بات ہے کہ ان واقعات نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خوفزدہ سا کر دیا۔ یہ غار حرا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی سالہ آمدو رفت کے آخری عرصہ کی کیفیات ہیں۔ درحقیقت یہ سب کچھ رب تعالیٰ جل شانہٗ کے کلام کے ساتھ فرشتہ (حضرت جبرئیل علیہ السلام) کی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آمد کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تیار کرنے کا مرحلہ تھا کیونکہ نزول وحی حقیقتاً اس قدر بھاری ہوتا ہے کہ عام آدمی اس کو برداشت نہیں کر سکتا۔ یوں ابن اسحٰق (مشہور اسلامی مؤرخ اور سیرت نگار) کی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی کے بارے میں بامعنی توجیہ (وجہ بیان کرنا) کو تحسین و تعریف کی نگاہ سے دیکھا جا سکتا ہے۔

رب تعالیٰ کا جدید ترین مجموعۂ اصول وضوابط:

(46) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماہ رمضان کے آخری عشرے میں ایک رات جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غارِ حرا میں سوئے ہوئے تھے ایک شاندار خواب دیکھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا غار حرا میں سالانہ عبادت کا یہ پانچواں برس تھا۔ ریشم کے قیمتی کپڑے میں ایک دستاویز لپیٹے ایک فرشتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے لئے آیا۔ اُس فرشتے نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہو کر کہا "اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! میں جبرئیلؑ ہوں۔ رب تعالیٰ جل شانہٗ نے اپنا پیغام آپ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچانے کی ذمہ داری مجھے سونپی ہے چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم (رب تعالیٰ جل شانہٗ کے اس تحریری پیغام کو) پڑھیئے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لیکن میں تو اُمّی (جسے کسی دنیاوی اُستاد نے نہ پڑھایا ہو) ہوں میں تو پڑھ نہیں سکتا۔" اس پر حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد اپنے بازوؤں کا گھیرا ڈال لیا اور اتنی طاقت کے ساتھ دبایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دم گھٹ جائے گا۔ پھر جبرئیل علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ دیا اور دوبارہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا "اسے پڑھیئے" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر وہی جواب دیا۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اپنے بازوؤں میں لے کر پہلے سے زیادہ طاقت کے ساتھ دبایا اور پھر چھوڑ دیا۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے تیسری مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھنے کا مطالبہ کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر وہی جواب دیا۔

اس پر فرشتوں کے سردار حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مزید طاقت کے ساتھ دبا کر چھوڑ دیا اور کہا:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍۚ
اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُۙ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ
مَا لَمْ یَعْلَمْؕ

سورۃ العلق: 1 تا 5

اپنے رب کا نام لے کر پڑھیے (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کو)
جس نے پیدا کر دیا (اس ساری مخلوقات کو)
لوتھڑے سے گوشت کے جس نے بنایا آدمی
ہاں پڑھیے، رب ہے کرم والا تمہارا (واقعی)
وہ، سکھایا ہے قلم سے جس نے علم (اس کے سوا)
وہ سکھایا آدمی کو، جو نہ تھا وہ جانتا

(47) مشہور یہی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ پہلی وحی 27 رمضان المبارک (13 قبل از ہجرت مطابق یکم جنوری 610 عیسوی) کو نازل ہوئی مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک عظیم سوانح نگار السہیلی نے جس روایت کو ترجیح دی ہے اس کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی 17 رمضان المبارک 13 قبل از ہجرت مطابق 22 دسمبر 609 عیسوی کو نازل ہوئی۔

(48) کیسا ترغیب و تحریک انگیز منظر ہے! ایک اُمّی (جسے کسی دنیاوی اُستاد نے نہ پڑھایا ہو اور یہ کہ عرف عام میں جسے پڑھا لکھا نہیں کہا جاتا) مگر انتہائی دیانت دار اور نیک اطوار تاجر نے پڑھائی لکھائی (علم و عمل) کا پیغمبر بننا تھا اور یہ ظاہر کرنا تھا کہ تمام ثقافتوں اور تہذیبوں کی بقا صرف قلم یعنی تحریر میں پوشیدہ ہے۔ اگر پُرانے نظریات کا علم ہو تو کوئی شخص ان میں نئے نظریات کا اضافہ کر سکتا ہے اور یہ کہ افراد کے مجموعی تجربہ ہی سے انسانیت کی شان و شوکت ہے جو اسے دوسری مخلوقات سے ممتاز کرتا ہے۔

(49) ہماری معلومات کے مطابق پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ایک چٹان کو پاؤں سے ٹھوکر ماری جس سے پانی کا ایک چشمہ اُبل پڑا.......... خواب جاری ہے.......... پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وضو کا طریقہ بتایا اور رب تعالیٰ جل شانہٗ کی پرستش کرنے کیلئے دو رکعت نماز کی ادائیگی کر کے دکھائی۔ پھر وہ چلے گئے۔

(50) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نیند سے بیدار ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اندیشے کی کیفیت میں تھے چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھر واپسی کا فیصلہ کیا۔ مزید یہ کہ چونکہ یہ ماہ دسمبر کی سردرات تھی اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر متوقع گھر لوٹنے پر اپنی زوجہ محترمہ (حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا) سے کہا "مجھے کمبل سے ڈھانپ دو۔ مجھے کمبل سے ڈھانپ دو۔" پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قدرے بہتری محسوس کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اہلیہ محترمہ کو وہ سب کچھ بتایا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید کہا۔

"مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں میں بھی ان کاہنوں اور نجومیوں میں شامل نہ ہو جاؤں کہ جن سے میں سخت نفرت کرتا ہوں۔"

اپنے شوہر (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) سے محبت کرنے والی زوجہ محترمہ (حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا) نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات کہہ کر ہمت میں اضافہ کیا کہ

"آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ ہر ضرورت مند اور غریب کے ساتھ سخی، فیاض اور شفیق رہے ہیں۔ رب تعالیٰ جل شانہٗ یقینی طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے اور نہ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر شیطان کا زور چلنے دیں گے۔"

(51) حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اگلی صبح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عیسائی مذہب کے پیروکار اپنے عم زاد ورقہ ابن نوفل کے پاس لے گئیں.......... ایک اور روایت یہ ہے کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہمراہ بوڑھے ورقہ ابن نوفل کے پاس بھیجا (شاید حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کسی تجارتی لین دین کے سلسلہ میں ملاقات کرنے آئے تھے)..........

جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ورقہ ابن نوفل کو وہ سب کچھ بتایا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (خواب میں) دیکھا تھا تو ورقہ ابن نوفل بے اختیار پکار اُٹھا "مقدس ترین سے مقدس! پاکیزہ ترین سے بھی پاکیزہ! اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سچا خواب دیکھا ہے تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بالکل اسی طرح کا تجربہ ہوا ہے جس طرح کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وادیٔ سینا کے پہاڑ پر ہوا تھا جہاں انہیں "تورات" عطا کی گئی تھی۔ اگر میں مزید کچھ عرصہ زندہ رہا تو خدا کی قسم! میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دفاع کرنے کیلئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دوں گا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ظلم کریں گے۔" اس پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم نے انتہائی سادگی (حیرانی) سے پوچھا "کیا وہ مجھے اس (تجربہ) پر ظلم وستم کا نشانہ بنائیں گے؟" ورقہ ابن نوفل نے جواب دیا "کوئی پیغمبر بھی مخالفت کا سامنا کیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

(52) اور پھر یوں ہوا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پُر سکون ہو کر غار حرا کے تجربہ کے بارے میں غور وفکر کرنے لگے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے خوشی اور راحت بن چکا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی تجربہ سے پھر گزرنا چاہتے تھے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت جبرئیل علیہ السلام کی آمد کا انتظار رہنے لگا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اشتیاق بڑھا اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تشویش ہونے لگی۔ انتظار میں تین سال کا ایک لمبا عرصہ گزر گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قدرے بے اطمینانی محسوس کی۔ مزید یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین نے طعنے دینا اور طنز کرنا شروع کر دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو لہب کی بوڑھی بیوی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سخت نفرت کرتی تھی۔ اُس نے یہاں تک کہہ دیا کہ "تمہارے شیطان (نعوذ باللہ) نے تمہیں چھوڑ دیا ہے اور وہ تم سے ناراض ہے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے نکل کر ایک پہاڑی پر تشریف لے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم از حد دکھی اور مغموم تھے۔ انہی لمحات میں حضرت جبرئیل علیہ السلام ظاہر ہوئے۔ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا:

"آپ صلی اللہ علیہ وسلم رب تعالیٰ جل شانہٗ کے پیغمبر ہیں۔ اس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھولے نہیں۔ تاہم مختصر بات یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب تعالیٰ جل شانہٗ کے ساتھ اپنی مرضی نہیں کر سکتے۔ (یعنی رب تعالیٰ جل شانہٗ ہی کی مرضی کے مطابق ہر کام ہوتا ہے)"

پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام نے قرآن مجید کی یہ آیات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچائیں۔

وَالضُّحٰى ۙ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۙ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۭ وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۭ وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ۭ اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۠ وَوَجَدَكَ ضَاۗلًّا فَهَدٰى ۠ وَوَجَدَكَ عَاۗىِٕلًا فَاَغْنٰى ۭ فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۭ وَاَمَّا السَّاۗىِٕلَ فَلَا تَنْهَرْ ۭ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۧ

سورۃ الضحیٰ: 1 تا 11

(اے نبیؐ ہم کو) قسم ہے دھوپ چڑھتے وقت کی
اور قسم ہے رات کی ، جس وقت ہو چھائی ہوئی
تمؐ کو چھوڑا ہے خُدا نے ، اور نہ تمؐ سے ہے خفا
آخرت، دنیا سے بہتر ہے تمہیںؐ (نامِ خُدا)
آگے چل کر ، رب تمہاراؐ دے گا (اتنا کچھ) تمہیںؐ
تمؐ بھی خوش ہو جاؤ گے (دے گا نہ وہ کیا کچھ تمہیںؐ ؟)
کیا نہیں پایا (بھلا) تمؐ کو یتیم (اللہ نے) ؟
پھر جگہ دی (جدو عم کے سائے میں ہر طو رسے)
تمؐ کو جب پایا بے خبر، تو دکھایا راستا
اور پایا تمؐ کو مفلس تو غنی (بھی) کر دیا
پس جو ہو کوئی یتیم اُس پر نہ کرنا تمؐ جفا
اور جو سائل ہو، جھڑکو تمؐ نہ اُس کو (جانے دو)
اور احساں اپنے رب کے تمؐ بیاں کرتے رہو

"اور احساں اپنے رب کے تم صلی اللہ علیہ وسلم بیان کرتے رہو" .... یہ رب تعالیٰ جل شانہٗ کا حکم تھا کہ ایمان اور نیک کاموں کی تبلیغ کرو۔ رب تعالیٰ کا اس سے بڑا احسان اور کیا ہو سکتا تھا کہ رب تعالیٰ جل شانہٗ کی جانب جانے والے راستے کی رہنمائی کر دی جائے!! جن دو قطبین کے درمیان اسلامی کرّے نے گردش کرنا تھی ان میں سے پہلا قطب، ہر قسم کے بتوں کو مسترد کرتے ہوئے صرف ایک اللہ پر ایمان لانا تھا جبکہ دوسرا قطب خیرات، فیاضی اور کمزوروں وغریبوں کی مدد کرنا تھی اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس عظیم کام کا آغاز کر دیا یوں ایک نیا دین شروع ہوا۔

باب 2

نیا دین کیوں لایا گیا؟

(53) آیئے تھوڑا سا وقت نکال کر اس سوال پر یکسوئی کے ساتھ غور و فکر کریں کہ آخر نیا دین کیوں لایا گیا جبکہ دُنیا میں بہت سے مذہب پہلے ہی سے موجود تھے؟

(54) عام لوگوں کے لیے مذہب جو بھی اہمیت رکھتا ہو مگر پاکیزہ اور نیک سیرت افراد کے لیے مذہب کم از کم ایک بنیادی ضرورت ہے۔ انسان کے تجسس آمیز سوالات کے جوابات صرف اور صرف مذہب ہی دے سکتا ہے۔ مجھے پیدا کرنے والا کون ہے؟ اس نے مجھے کیوں پیدا کیا؟ میری موت کے بعد میرے ساتھ کیا ہوگا؟ اور اسی طرح کے کئی سوالات انسانی ذہن میں پیدا ہوتے ہیں مگر بہت کم افراد ایسے ہوتے ہیں جو کہ ان سوالات کے جوابات کے حصول کے لیے کوشش و کاوش اور تحقیق و جستجو کو اپنی زندگی کا مقصد و محور سمجھتے ہیں تاہم یہ سوالات ہر شخص کی زندگی کے کسی بھی موڑ پر اس کے ذہن میں اُبھرتے ضرور ہیں۔ ان سوالات کا تعلق ان امور سے ہے جو ظاہری طور پر نظر نہ آنے والے اور ہماری دنیاوی سمجھ کی تمام سرحدوں سے دُور ہیں۔

(55) اگر ہمیشہ سے نہیں تو ایک لمبے عرصہ سے انسان اس امر سے بخوبی آشنا ہے کہ اپنا خالق وہ خود نہیں ہے۔ اس کی والدہ، والد یا دادی، دادا کے علاوہ بھی کوئی ایسی ذات ضرور موجود ہے جس نے وجوہات واثرات کی اس کائنات کو وجود دیا۔ اس حقیقت کے شعور کے باوجود کہ انسان اس خالق ذات کو نہیں دیکھ سکتا مگر اس کے لازمی واٹل وجود کو تصدیق و تسلیم کرنے پر مجبور ہے۔ انسان نے بہت قلیل عرصہ میں یہ راز بھی معلوم کر لیا کہ تمام انسانوں کو صلاحیتیں، عادتیں اور طور طریقے ایک جیسے عطا نہیں کیے گئے۔ فیض رساں، سچے اور احتیاط شناس افراد کی تعداد بہت ہی کم تھی اور ایسے لوگوں کی فطرت ہی ''اللہ جل شانہٗ کی راہ میں جدوجہد'' میں ان کی رہنمائی اور تحفظ کرتی تھی۔ اگر چند لوگوں کے ذاتی مفادات نے انہیں ''رب تعالیٰ جل جلالہٗ کے پیغمبروں'' کی رہنمائی پر عمل پیرا ہونے سے روکے رکھا تو روز افزوں تعداد میں ایسے افراد بھی تھے جو رہنمائی پر نہ صرف عمل پیرا ہوئے بلکہ پیغمبروں کی حمایت میں مرنے مارنے پر تیار ہو گئے۔ انحطاط کے باعث ذلت سے نجات کے لیے نئی کاوشوں اور نئی نسلوں کے افراد کی نئے سرے سے کوششوں کی ضرورت تھی۔ بنی نوع انسان کی قدیم کارکردگی کے جائزہ تک ہماری رسائی نہیں ہوئی تاہم قدیم انسانی نسلوں کے ذریعے جو کچھ ہم تک پہنچا ہے اس کے مطابق انسانیت کے رہبر و رہنما یہی

کہتے تھے کہ "میں رب تعالیٰ جل شانہٗ کا کہ جس نے تمہیں پیدا کیا، کا وہ پیغام جو اللہ جل جلالہٗ نے تم تک پہنچانے کیلئے میرے پاس بھیجا ہے تمہارے پاس لے کر آیا ہوں تا کہ تمہارے حوالے کر سکوں۔"

(56) تعلیمات اسلام کے مایہ ناز فلسفی محی الدین ابن العربی "فتوحات مکیہ" میں شافع روز جزا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دلچسپ حدیث بیان کرتے ہیں کہ سردار الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا "دُنیا میں ایک لاکھ آدم تشریف لائے اور ہم ان میں سے آخری آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔" ایک اور دلکش و دلفریب روایت ہے کہ "ایک دفعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رب رحمٰن ورحیم سے عرض کی کہ مُجھے کوئی اُعجوبہ تو دکھایئے۔ رب تعالیٰ جل شانہٗ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ ایک خاص مقام پر پہنچیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ایک صحرا تھا جہاں کوئی ذی روح نہیں تھا تاہم ایک گڑھا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جی میں کیا آئی کہ انہوں نے اُس گڑھے میں ایک کنکری پھینکی تو گڑھے سے آواز آئی 'تم کون ہو؟' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا تعارف اس طرح کرایا کہ حضرت آدم علیہ السلام تک اپنا شجرہ نسب بیان کیا کیونکہ انہیں اپنے علم کی وسعت پر ناز تھا مگر وہ نظروں سے اوجھل آواز آئی 'تم کونسے آدم کی بات کر رہے ہو کیونکہ ہر دس ہزار سال بعد کوئی نہ کوئی شخص یہاں پہنچتا ہے اور اس گڑھے میں کنکری پھینکتا ہے مگر جب اس سے پوچھا جاتا ہے تو بالکل یہی نام اور شجرہ نسب بتاتا ہے جو تم نے بتایا ہے اور یوں یہ گڑھا ان کنکریوں سے تیزی کے ساتھ بھرتا جاتا ہے!'"

(57) ایک لاکھ آدم! یعنی نوع انسانی ایک لاکھ مرتبہ نابود ہوئی اور پھر وجود میں آئی ہے۔ رب علیم وخبیر بہتر جانتے ہیں تاہم ہم اپنے آدم علیہ السلام کا ذکر کرتے ہیں۔ اسلامی روایتوں کے مطابق آپ علیہ السلام پر رب تعالیٰ جل شانہٗ کی طرف سے صحیفوں کا نزول ہوا۔ ایک حدیثِ رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے اس امر کی تصدیق وتوثیق ہوتی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر دُنیا میں تشریف لائے جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم آخری پیغمبر ہیں۔ اور سب پیغمبروں نے توحید اور حیات بعد از موت کی ابدی وازلی صداقت کی تعلیم وتبلیغ کا احسن فریضہ سرانجام دیا۔

(58) حضرت آدم علیہ السلام اور ان کے فرزند حضرت شیث علیہ السلام پر نازل ہونے والے صحیفوں میں بیان کی گئی باتوں کے بارے میں ہمیں علم نہیں تاہم دستیاب قدیم ترین تفصیلات حضرت حنوک یعنی حضرت ادریس علیہ السلام کے بارے میں ہیں جنہیں اسلامی روایات کے مطابق تحریر کا موجد تسلیم کیا گیا ہے چنانچہ "عہد نامہ جدید" میں یہودہ کے خط میں لکھا ہے کہ

"حضرت آدم علیہ السلام کے بعد ساتویں نمبر پر حضرت حنوک (حضرت ادریس علیہ

السلام) نے ان (یعنی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں پیش گوئی کرتے ہوئے کہا کہ دیکھو خداوندا اپنے دس ہزار پاکیزہ دوستوں کے ہمراہ آتا ہے تاکہ سب لوگوں سے انصاف کرے اور سب بے دینوں کو ان کے بے دینی کے کاموں اور ان تمام سخت باتوں کے باعث جو بے دینوں نے اس کی مخالفت میں کہی ہیں انہیں گنہگار اور قصوروار قرار دے۔"

اس خط کے حوالے سے عیسائی مبصرین نے یہی رائے دی ہے کہ اس میں کسی آنے والے کے بارے میں پیش گوئی کی گئی ہے تاہم حضرت حنوک (حضرت ادریس علیہ السلام) کی بقایا تعلیمات مکمل طور پر ہم تک نہیں پہنچ پائیں۔

(59) نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں زرتشت (آتش پرستی)، برہمنیت (ہندومت)، بدھ مت، صابئیت (سیارہ پرستی)، یہودیت اور عیسائیت شاید زیادہ اہم رائج مذاہب تھے اور اہل مکہ کی اُن تک رسائی بہت آسان تھی۔ اور یہ کہ ان مذاہب کو انسانوں کے ہاتھوں بنائے ہوئے بتوں کی پرستش کے مقابلے میں بہتر گردانا جاسکتا تھا مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی مذہب بھی خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دیانتدارانہ اور پاکیزہ ذہن کو کیوں مطمئن نہ کرسکا؟

زرتشت مت (آتش پرستی)

(60) شاید زرتشت مت اُس دور کے رائج مذاہب میں سے قدیم ترین مذہب تھا لیکن مکہ مکرمہ میں اس مذہب کو ماننے والا کوئی نہیں تھا تاہم زرتشت مذہب کے بہت سے پیروکار مشرقی اور جنوبی عرب میں رہائش پذیر تھے اور یہ وہ علاقے تھے جہاں مکہ مکرمہ کے تجارتی قافلوں کی آمدورفت رہتی تھی۔ زرتشت مذہب کی "زند" زبان میں مشہور اور بنیادی کتاب "اَوِستا" بالکل نایاب تھی۔ مزید یہ کہ "پازند" زبان میں لکھی گئی "شرحِ اَوِستا" بھی مزدکیوں (مزدک کے باسی) اور زرتشتوں کے مابین مذہبی جنگوں کے دوران ناپید ہوچکی تھی تاہم اس کے کچھ بکھرے ہوئے اوراق ہم تک پہنچے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ زرتشت نے عقیدۂ اہورا مزدا یعنی ایک خدا کی پرستش کی تعلیم دی ہو مگر عرب اسے دوئی یا ثنویت (وحدت کے علاوہ دو سمجھنا، وہ عقیدہ جس میں اہرمن اور یزدان دو خدا مانے جاتے ہیں) اور خویدو گداس یعنی ترویج محرمات (اس عقیدہ کی رو سے حقیقی بہن، بیٹی اور والدہ سے شادی زیادہ متبرک اور بہتر خیال کی جاتی تھی) کا بانی گردانتے تھے۔ اس بات کا امکان ہے کہ یہ عقائد اس مذہب کی بنیادی اور حقیقی تعلیمات میں شامل نہ ہوں مگر ساتویں صدی عیسوی کے ابتدائی دور تک اس مذہب میں اس قدر بگاڑ پیدا ہوچکا تھا کہ اس کے پیروکاروں نے آگ کی پوجا شروع کردی تھی اور وہ یقینی طور پر یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ نیکی

کا خدا (یزدان) اور بدی کا خدا (اہرمن) الگ الگ وجود رکھتے ہیں اور یہ کہ ان دونوں خداؤں کے مابین ختم نہ ہونے والی جنگ جاری وساری ہے۔

(61) یوں آفتاب ھدیٰ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا رویہ بہت آسانی سے سمجھ آ جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے قلب [illegible] میں رب تعالیٰ جل شانہٗ کی اس درجہ تعظیم و تکریم تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم قطعی طور پر یہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ رب تعالیٰ جل جلالہٗ "بدی" بھی پیدا فرما سکتے ہیں مگر عقیدۂ ثنویت میں دو خداؤں اہرمن اور یزدان میں مسلسل جنگ کے نتیجہ میں عام طور پر یزدان کو فاتح سمجھا جاتا ہے۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ خالق کی خوشی کی خاطر اس کی مخلوق کی تعریف وتوصیف کی جائے۔ سردار الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وقت سب سے زیادہ طاقتور آگ کو سمجھا جاتا تھا کیونکہ وہ ہر چیز کو جلانے اور تباہ کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اس طرح آگ رب ذوالجلال کی قدرت کاملہ کی علامت اور اظہار تصور کی جا سکتی تھی۔ ان لوگوں کے ذہن میں یہ بات تھی کہ آگ کی تعظیم دراصل آگ کے خالق کی تعظیم تھی لیکن یہ تو حقیقتاً بُت پرستی ہی تھی تاہم قدیم ترین اور بدترین بُت پرست کا بھی یہ عقیدہ نہیں تھا کہ اس کے ہاتھ کا بنایا ہوا بُت اس کا خدا ہو سکتا ہے بلکہ وہ اُسے خدا کی علامت، خدا کے کسی وصف کا نمائندہ یا مظہر سمجھتا تھا۔ انتہائی قریبی رشتہ داروں کے ساتھ شادی کو تمام ادوار میں تمام انسانوں نے نفرت کی نگاہ سے دیکھا ہے حتیٰ کہ اسلامی روایت کے مطابق کائنات کے پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام کی زوجہ محترمہ عام طور پر دو جڑواں بچوں (لڑکا، لڑکی) کو جنم دیتی تھیں۔ ایک وقت کی پیدائش کی لڑکی کی شادی دوسرے وقت کی پیدائش کے لڑکے سے کر دی جاتی تھی۔ یوں ایک ہی وقت میں پیدا ہونے والے بہن بھائی کی شادی [illegible] نہیں کی جاتی تھی جبکہ بعد کی نسلوں میں چچازاد، خالہ زاد، ماموں زاد یا دُور کے رشتہ داروں [illegible] سے شادی کو ترجیح دی جاتی تھی۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اگر جڑواں بہن بھائی کے مابین شادی رائج ہو جاتی تو انسانی نسل پرندوں اور چوپایوں کی نسل کی طرح (ذہنی وارتقائی طور پر) غیر متحرک ہو کر رہ جاتی اور یہ کہ جڑواں پیدائش معمول بن جاتی چنانچہ انسانی ذہانت اور ارتقاء مختلف خاندانوں اور دُور کے رشتہ داروں میں شادی کی وجہ سے ہے۔ کچھ بھی ہو، زرتشتوں (مجوسیوں، پارسیوں، مزدکیوں) کا انتہائی قریبی رشتہ داروں کے ساتھ شادی کرنا ایک ایسا فعل تھا جسے قابل نفرت اور پورے زرتشت مت کیلئے قابل مذمت سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح زرتشتوں کا جانوروں کو ذبح کرنے کا طریقہ بھی

عربوں کے نزدیک نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

(62) جدید تحقیق کے مطابق زرتشت ایک خدا، فرشتوں، جنت، اپنے منتخب بندوں پر اللہ تبارک وتعالیٰ کا نزول الہام یا وحی اور اس طرح کے دیگر حقائق پر یقین رکھتا تھا۔ اُس نے "زند" زبان میں اپنی کتاب "اوستا" (یشت 13، XXVIII، 129) میں ایک بُت شکن کی آمد کی پیش گوئی کی ہے جس کا نام "سوشیانت" یعنی سب پر رحم کرنے والا اور "استوات کریات" یعنی لوگوں کو پستی سے نکال کر بلندی پر پہنچانے والا ہوگا۔

برہمنیت (ہندومت)

(63) قرآن مجید میں ہندوستانی برہمنیت کا براہ راست کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا۔ دراصل باعثِ تخلیق کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت کے وقت ہندومت اور اس کے حریف بدھ مت میں زندگی اور موت کی جدوجہد جاری تھی۔ سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہندوستانیوں سے ضرور واقف تھے مگر یہ کہنا مشکل ہے کہ ہادیٔ کون و مکاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہندوستانیوں کے مذہب سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ قرآن پاک میں سونے سے تیار کردہ یہودیوں کے گائے کے بچھڑے کا واقعہ بیان کیا گیا ہے اس کے مطابق گائے کے اس بچھڑے کو سامری نام کے ایک زرگر نے تیار کیا تھا (بائبل میں اس بچھڑے کو تیار کرنے کا ذمہ دار حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی حضرت ہارون کو ٹھہرایا گیا ہے جو کہ صحیح نہیں ہے)۔ اس حوالے سے چھوت چھات کا ذکر بھی آتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے (سورۃ طٰہٰ: 85-97):

قَالَ فَإِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْ بَعْدِكَ وَأَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ۝ فَرَجَعَ مُوسَىٰ إِلَىٰ قَوْمِهِ غَضْبَانَ أَسِفًا ۚ قَالَ يَا قَوْمِ أَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۚ أَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ أَمْ أَرَدْتُمْ أَنْ يَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِنْ رَبِّكُمْ فَأَخْلَفْتُمْ مَوْعِدِي ۝ قَالُوا مَا أَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلَٰكِنَّا حُمِّلْنَا أَوْزَارًا مِنْ زِينَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنَاهَا فَكَذَٰلِكَ أَلْقَى السَّامِرِيُّ ۝ فَأَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَهُ خُوَارٌ فَقَالُوا هَٰذَا إِلَٰهُكُمْ وَإِلَٰهُ مُوسَىٰ فَنَسِيَ ۝ أَفَلَا يَرَوْنَ أَلَّا يَرْجِعُ إِلَيْهِمْ قَوْلًا وَلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا ۝ وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هَارُونُ

مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ ﴿٩٠﴾ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى ﴿٩١﴾ قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ﴿٩٢﴾ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ۭ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ﴿٩٣﴾ قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ ۚ اِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ ﴿٩٤﴾ قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ﴿٩٥﴾ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ﴿٩٦﴾ قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ ۠ وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ ۚ وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا ۭ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ﴿٩٧﴾

(طٰہٰ: 85-97)

﴿بولے ہم، ہم نے تمہاری قوم کو بچلا دیا
(بچلا دیا یعنی آزمائش میں ڈال دیا)

سامری نے ہے تمہارے بعد اُسے بہکا دیا
لوٹے موسیٰؑ قوم میں افسوس مند و خشمگیں
اور کہا اے قوم، کیا رب نے تھا فرمایا نہیں؟
اچھا وعدہ، (خوشگوار اک عہد، قولِ بہتریں)؟
کیا (مرے وعدے کے) لمحے تم پہ لمبے ہو گئے؟
یا یہ چاہا تم پہ نازل ہوں غضب اللہ کے
کیا جو وعدہ مجھ سے تھا، توڑا وہ تم نے اس لیے؟
لوگ بولے اختیاری تھا نہ وعدہ توڑنا
(قبطیوں کی) قوم کے زیور کا ہم پر بوجھ تھا
(سامری کے کہنے سے) پھینکا وہ زیور (آگ میں
ڈالا زیور سامری نے بھی (مکرر آگ میں
ایک بچھڑا پھر بنایا اُس نے لوگوں کے لیے
ایک دھڑ، بچھڑے کی آواز آ رہی تھی جس میں سے

(بعض) لوگوں نے کہا، ''یہ ہی تمہارا ہے خدا
بھول موسیٰؑ سے ہوئی، موسیٰؑ کا بھی رب یہ ہی تھا''
دیکھتے تھے کیا نہ اتنا بھی یہ (مردانِ ریا)؟
وہ جواب ان کو نہ دیتا تھا کسی بھی بات کا
اور نہ ان کے نفع یا نقصان کا مختار تھا
پہلے ہی ہارونؑ ان سے کہہ چکے تھے بھائیو!
اس ذریعے سے تمہاری آزمائش ہے (سنو
ہے تمہارا رب تو (اے لوگو فقط) رحمٰن ہی
میرے کہنے پر چلو، اور مانو میری بات بھی
لوگ بولے لوٹ کر جب تک نہ موسیٰؑ آئیں گے
جم کے بیٹھیں گے یہیں، اس کی پرستش کے لیے
(آئے) موسیٰؑ اور یہ ہارونؑ سے کہنے لگے
جبکہ اے ہارونؑ، یہ گمراہ سب تھے ہو گئے
پیروی سے میری کس نے تم کو روکا تھا (کہو
تم نے کیوں رد کر دیا (دانستہ) میرے حکم کو
بولے ہارونؑ اے مرے ماں جائے یوں پکڑو نہیں
میری داڑھی اور سر کے بال، میں تو (بالیقیں)
ڈر گیا اس بات سے تم یہ (نہ) کہدو (لوٹ کر)
پھوٹ اسرائیلیوں میں ڈالدی کیوں (بے خبر)؟
اور نہ رکھی یاد میری بات (مجھ کو تھا یہ ڈر)
پوچھا (پھر موسیٰؑ نے) ہے کیا حال تیرا سامری؟
بولا مجھ کو چیز اک ایسی نظر آنے لگی
جو نہ دیکھی تھی کسی نے۔ (تھا نہ کوئی رازدار)
(یعنی دیکھا میں نے ہیں جبرئیلؑ گھوڑی پر سوار)
پاؤں کے نیچے سے میں نے اس فرشتے کے (یونہی)
ڈالدی بچھڑے کے اندر ایک مٹھی خاک کی
میرے دل نے مشورت ایسی ہی کچھ تھی مجھ کو دی

بولے موسیٰ" دور ہو، تیرے لیے ہے یہ سزا
کہتا پھر، تازندگی "مجھ کو نہ چھونا" دیکھنا
ایک وعدہ اور ہے تجھ پر سے جو ٹلنا نہیں
دیکھ اس معبود کو اپنے تو جس پر (اے لعیں)
سارے سارے دن مجاور بن کے تھا بیٹھا رہا
ہم جلا دیں گے اسے، پھر دیں گے دریا میں بہا﴾

گائے کی پوجا اور چھوت چھات دونوں خاصیتیں برہمنیت کی علامت ہیں۔ سامری دراصل ان کے سرداروں کو کہتے ہیں۔ اگر گائے کی پوجا ان کی نمایاں خصوصیت ہے تو چھوت چھات کا غیر انسانی نظریہ بھی ان ہی کی خصوصیت ہے۔ مزید یہ کہ قرآن حکیم میں زُبُر الاولین (قدیم لوگوں کی حکایات پر مشتمل کتابیں) کا بھی ذکر آیا ہے۔ ارشاد رب العزت ہے:

﴿وَإِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ﴾

(الشعراء:196)

"ذکر ہے اگلی کتابوں میں بھی اس کا (دیکھ لیں)" ("اس کا" یعنی قرآن الحکیم کا)﴾

یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ ہندو برہموں کی مذہبی کتابیں متعدد ہیں اور ہندو ان تمام کتابوں کو الہامی مانتے ہیں۔ ان کتابوں میں ایک مجموعۂ کتب "پُران" بھی شامل ہے جس کے لغوی معنی ہیں "قدیم کتب" [ان قدیم کتب میں علم الاصنام سے متعلق اٹھارہ کتابیں شامل ہیں یعنی (1) وشن (2) ناروپا (3) بھاگوت (4) گرو (5) پدم (6) واریا (7) متیسا (8) کرما (9) لنگا (10) شو (11) سکند (12) اگنی (13) برہم (14) برہمند (15) برہم دیورت (16) مارکنڈیہ (17) بھوشیہ (18) وامن۔]

پھر یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ہندوستانی شہزادے رام کی کہانیوں میں حیران کن مشابہت ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آپ علیہ السلام کے والد نے گھر سے نکال دیا تھا اور جب وہ اپنی زوجہ محترمہ سارہ بی بی کے ہمراہ مصر پہنچے تو وہاں بداخلاق و بدکردار ظالم بادشاہ نے یہ حرکت کی کہ محترمہ سارہ بی بی کو زبردستی اپنے محل تک پہنچوایا مگر (رب کائنات جل شانہٗ کی مدد سے) ایک معجزے کی بدولت محترمہ سارہ بی بی کی عزت محفوظ رہی اور وہ شاہی تحفوں کے ساتھ واپس حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس پہنچ گئیں۔ ان کے ہمراہ مصری بادشاہ کی بیٹی

حاجرہ بھی تھی جو بعد میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی والدہ ماجدہ بنیں۔ انجیل کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اصل نام "ابرام" تھا جبکہ خدائے بزرگ و برتر نے آپ علیہ السلام کو ابراہیم یعنی بابائے اقوام کے خطاب سے نوازا تھا۔ اسی طرح ہندوستانی شہزادہ رام کو بھی اس کے والد نے اپنے ملک سے نکال دیا تھا اور جب وہ جنگل میں جلاوطنی کے دن گزار رہا تھا تو سیلون کا بادشاہ اس کی خوبصورت بیوی سیتا پر فریفتہ ہو گیا اور اسے زبردستی اغوا کر کے اپنے ساتھ لے گیا۔ سیتا بھی اپنی عزت کی حفاظت میں کامیاب و کامران رہی۔ اُس نے بعد میں آگ کے ایک بہت بڑے الاؤ سے صحیح و سالم گزر کر یہ ثابت کر دکھایا کہ وہ پاک دامن تھی (حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی آگ سے محفوظ و مامون رہے تھے) "پُران" کے علاوہ "وید" بھی برہمنوں کا مذہبی مجموعہ ہے جس کا مصنف برہمنوں کے بقول برہما (خدا) ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اُترنے والے صحائف کا ذکر قرآن حکیم میں بھی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ برہما اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مابین منفرد مماثلت ملتی ہے۔ میں اکثر اپنے آپ سے سوال بھی کرتا ہوں کہ کیا "خداوند کی جنگوں کی کتاب" (جس کا حوالہ بائبل (نمبرز 21/24) میں ملتا ہے) کے متن کو "مہابھارت" اور "گیتا" میں تلاش نہیں کیا جانا چاہیے؟

(64) اگرچہ برہمنیت یعنی ہندومت کے پیروکار ایک خدا پر یقین رکھتے ہیں تاہم وہ خدا کے مظاہر کی بھی پرستش کرتے ہیں چاہے وہ خدا کی تخلیق ہو یا خدا کی کسی خاصیت کی علامت، نمائندگی یا اظہار ہو۔ یوں برہمنوں کے مطابق ان کے دیوتاؤں کی تعداد چالیس کروڑ ہے یعنی دیوتاؤں کی تعداد پجاریوں کی تعداد سے زیادہ ہے اور گائے دیوتاؤں کے اس کثیر اجتماع کی صدر (سردار) ہے۔ ہندومت کے پیروکار اگر جانوروں مثلاً ناگ اور ہنومان (بندر) کی پرستش کرتے ہیں تو وہ درختوں، پتھروں، دریاؤں کے سنگم اور منبع، سورج، چاند اور ان گنت دوسری چیزوں کی پوجا بھی کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ وہ علم، موت، دولت وغیرہ کو بتوں کی شکل دیتے ہیں اور انہیں دیوتا مان کر ان کی پوجا کرتے ہیں۔

(65) قابل ذکر بات یہ ہے کہ برہمنیت ایک خاندان تک محدود ہے یعنی برہمن کے علاوہ کوئی دوسرا شخص ہندو نہیں بن سکتا۔ ہندو کہلانے کا حق محض اسی کو ہے جو ہندو خاندان میں پیدا ہو۔ اس مذہب کا ایک خاص پہلو عقیدہ تناسخ (ایک ہی روح کے مختلف اجسام میں کئی جنم) ہے۔ ایسے شخص کے لیے جو کسی عالمگیر مذہب کا متلاشی ہو۔ ایسا عالمگیر مذہب جو پوری انسانیت کو اپنی برکت و رحمت کی آغوش میں پناہ دے سکے اس شخص کے لیے یہ قطعی ناممکن ہے کہ وہ

برہمنیت (برہمن تک محدود مذہب) کی طرف کسی صورت بھی رجوع کرے۔

(66) ہندومت بھی دوسرے قدیم مذاہب کی طرح خدا کے آخری اوتار (دیوتا، ولی) کی آمد کے انتظار میں ہے۔ مثلاً ہندوؤں کی کتاب ''اتھر واوید'' میں اس آنے والے کا نام ''نری شنساہ استی وشیاتی'' (یعنی جس کی توصیف کی گئی اور تکریم کی جائے گی یعنی محمد یا محمود) بتایا گیا ہے۔ وہ ایک گاڑی پر سوار ہوگا جسے اونٹ کھینچ رہے ہوں گے اور وہ اس قدر تیزی سے دوڑ رہے ہوں گے جیسا کہ آسمان کی بلندیوں کو چھو رہے ہوں۔ ہندومت کی ایک اور معتبر کتاب ''وشنو پران'' کے باب 24 میں کہا گیا ہے کہ جب ویدوں (سچے علم کی کتاب) کی تعلیمات اور قانونی اداروں کے اختیارات ختم ہو کر رہ جائیں گے اور تاریک دور کا انجام قریب ہوگا تو خدا کا آخری اوتار ایک جنگجو کے روپ میں آئے گا۔ وہ ''سنبلہ دِب'' (ریت کا جزیرہ) کے ایک مکرم و معظم خاندان میں پیدا ہوگا۔ اس کے والد کا نام ''وشنو یاسا'' (اللہ کا بندہ یعنی عبداللہ) اور والدہ کا نام ''سومتی'' (قابل اعتماد یعنی آمنہ) ہوگا۔

بدھ مت:

(67) برہمنیت یعنی ہندومت کی بُت پرستی کے خلاف احتجاج ہی بدھ مت کے آغاز کا سبب بنا۔ بدھ مت مکمل طور پر کوئی نیا مذہب نہیں تھا بلکہ بُت شکنی کے حق میں ایک اصلاحی و فلاحی تحریک تھی چنانچہ اس میں کئی دوسرے مذاہب کی نمایاں خصوصیات یکجا ہوگئی تھیں مثلاً بدھ مت ''عقیدہ تناسخ'' (ہندوؤں کے اعتقاد کے مطابق بار بار جنم لینا۔ ایک جسم سے روح کا نکل کر دوسرے جسم میں جانا) پر بھی یقین رکھتا ہے۔ بدھ مت خیرات و امداد، ترکِ دنیا اور گیان دھیان (مراقبہ، محوِ خیال) کی تعلیم دیتا ہے۔ اس کے ذریعے انسان کو از خود سچا علم حاصل ہوتا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ ریاست کپل وستو کے بادشاہ سُدودھن کا بیٹا بدھ شکی مُنی ہی بدھ مت کا بانی تھا۔ جب اُس نے ایک دن جنازے کا جلوس دیکھا تو وہ اس سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے گھر اور خاندان کو چھوڑ کر رہبانیت (ترکِ لذت کے ساتھ پرہیزگاری) اختیار کر لی اور ایک روز جب وہ جنگلی انجیر کے ایک درخت کے سائے میں (گیان یعنی مراقبہ میں) بیٹھا تھا تو اسے روشن خیالی (علم میں اضافہ، جہالت سے آزادی) عطا ہوئی۔ اگرچہ اُس نے کوئی کتاب نہیں چھوڑی تاہم اس کے پیروکاروں نے اس کے اقوال جمع کر کے ہم تک پہنچائے ہیں۔ وہ خدا کے بارے میں خاموش ہے جبکہ ترکِ دُنیا اور نفس کشی پر اصرار کرتا ہے۔ اگرچہ اس نے اپنے (گوتم بدھ کے) مجسموں سمیت تمام بتوں کو توڑنے کی تبلیغ و تلقین کی۔ (کیونکہ مجسمہ سازوں نے گوتم

بدھ کے مجسمے بدھ مت کے آغاز میں ہی بنانا شروع کر دیئے تھے) مگر بدھ مت کے انتہائی محتاط پیروکاروں نے اپنے لائق تعظیم و تکریم آقا کے مجسموں کو توڑ کر اُس کی بے حرمتی کی جرأت نہ کی۔ پس بدھ مت بھی دوسرے بت پرست مذاہب کی طرح بت پرست مذہب کے طور پر ظاہر ہوا اور یوں گوتم بدھ کے اپنے مجسمہ (بت) کی پرستش ہونے لگی۔

(68) بدھ مت ہندوستان اور چین کے وسیع علاقے میں پھیل گیا۔ اور جب نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ظہور ہوا تو بدھ مت ایک بڑے مذہب کے طور پر تسلیم کیا جاتا تھا۔ قرآن مجید یا حدیث پاک میں بدھ مت کا براہ راست کوئی ذکر نہیں ملتا تاہم قرآن حکیم کے کئی قدیم و جدید مفسرین نے خیال ظاہر کیا ہے کہ انجیر کا درخت جس کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح آیا ہے کہ:

﴿وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ﴾

(التین:1)

”ہے قسم انجیر کی اور ہے قسم زیتون کی“﴾

شاید اس درخت کی طرف اشارہ ہے جس کے سائے تلے گوتم بدھ کو روشنی (روشن خیالی) عطا ہوئی تھی۔ گوتم بدھ کی جائے پیدائش کی وجہ سے شاید ایک پیغمبر کو ذوالکفل (کفل یعنی کپل سے آنے والا) کہا گیا ہے۔ درحقیقت اس پیغمبر کے بارے میں قرآن، حدیث یا اسلامی کتابوں میں کسی قسم کی کوئی تفصیل نہیں ملتی حالانکہ قرآن حکیم میں دو دفعہ اس کا حوالہ دیا گیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِدْرِيْسَ وَذَا الْكِفْلِ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ﴾

(سورۃ الانبیاء:85)

وَاذْكُرْ اِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ وَكُلٌّ مِّنَ الْاَخْيَارِ

(سورۃ ص:48)

اور اسمٰعیل، اور ادریس اور ذوالکفل بھی صبر کرنے والے (بندے) تھے (حقیقت ہے یہی) اور اسمٰعیل کو، الیسع اور ذوالکفل کو نیک بندوں میں ہیں یہ سب، یاد ان کو بھی کرو﴾

(69) ایسا مذہب (بدھ مت) جس میں بت پرستی بھی ہو اور وہ ترک دنیا کو بھی لازمی قرار دیتا ہو وہ عوام الناس کی توجہ حاصل نہیں کر سکتا تھا کیونکہ ترک دنیا تو محض چند افراد ہی کے لیے مخصوص ہو سکتی ہے۔

(70) یہ ایک تجسس آمیز بات ہے کہ گوتم بدھ نے بھی کہا تھا کہ اس نے مذہب کی تکمیل نہیں کی بلکہ "میتریا" یا "متیا" یعنی سب پر رحم کرنے والا ابھی آنا باقی ہے۔﴿رحیم، رب تعالیٰ جل شانہٗ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن پاک میں رحیم کہا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۝

(سورۃ التوبہ: 128)

لوگو! تم میں سے تمہارے پاس آئے ہیں رسولؐ
دیکھ کر تکلیف میں تم کو، جو ہوتے ہیں ملول
ہے بھلائی کی تمہاری، حرص انؐ کو بیکراں
اور ہیں ایمانداروں پر شفیق و مہرباں﴾

صابئیت:

(71) اس مذہب کا نام اگرچہ قرآن پاک میں آیا ہے

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَ الصّٰبِئِيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۝

(البقرہ: 62)

"ہاں، مسلماں اور یہودی اور نصاریٰ، صابئیں
جن کا ایماں ہے خدا پر، عاقبت پر ہے یقیں
اور ان کے ہیں عمل بھی نیک، تو اللہ سے
اجر اُن سب کو ملے گا (حق خدمت پائیں گے)
اُن کو اندیشہ نہیں وہ حزن و غم سے چھوٹ گئے"﴾

لیکن اس کی تفصیل نہیں دی گئی تاہم سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ صابئیت کی بنیاد کسی الہامی کتاب پر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کتاب حضرت نوح علیہ السلام پر نازل ہوئی ہو جیسا

کہ دور جدید کے صابی ایسا ظاہر کرتے ہیں۔ اب اگرچہ یہ کتاب نایاب ہے تاہم اس کے موادو متن کا ایک خاکہ روایتوں کی شکل میں محفوظ ہے اور اس مذہب کے پیروکاروں میں رائج ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ صابیئت کے پیروکار سیاروں کی پرستش کرتے تھے اور ان کے اثرات کے قائل تھے۔ سات سیاروں کے ناموں [شمس، قمر، زہرہ، مشتری، مریخ، عطارد اور زحل] سے منسوب سات ہیکل (عبادت گاہیں) دنیا کے سات ممالک میں موجود تھیں۔ المسعودی کے مطابق صابی یہ یقین رکھتے تھے کہ مکہ مکرمہ کی عبادت گاہ کعبہ، زحل سیارہ کے براہ راست زیر اثر ہے جس کا لغوی مطلب 'ابدیت' (ہمیشگی) ہے۔[حضرت امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صابی دراصل سیارہ پرست لوگ تھے جن کی جانب حضرت ابراہیم علیہ السلام بھیجے گئے (ان کا مرکز دجلہ اور فرات کے دوآبہ میں ایک قدیم شہر ''حران'' تھا)۔ بعض علماء کے نزدیک یہ لوگ زبور پڑھا کرتے تھے جبکہ بعض علماء کا یہ خیال ہے کہ یہ لوگ حضرت یحیٰؑ علیہ السلام کے پیروکار تھے۔ ''بلوغ الارب فی معرفۃ احوال العرب'' جلد دوم صفحہ 225 میں سید محمود البغدادی لکھتے ہیں کہ صابئین کی دو قسمیں تھیں ایک موحد جبکہ دوسرے مشرک۔ حقیقت کا علم تو محض رب علیم وخبیر کو ہے مگر بظاہر یہی قول صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ نہ یہودی تھے، نہ نصرانی، نہ مجوسی اور نہ ہی مشرک تھے بلکہ یہ لوگ فطرت پر تھے اور کسی خاص مذہب کے پابند نہیں تھے (جبکہ صابی کے لغوی معنی ہیں ''مذہب تبدیل کرنے والے لوگ'')۔ اسی معنی میں مشرکین مکہ رسول مکرم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کو صحابی کہنے کی بجائے ''صابی'' کہتے تھے یعنی ان لوگوں (صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم) نے تمام مروجہ مذاہب تبدیل وترک کر دیئے۔]

یہودیت:

(72) قرآن حکیم میں قدیم مذاہب کے تذکرہ میں یہودیت کی تفصیل سب سے زیادہ دی گئی ہے (یہودیت حضرت موسیٰؑ علیہ السلام کا دین تھا)۔ قرآن مجید نے یہودیوں کی کتاب تورات کو الہامی تسلیم کیا ہے۔ مسلمان اور یہودی دونوں وحدانیت (توحید) پر ایمان رکھتے ہیں اور اس مسئلہ کے حوالے سے ان کے مابین کوئی اختلاف نہیں۔ مزید یہ کہ قرآن حکیم میں کئی دفعہ واضح الفاظ میں تسلیم کیا گیا ہے کہ رب تعالیٰ جل شانہٗ یہودیوں کو تمام قوموں سے بہتر و برتر تصور کرتے تھے۔ قدرتی طور پر اس حقیقت کا تعلق اس دور سے ہے جب حضرت موسیٰؑ علیہ السلام پیغمبر تھے اور یہودی حضرت موسیٰؑ علیہ السلام کے لائے ہوئے دین پر مکمل طور پر عمل کرتے تھے۔ چنانچہ رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں تمام دنیا میں یہودیوں کو

ذلت واذیت کا سامنا تھا وہ قرآن حکیم کے مطابق محض اس وجہ سے تھا کہ یہودیوں نے اللہ تبارک وتعالیٰ کے قوانین کی مسلسل خلاف ورزی کی تھی۔

(73) ایک نئے (مگر آخری) رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایسی قوم سے صرف دو باتیں کہہ سکتے تھے ایک یہ کہ تمہاری اپنی الہامی کتاب (تورات) ایک نبی آخرالزماں (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آمد کی پیش گوئی کرتی ہے (جبکہ اس دور کے یہودی اس خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بڑی بے چینی اور اشتیاق کے ساتھ انتظار بھی کر رہے تھے) دوسری بات یہ کہ تمہاری الہامی کتاب (تورات) کی بہتر طور پر حفاظت نہیں کی گئی۔ درحقیقت بدقسمتی سے تورات کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا گیا۔ تورات کو پہلے بنوخدنصر (بخت نصر) نے، پھر انطوشس، طیطوس اور دوسروں نے تباہ کیا۔ نتیجتاً تورات کا آخری نسخہ تک ناپید ہوگیا۔ اس کے کوئی ایک سو سال یا اس سے بھی زائد عرصہ بعد صرف یادداشت کے سہارے تورات کو نئے سرے سے مرتب کرنے کی کوشش کی گئی۔ جدید مغربی مفکرین کی تحقیق کے مطابق تورات کے موجودہ دستیاب متن میں ابھی تک ابہام اور آمیزش (ملاوٹ) کے ساتھ ساتھ عدم مطابقت رکھنے والی (بے جوڑ) باتیں شامل ہیں۔

(74) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے ایک اور پیغمبر (ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم) کی آمد کی پیش گوئی ان الفاظ میں کی گئی ہے:

"(اے موسیٰ) میں لازماً انہی میں سے تمہاری طرح ایک پیغمبر پیدا کروں گا اور اسے اپنا کلام عطا کروں گا اور وہ (خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم) ان سے صرف وہی بات کرے گا جس کا اُسے میری طرف سے حکم ہوگا۔"

(تورات کی کتب خمسہ میں سے کتاب پنجم 18/18)

اس کا مفہوم یہی ہے کہ یہودیت ایک سچا مذہب تھا لیکن اب وہ پرانا ہو چکا تھا اور اس کے احکامات قدرے سخت تھے۔ دوسرا یہ کہ یہودی خود منتے اور آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلیم کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کے انتظار میں تھے اور یقین رکھتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، رب تعالیٰ جل شانہٗ کی طرف سے نئے اور زیادہ نرم قوانین لے کر تشریف لائیں گے۔

عیسائیت:

(75) معلم کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عیسائیت کو بعض سنجیدہ تحفظات رکھتے ہوئے دوسرے مذاہب کے مقابلے میں ہمدردترین پایا۔ قرآن حکیم یہ تسلیم کرتا ہے کہ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کلام اللہ، روح اللہ، مسیح اور پیغمبر خدا تھے (جبکہ دنیا کے کسی بھی دوسرے مذہب نے عیسائیوں کے بارے میں ایسا تسلیم نہیں کیا)۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک باعصمت کنواری کے بطن سے بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔ آپ علیہ السلام یقیناً رب کائنات جل شانہٗ کا ایک معجزہ اور قادر مطلق جل جلالہٗ کی مطلق قدرت کا واضح اظہار تھے۔ قرآن مجید بھی تسلیم کرتا ہے کہ رب ذوالجلال نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر کتاب ''انجیل'' نازل فرمائی۔ ان تمام باتوں کے باوجود عیسائیوں کے عقیدہ تثلیث [عیسائی مذہب کے مطابق رب تعالیٰ جل شانہٗ کی وحدانیت کی تین شاخیں جن میں ایک ہی ماہیت، قدرت اور ہمیشگی ہے یعنی باپ (اللہ..... نعوذ باللہ)، بیٹا (عیسیٰ علیہ السلام ..... نعوذ باللہ) اور روح القدس (جبرئیل علیہ السلام ..... نعوذ باللہ)]اور مریم پوجا (بعض عیسائی حضرت مریم کے بت کی پوجا کرتے ہیں ..... نعوذ باللہ) کی وجہ سے سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عیسائی مذہب میں بھی بت پرستی نظر آئی۔ قرآن مجید اس بات پر سخت تنقید کرتا ہے کہ عیسائیوں نے اپنے پادریوں کو خداوند (ارباب) قرار دے دیا۔ حدیث پاک میں 'ارباب' کے لفظ کی وضاحت قانون ساز کے طور پر کی گئی ہے۔ ارشاد رب العزت ہے:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝

(التوبہ: 31)

''اپنے علماء اور مشائخ کو، خدا ٹھہرا لیا
اور عیسیٰ ابن مریم کو خدائے ماسوا
حکم تھا اُن کو، کریں وہ اک خدا کی بندگی
اور نہیں معبود (بندوں کا) سوا اُس کے کوئی

پاک ہے وہ شرک سے ان کے (بطور واقعی)''

درحقیقت کلیسا، اس کی ان گنت کونسلوں اور ان کے ممبران کی تاریخ کے پیش نظر قرآن پاک کی سرزنش جائز ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے واضح اور پُر زور الفاظ میں اعلان کیا تھا (انجیل متی 5/17-19) کہ آپ علیہ السلام تورات اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کی کتابوں (بائبل میں مذکور) کی منسوخی کیلئے نہیں آئے بلکہ آپ علیہ السلام ان کتب کے احکامات پر عمل درآمد کرانے کیلئے آئے ہیں۔ اور جو شخص بھی ان احکامات سے انحراف کرے گا یا لوگوں کو

انحراف کی ترغیب دے گا تو وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی نظروں سے گر جائے گا۔ اس کے برخلاف سینٹ پال نے اس بات کی کہ "حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد تورات کی منسوخی ہے" (رومیوں کے نام خط 10/4) نہ صرف تعلیم دی بلکہ اس سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ اس بات کی تصدیق کی کہ:

"روح القدس (حضرت جبرئیل علیہ السلام) اور ہم نے یہ مناسب خیال کیا کہ ان ضروری باتوں کے علاوہ تم پر اور بوجھ نہ ڈالیں۔ وہ یہ کہ تم بتوں کو پیش کی جانے والی قربانیوں سے اور لہو سے، اور گلا گھونٹے ہوئے جانوروں سے، اور حرام کاری سے پرہیز کرو۔ اگر تم ان چیزوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھو گے تو تم یقیناً بہتر کرو گے۔"

(رسولوں کے اعمال 15/28)

اس طرح خنزیر کے گوشت اور شراب کو حلال قرار دے دیا گیا جبکہ یوم سبت (ہفتہ...... یہودیوں کے نزدیک متبرک دن) اور ختنہ کی رسم منسوخ کر دی گئی۔ تورات کے تمام ان گنت نسخوں پر بھی پابندی لگا دی گئی۔ یہ سب کچھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کی زندگیوں ہی میں ہوا۔ بعد میں عقیدۂ تثلیث کو وجود دیا گیا۔ رب تعالیٰ جل شانہٗ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو باپ، بیٹا اور ایک ہی مادہ سے تخلیق قرار دیا گیا (نعوذ باللہ) صلیب کو مذہب کا حصہ بنا دیا گیا اور (حضرت عیسیٰ علیہ السلام و حضرت مریم کی) مورتیاں اور تصاویر تمام تر مذہبی جوش و خروش کے ساتھ متعارف کرائی گئیں اور اسی قسم کے بہت سے اور کام رواج دیئے گئے۔

(76) اس یقین کی معقول وجہ ہے کہ شافع محشر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذہن مبارک میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تصور "خاندان اسرائیل کی گمشدہ بھیڑ" کے حوالے سے تھا۔ (انجیل متی 10/6) قرآن پاک میں ارشاد ربانی ہے:

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۚ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ

(آل عمران: 48، 49)

"اور سکھائے گا کتاب و حکمت اُن کو پھر خدا
(درس خود دے گا انہیں) توریت اور انجیل (کا)
اور بنائے گا پیمبر قوم اسرائیل کا
(وہ کہیں گے) میں تمہارے پاس ہوں بھیجا گیا
آیا ہوں لے کر خدا کے پاس سے کچھ معجزے
میں پرندے کی سی اک صورت بناؤں، گارے سے
پھونک ماروں تو خدا کے حکم سے اُڑنے لگے
اندھوں کو اور کوڑھیوں کو بھی شفا دوں (پھونک سے
مُردوں کو زندہ کروں حکمِ خدا سے (سربسر)
اور بتا دوں کھا کے جو کچھ آؤ، یا رکھ آؤ گھر
اس میں تم کو ہے نشانی، لاؤ تم ایماں اگر"

آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذہن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تصور ایسے شخص کا بھی ہوسکتا تھا جو کہتا تھا کہ "بچوں کی روٹی کتوں کو ڈالنا اچھی بات نہیں" (انجیل متی 15/24/6) رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آفاقی و افلاکی اور کائناتی نظریہ کے خواہش مند تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم "دو جہانوں کی رحمت و برکت" کی آرزو رکھتے تھے۔

(77) حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے اوپر نازل ہونے والی وحیِ ربانی کو، یا تو تحریر میں نہیں لانا چاہتے تھے یا وہ اپنے پیروکاروں کو اسے تحریر کرنے کا حکم نہ دے سکے تاکہ اسے آنے والی نسلوں کیلئے محفوظ رکھا جا سکتا۔ تاہم یہ ہوا کہ انجیل کے بعض حصے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعض حواریوں کے حافظے میں رہے اور پھر جب بعد ازاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں جانشینوں یا پیروکاروں نے اپنی اپنی یادداشتیں یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سوانح حیات تحریر کی تو انہوں نے اسے انجیل کا نام دیا۔ اگرچہ 70 سے زائد انجیلوں کے بارے میں علم ہو چکا ہے تاہم کلیسا نے ان میں سے محض چار کو (بطور الہامی) قبول و منظور کیا ہے جبکہ باقی تمام کو خود ساختہ قرار دیا ہے۔ ان کئی سوانح میں تضاد کا ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ آرامی زبان میں انجیل کا اصل نسخہ ناپید ہے جبکہ اس کا یونانی ترجمہ موجود و مروج ہے۔

(78) انجیل کے "عہد نامہ جدید" (انجیل کے دو بڑے مجموعے (1) عہد نامہ عتیق (قدیم) (2) عہد نامہ جدید کہلاتے ہیں) میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تقریروں سے اقتباسات دیئے گئے ہیں۔ اگرچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تبلیغ کا عرصہ تین سال سے زیادہ کا نہیں اور وہ یہ

جانتے تھے کہ ان کا دور ختم ہونے والا ہے چنانچہ انہوں نے واضح اور برملا انداز میں کسی اور (پیغمبر یعنی محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی آمد کی پیش گوئی کی جو آ کر اُن کے ادھورے کام کی تکمیل فرمائیں گے کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام (اپنے ادھورے کام کی وجہ سے) افسردہ تھے۔ انہوں نے کہا:

"میں تم سے بالکل سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے مفاد میں ہے کیونکہ اگر میں نہیں جاؤں گا تو تمہارا مددگار تمہارے پاس نہیں آئے گا لیکن اگر میں جاؤں گا تو اُسے تمہارے پاس بھیج دوں گا اور جب وہ آئے گا تو وہ اس گناہ آلود دنیا کی سرزنش کرے گا۔ مجھے تم سے اور بہت سی باتیں کہنا ہیں لیکن اب تم انہیں برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ روحِ صداقت (صادق اکبر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم) آئے گا تو وہ تمہیں تمام تر حق اور سچائی کی رہنمائی کرے گا اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے تو کچھ بھی نہیں کہے گا بلکہ رب تعالیٰ جل شانہٗ سے سن کر تمہیں بتائے گا۔ وہ تمہیں مستقبل کی باتیں بتائے گا اور میری تعریف کرے گا"

(انجیل یوحنا: 16/7-14)

(79) پہلے حوالہ دیا جا چکا ہے کہ ہندوؤں کی کتب کے مطابق خدا کا آخری اوتار (ولی) ایک جنگجو کی صورت آئے گا۔ اس کی وجہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک مثال دے کر بیان کی ہے (انجیل متی 21/33-41، انجیل مرقس 12/1-9، انجیل لوقا 20/9-16)۔ یہاں سینٹ مرقس کے الفاظ نقل کیے جاتے ہیں:

"پھر وہ (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) لوگوں سے مثالوں کے انداز میں باتیں کرنے لگے کہ ایک شخص نے انگوروں کا باغ لگایا اور اس کے چاروں جانب باڑ لگا دی۔ انگوروں کے عرق کیلئے حوض بنایا۔ ایک برج تعمیر کیا پھر اس باغ کو ٹھیکیدار باغبانوں کے حوالے کر دیا اور خود کسی دُور کے ملک چلا گیا۔ جب پھل کا موسم آیا تو اُس نے اپنے ایک ملازم کو اپنے انگوروں کے باغ کے ٹھیکیداروں کے پاس بھیجا تا کہ وہ پھل میں

سے اس کا حصہ لے آئے مگر ٹھیکیداروں نے ملازم کو پکڑ کر خوب پیٹا اور
اُسے خالی ہاتھ واپس بھیج دیا۔ پھر اُس نے ایک اور ملازم کو بھیجا مگر
انہوں نے اسے پتھر مار کر اس کا سر زخمی کر دیا اور اُسے بے عزت کر کے
لوٹا دیا۔ پھر اُس نے ایک اور ملازم کو بھیجا تو انہوں نے اسے قتل کر دیا۔
اس نے اس کے بعد کئی ملازم بھیجے تو ٹھیکیداروں نے کچھ کو زخمی کیا اور
کچھ کو قتل کیا۔ اب اُس کے پاس صرف اُس کا اپنا پیارا بیٹا رہ گیا تھا۔
اُس نے آخرکار اپنے بیٹے کو بھی اس خیال سے اُن کے پاس بھیج دیا کہ
وہ میرے بیٹے کا ضرور خیال کریں گے مگر ان ٹھیکیدار باغبانوں نے
آپس میں مشورہ کیا کہ یہی تو اس کا اصل وارث ہے۔ آؤ اسے قتل کر
دیں تا کہ یہ تمام میراث ہماری ہو جائے۔ چنانچہ انہوں نے اُس کے
بیٹے کو قابو کر کے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا اور اس کی لاش باغ سے
باہر پھینک دی۔ پس اب انگوروں کے باغ کا مالک کیا کرے گا؟ وہ
آئے گا اور ٹھیکیداروں کو تباہ و برباد کر دے گا جبکہ انگوروں کے باغ کو
دوسروں کے حوالے کر دے گا۔"

انگوروں کے باغ کا مالک دراصل کائنات کا مالک (رب تعالیٰ جل شانہٗ) ہے۔ اُس نے جو یکے بعد دیگرے ملازم بھیجے وہ اُس کے پیغمبر (علیہم السلام) ہیں۔ جبکہ اس کا بیٹا حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں (نعوذ باللہ) اور یہ کہ حملہ آور فوج کے سپہ سالار اعظم "رسولِ حرب" (یعنی حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں۔

(80) ختم المرسلین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود مختلف مذاہب کا یہ مختصر جائزہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان میں کوئی مذہب بھی نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ذہنی و قلبی اطمینان وسکون مہیا نہیں کر سکتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں خوب سے خوب تر کی تلاش و جستجو بڑھتی جا رہی تھی۔ ان حالات میں رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کے نزول کا آغاز ہوا جس نے بتدریج اسلام کی عظیم الشان عمارت کی تکمیل کی۔

(81) لیکن واقعات کو خود اپنی کہانی سنانے دیجیے۔

باب 3

پیغام اور اس کے ضروری تقاضے

(82) جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر دوسری وحی نازل ہوئی جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس امر کا یقین دلایا گیا کہ رب تعالیٰ جل شانہٗ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھلایا نہیں بلکہ اس کے برعکس رب العزت جل شانہٗ نے ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس وقت رہنمائی فرمائی جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رہبری کی ضرورت تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ

﴿ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ﴾

(سورۃ الضحیٰ: 11)

"اور احساں اپنے رب کے تم (صلی اللہ علیہ وسلم) بیاں کرتے رہو"۔﴾

اس پر ہادیٔ کون و مکاں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنا تمام غم بھول گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یقین اور ایقان میں اضافہ ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دل و جان سے رب تعالیٰ جل جلالہٗ کے پیغام (کی تبلیغ و اشاعت) پر توجہ دی جس کی ذمہ داری آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سونپی گئی تھی۔ اگرچہ یہ پیغام بتدریج ترقی کرتے ہوئے ایک مکمل نظامِ حیات بن گیا تاہم اس کا بنیادی مفہوم کبھی بھی تبدیل نہ ہوا مطلب یہ کہ **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ** یعنی رب تعالیٰ جل شانہٗ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تبارک و تعالیٰ کے رسول ہیں۔

(83) اس کا مختصر مطلب و مفہوم یہ ہوا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات پاک قانون ساز ہے جبکہ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم تمام دنیا کو خاص طور پر انسانوں کو اللہ جل شانہٗ کے احکامات (قوانین) پہنچانے کیلئے بھیجے گئے ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ صرف اور صرف ایک ہیں۔ اللہ جل شانہٗ ہی ہماری پرورش فرماتے ہیں۔ اللہ جل جلالہٗ کے حکم ہی سے موت آتی ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہی ہماری دنیاوی زندگی کا حساب لیں گے اور پھر جس طرح اللہ جل جلالہٗ چاہیں گے سزا یا جزا دیں گے۔ انسان رب تعالیٰ جل شانہٗ کی مخلوق ہے چنانچہ انسان پر لازم ہے کہ وہ زندگی کے

تمام شعبوں میں اپنے پیدا کرنے والے رب تعالیٰ جل شانہٗ کے احکامات کی پابندی کرے چاہے وہ مسلک وعقیدہ کا معاملہ ہو، معاشرتی رویہ ہو یا کچھ اور ہو۔ اگر انسان ایسا نہیں کرتا تو رب تعالیٰ جل شانہٗ مختارِ کل (مکمل اور قطعی اختیار و طاقت والے) ہیں اور رب ذوالجلال ہمیں موت کے بعد دوبارہ زندہ کر کے سزا دینے پر قدرت رکھتے ہیں۔

(84) اللہ تبارک وتعالیٰ پر ایمان اور یوم آخرت پر ایمان دو ایسے مدار ومحور ہیں جن کے گرد دین محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم گردش کرتا ہے۔ رب تعالیٰ جل شانہٗ کی ذات پاک وجود لازم یعنی ہر حالت میں اور ہر جگہ موجود ہے۔ وہ غیر مرئی (مادے کی صورت نظر نہ آنے والی) ہے اور انسانی عقل وفہم رب تعالیٰ جل شانہٗ کی ذات کو سمجھنے سے قاصر وعاجز ہے چنانچہ ایسی ذات پاک کا پیغام پہنچانے اور اس کی مرضی سے آگاہ وآشنا کرنے کے لیے کسی ایلچی، قاصد یا رسول کے انتخاب وتقرر کی اشد ضرورت تھی اور کسی کی اس کے احکامات کی جان بوجھ کر نافرمانی کو روکنے کیلئے سزا بھی ضروری تھی۔

(85) رب کائنات جل جلالہٗ پر یقین رکھنے والا ہر مومن کسی بحث یا ہچکچاہٹ کے بغیر اس بات پر رضامند ہے کہ ہمیں اپنے خالق ومالک کے احکامات پر عمل کرنا چاہیے مگر مشکل امر یہ ہے کہ رب تعالیٰ جل شانہٗ کی مرضی یا حکم کیسے معلوم کیا جائے کیونکہ رب تعالیٰ جل جلالہٗ کی ذات تو غیر مرئی اور انسانی عقل وفہم کے احاطے میں نہ آسکنے والی ہے۔ تمام لوگ اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ جب تک اللہ تبارک وتعالیٰ ہم پر اپنے احکامات خود واضح نہ فرما دیں انسان کے لیے ان احکامات کو جاننا ممکن نہیں۔ عملی طور پر تمام مذاہب اس بات پر متفق دکھائی دیتے ہیں کہ دوسرے تمام حیوانات کے لیے ان کی جبلت (خلقی، پیدائشی، قدرتی سرشت یا فطرت) ہی کافی ہے مگر حیوانِ ناطق (عقل رکھنے والا اور دوسروں کو لاجواب کر دینے والا جاندار یعنی انسان) کے لیے محض جبلت ہی کافی نہیں کیونکہ وہ مشینی انداز سے عمل نہیں کرتا بلکہ اپنی عقل وفہم کی روشنی میں دلیل سے کام لیتا ہے یہی وجہ ہے کہ مختلف معاملات میں مختلف انسانوں کا ردعمل مختلف ہوتا ہے۔ انسان صرف اسی بات سے اتفاق کرتا ہے جس کا وہ کسی دلیل سے قائل ہوتا ہے چاہے وہ دلیل اس کی اپنی ہو یا کسی دوسرے انسان کی ہو۔ انسان اگر انتہائی سخت تعصب (بے جا حمایت، مذہب یا نسل یا وطن ایک ہونے کی وجہ سے کسی کی طرف داری) میں مبتلا نہ ہو تو وہ ٹھوس دلیل کے بعد اپنا سابقہ فیصلہ بھی تبدیل کر دیتا ہے۔ اپنے بااعتماد خیر خواہ دوستوں کی رائے کو ترجیح بھی دیتا ہے۔ بچہ (پہلے) ماں کی فرمانبرداری کرتا ہے۔ پھر مختلف وجوہات کی بناء پر یہ فرمانبرداری

ماں سے باپ کی طرف منتقل ہوتی ہے۔ باپ کے بعد وہ اپنے استاد کا اور استاد کے بعد حکمران کا اوراس کے بعد روحانی رہبر و رہنما کی فرمانبرداری کرتا ہے۔ اس کے پس منظر میں سزا و جزا کا تصور ہی ہوتا ہے۔ جب والدہ کسی نافرمان بچے کو ٹھیک کرنے میں کامیاب نہیں ہو پاتی تو والد سامنے آتا ہے۔ پھر مدرسہ کا استاد اور یوں یہ سلسلہ چلتے چلتے ملک کے حکمران تک جا پہنچتا ہے جسے زندگی یا موت کا اختیار (اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے) ہوتا ہے مگر یہ سزا و جزا محض بیرونی دنیا کے ظاہری اعمال پر ہوتی ہے۔ روحانی رہبر و رہنما اس کی اندر کی دنیا یعنی روح کی اصلاح کرتا ہے اور اُس کے من میں رب تعالیٰ جل شانہٗ کا خوف بیدار کرتا ہے۔ وہ اللہ تبارک وتعالیٰ جو موت کے بعد دوبارہ زندگی عطا کرنے کی قدرت رکھتے ہیں اور یوں دوسری زندگی میں اُسے نافرمانی کی سزا دے سکتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا خوف محض اُن کے انتہائی درست انصاف کی وجہ سے ہوتا ہے کیونکہ رب رحمٰن ورحیم اگر محض عدل وانصاف ہی سے کام لیں تو کوئی بھی نہیں بچ سکتا۔ (جیسا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا "حتیٰ کہ میں بھی جب تک کہ رب کریم و رحیم کی بخشش مجھے ڈھانپ نہ لے۔") اور سب سے بڑے روحانی رہبر و رہنما رب تعالیٰ جل شانہٗ کے محبوب پیغمبر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خود ہیں۔

(86) اس امر پر سب متفق دکھائی دیتے ہیں کہ رب العزت اپنے پیغام کے نزول اور تبلیغ و ترسیل کے لیے روحانی حوالے سے انتہائی اعلیٰ وارفع شخصیت کا انتخاب فرماتے ہیں تاہم رب تعالیٰ جل شانہٗ اور پیغمبر کے مابین تعلقات کو مختلف انداز میں بیان کیا جاتا رہا ہے۔ بعض مذاہب جس میں زرتشت مت اور ہندو مت شامل ہیں پیغمبر کو رب تعالیٰ جل شانہٗ کی مجسم شکل قرار دیتے ہیں (نعوذ باللہ) یعنی اُن کے مطابق رب تعالیٰ جل شانہٗ اس پیغمبر میں حلول کیے ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ رب تعالیٰ جل شانہٗ انسانی گوشت پوست والے انسانی جسم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں (نعوذ باللہ) برہمن ہندو اسے "اوتار" کا نام دیتے ہیں [یعنی جو اوپر سے نازل ہوتا ہے اور رب تعالیٰ جل شانہٗ اُس کے وجود میں بسیرا کیے ہوتے ہیں (نعوذ باللہ)]۔ عیسائیوں کے کچھ فرقے (مثلاً مونوفیسائیٹ) پیغمبر کو (بغیر کسی واسطے کے) صرف خدا ہی کہہ کر پکارتے ہیں (یعنی وہ خدا تعالیٰ کا پیغمبر نہیں ہوتا بلکہ خدا تعالیٰ خود ہوتا ہے۔ نعوذ باللہ) مسئلہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ جل شانہٗ کے یہ "اوتار" (جو انسانی روپ میں خدا مانے جاتے ہیں نعوذ باللہ) بھی دوسرے انسانوں کی طرح زندگی گزارتے ہیں۔ دوسرے انسانوں کی طرح کھاتے، پیتے، سوتے، جاگتے اور بیمار ہوتے ہیں اور دوسرے انسانوں ہی کی طرح انہیں بھی موت آتی ہے جبکہ بعض

اوقات وہ شہید کر دیئے جاتے ہیں۔ ''خدا'' اس قدر بے بس ہو کہ (عام انسانوں کی طرح) اُسے موت آ جائے دلیل اور عقل سلیم اسے تسلیم کرنے سے قاصر ہے۔ تاہم یہ ہو سکتا ہے کہ قرب الٰہی کا کوئی خواہش مند شخص اپنی ذات کی نفی کر کے رب تعالیٰ کے فضل و کرم سے فنا فی اللہ ہو جائے لیکن رب تعالیٰ جل شانہٗ کے پیغمبر کا مرتبہ پانا عظیم تر امر ہے جو انتہائی محدود ہے (یعنی ہر کوئی اسے حاصل نہیں کر سکتا) ہر ولی، ''فنا فی اللہ'' تو ہو سکتا ہے لیکن ہر ''فنا فی اللہ'' پیغمبر نہیں بن سکتا۔ چنانچہ دوسرے مذاہب میں رب تعالیٰ جل شانہٗ کی اس منتخب شخصیت کو ''نبی'' (رب تعالیٰ جل جلالہٗ کی طرف سے بندوں کا ہادی، جو خود صاحب شریعت نہ ہو۔ یاد رہے کہ ہر رسول نبی بھی ہوتا ہے مگر ہر نبی رسول نہیں ہوتا) کہا جاتا ہے۔

(87) اسلامی اور یہودی نظریات میں ''نبی'' کے بارے میں کچھ اختلاف ہے۔

(88) ''انجیل'' کے ''عہد نامہ قدیم'' میں مختلف جگہوں پر لفظ ''نبی'' کا استعمال ایسے غیر محتاط طریقہ سے کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا حیران و پریشان ہو جاتا ہے مثلاً خداوند نے بادشاہ ''ابی ملک'' کو خواب میں حکم دیا کہ ''(حضرت) ابراہیم (علیہ السلام) نبی ہیں ان کی بیوی انہیں واپس کر دو تو وہ تیرے حق میں دعا فرمائیں گے۔'' (پیدائش 20/7) ''خداوند نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے کہا: یاد رکھو کہ میں نے تجھے فرعون کے لیے گویا خدا بنایا ہے اور تیرا بھائی (حضرت) ہارون (علیہ السلام) تیرا نبی ہوگا۔'' (خروج 7/1) ''اور (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) نے قوم کے عمر رسیدہ لوگوں میں سے ستر (70) افراد جمع کر کے ان کو خیمہ کے اردگرد کھڑا کر دیا۔ پھر خداوند بادل میں ہو کر اُترا اور اُس نے (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) سے گفتگو کی اور اُن 70 بزرگوں میں (خداوند سے) روح لے کر ڈالی گئی تو وہ نبوت کرنے لگے اور اس (عمل) سے رُکے نہیں لیکن ان میں سے دو شخص ''اِلداد'' اور ''کامیداد'' ایسے تھے جو لشکر گاہ میں رہ گئے اور وہیں ہی نبوت کرنے لگے .... اور یشوع (یوشع) نے کہا: اے میرے مالک موسیٰ (علیہ السلام)! ان کو روک دے۔ (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا: کیا تُو رشک کرتا ہے؟ کاش خداوند کے سب لوگ نبی ہوتے اور خداوند ان سب میں اپنی روح ڈال (کر انہیں نبی بنا) دیتا۔'' (نمبرز (گنتی) 11/24-29 آف ابن حنبل، شاکر ایڈیشن نمبر 2546، 2692) (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) نے اسرائیلیوں کو بتایا: ''اور خدا نے مجھ سے کہا: .... میں ان (اسرائیلیوں) میں سے تمہاری طرح کا ایک نبی پیدا کروں گا اور اُس کو اپنے کلام سے نوازوں گا'' (باب استثنا 18/17-18) ''............ اور اس وقت سے اب تک اسرائیلیوں میں

(حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) کی طرح کا نبی پیدا نہیں ہوا" (باب استثنا 34/10) "اور تمام اسرائیلیوں کو علم ہو گیا کہ "سموئیل" خدا کا نبی مقرر ہوا ہے"۔ (I سموئیل 3/20) "...........کیونکہ جس کو اب نبی کہتے ہیں اس کو پہلے غیب دان (مستقبل کی باتیں بتانے والا) کہتے تھے۔" (I سموئیل 9/9) ایک غیر ملکی حملہ کے وقت "نبی" سموئیل نے ایک شخص ساؤل ابن قیس کو بادشاہ منتخب کر لیا اور اسے کسی جگہ جانے کا حکم دیا..........."اور اس کے بعد تم خدا کی پہاڑی پر پہنچو گے جہاں فلسطیوں (ایک یہودی مخالف قدیم فلسطینی نسل) کا حفاظتی دفاعی قلعہ ہے اور جب تم شہر میں پہنچو گے تو تمہیں "نبیوں" کا ایک گروہ ملے گا جو بلند مقام سے اُترا ہو گا۔ اور ان کے آگے (1) ستار، (2) دف (ایک چوتھائی حلقہ جس کا منہ ایک طرف کھال سے منڈھا ہوتا ہے اور ہاتھ سے بجایا جاتا ہے)، (3) بانسری اور (4) بربط (یہ چاروں آلات موسیقی ہیں) ہوں گے اور اس گروہ کے سب لوگ نبوت کرتے ہوں گے۔ اس وقت خداوند کی روح تم پر پوری توانائی کے ساتھ نازل ہو گی اور تم بھی اُن لوگوں کے ساتھ نبوت کرنے لگو گے اور تبدیل ہو کر (اور طرح کے) آدمی ہو جاؤ گے (I سموئیل 6-10/5، 11-10) "........... اور (حضرت) داؤد (علیہ السلام) بھاگے اور اس رات بچ گئے جبکہ ساؤل نے (حضرت) داؤد (علیہ السلام) کے گھر پر قاصد بھی روانہ کیے تاکہ اُن کی تاک میں رہیں اور صبح کے وقت انہیں قتل کر دیں...........اور (حضرت) داؤد (علیہ السلام) "رامہ" (ایک مقام) میں سموئیل کے پاس پہنچے اور جب ساؤل بتایا گیا کہ (حضرت) داؤد (علیہ السلام) "رامہ" میں موجود ہیں تو ساؤل نے (حضرت) داؤد (علیہ السلام) کو پکڑنے کے لیے آدمی بھیجے جنہوں نے دیکھا کہ نبیوں کا گروہ نبوت کر رہا ہے اور سموئیل ان کا رہبر و رہنما بنا کھڑا ہے تو خدا کی روح ساؤل کے آدمیوں پر نازل ہوئی اور یوں وہ بھی نبوت کرنے لگے۔ جب ساؤل کو یہ بات بتائی گئی تو اُس نے اور آدمی بھیجے تو وہ بھی نبوت کرنے لگے۔ ساؤل نے تیسری مرتبہ اور آدمی بھیجے تو وہ بھی نبوت کرنے لگے۔ (اس صورت حال میں) اب ساؤل خود "رامہ" کی طرف گیا...........تو خدا کی روح اس پر بھی نازل ہوئی اور وہ نبوت کرتا ہوا "رامہ" کے (علاقہ) "نیوت" پہنچا۔ اُس نے بھی اپنے کپڑے اُتارے اور وہ بھی اسی طرح سموئیل کے سامنے نبوت کرنے لگا۔ وہ تمام دن اور تمام رات بغیر کپڑوں کے لیٹا رہا۔ اس وجہ سے یہ کہاوت چلی: "کیا ساؤل بھی نبیوں میں سے ہے۔"

(I سموئیل 24-19/10) ایک بوڑھے نبی نے خدا کی نافرمانی کی تو اسے شیر نے

ہلاک کر ڈالا (I سلاطین 13/11-24) بت پرست بادشاہ ''احب'' نبی ''ایلیاہ'' کو قتل کرنے کے لیے اس کی تلاش میں تھا کہ ایلیاہ اتفاقاً شاہی محل کے گورنر کے پاس پہنچا اور اُسے کہا کہ وہ بادشاہ کو میرے (ایلیاہ) بارے میں اطلاع کرے۔ شاہی محل کا گورنر ایک رحمدل شخص تھا وہ ایسا کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہا تھا۔ اُس نے کہا: کیا میرے مالک (بادشاہ) کو یہ خبر نہیں دی گئی کہ جب ایزبل نے خداوند کے نبیوں کو قتل کیا تھا تو میں نے خداوند کے نبیوں میں سے پچاس، پچاس کے گروپ کی صورت میں 100 نبیوں کو ایک غار میں چھپایا اور انہیں خوراک مہیا کرتا رہا؟ (ایلیاہ اپنی بات پر اصرار کرتا ہے۔ اتنے میں بادشاہ آ جاتا ہے اور ایلیاہ اسے حکم دیتا ہے)...... اس لیے اب تم اپنے آدمی بھیج کر تمام اسرائیل کو، بعل کے 450 نبیوں کو اور ایزبل کے دسترخوان پر کھانا کھانے والے 400 نبیوں کو ''کرمل'' کے پہاڑ پر جمع کرو'' (I سلاطین 18/13-19)۔ ''مزید یہ کہ (حضرت) داؤد (علیہ السلام) اور لشکر کے سرداروں نے ''آصف''، ''ہمان'' اور ''یدوتون'' کی اولاد میں سے بعض کو خدمت کے لیے علیحدہ کیا تا کہ وہ بربط (ایک باجے کا نام)، ستار (ایک مشہور باجا) اور جھانجھ (پیتل کی دو ابھری ہوئی تشتریاں جن میں سوراخ کر کے ڈورا ڈالتے ہیں اور دونوں ہاتھوں میں لے کر انہیں ڈھول کے ساتھ بجاتے ہیں) سے نبوت کریں (I تواریخ 25/1)۔ ''پادری اور نبی بھی نشے میں مست اور شراب میں مدہوش ہیں۔ وہ خوابوں میں خطا کرتے ہیں اور فیصلہ کرنے میں غلطی کرتے ہیں'' (یسعیاہ 28/7) ''............ نبیوں نے بعل کے نام سے نبوت کی اور بے فائدہ چیزوں کے پیروکار رہے'' (یرمیاہ 2/8) ''............ نبی جھوٹی نبوت کرتے ہیں اور پادری اُن کے بل بوتے پر حکومت کرتے ہیں اور لوگ اس صورت حال کو پسند کرتے ہیں۔ تم آخر میں کیا کرو گے؟'' (یرمیاہ 5/31) نبی یرمیاہ کہتا ہے ''پھر خداوند نے مجھے بتایا کہ نبی میرا نام لے کر جھوٹی نبوت کرتے ہیں۔ میں نے ان کو نہ تو بھیجا اور نہ ہی انہیں کوئی حکم دیا اور نہ ہی ان سے گفتگو کی۔ وہ جھوٹے خواب اور جھوٹا علم غیب بیان کرتے ہیں ....'' (یرمیاہ 14/14) ''اور ایک نبی ہی کی وجہ سے خداوند نے اسرائیل کو مصر سے نکال کر اس کی حفاظت کی'' (ہوسیع 12/13) نبی عاموس نے کہا'' .... میں نہ تو نبی ہوں اور نہ ہی کسی نبی کا بیٹا ہوں بلکہ میں تو چرواہا اور گولر (انجیر کی طرح لمبا مصری درخت) کا پھل اکٹھا کرنے والا ہوں'' (عاموس 7/14) ''اور اے لڑکے (یعنی یوحنا)! تو خداوند کا نبی کہلائے گا'' (لوقا 1/76) ''............ یسوع ناصری کا تذکرہ جو کہ ایک نبی تھا'' (لوقا 24/19)۔

(89) قاری کیلئے یہ فیصلہ کرنا ناممکن ہے کہ انجیل کی رُو سے دراصل ''نبی'' کسے کہتے ہیں۔۔ انجیل کے مطابق (حضرت) ابراہیم (علیہ السلام)، (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام)، جان بپٹسٹ (حضرت یحییٰ علیہ السلام یا یوحنا اصطباغی ...... [بپٹسٹ یا اصطباغی اُسے کہتے ہیں جو کسی فرد کے سر پر رنگین پانی چھڑکنے کی رسم ادا کر کے اپنے مذہب میں داخل کرتا ہے] اور (حضرت) عیسیٰ (علیہ السلام) نبی ہیں اور (ساتھ ہی) وہ بھی نبی ہیں جو جھوٹ بولتے ہیں (یعنی ''جھوٹی نبوت کرتے ہیں'') اور وہ بھی نبی ہیں جو خود تسلیم کرتے ہیں کہ ''میں نبی نہیں ہوں۔''

(90) قرآن مجید کی رُو سے نبی اپنے وقت کا سب سے زیادہ پرہیزگار اور رب تعالیٰ جل شانہٗ کا سب سے زیادہ اطاعت گزار بندہ ہوتا ہے۔ رب تعالیٰ جل جلالہٗ اپنے فرشتے کے ذریعے یا براہ راست اس کے دل میں اپنا پیغام ڈال دیتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے ان پیغامات کو اکثر اوقات اکٹھا کر کے ایک قانونی ضابطہ کی صورت دے دی جاتی ہے۔ نبی کے ذریعے بعض اوقات گزشتہ الہامی کتاب منسوخ کردی جاتی ہے اور نئی کتاب اس کی جگہ لے لیتی ہے جبکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی نبی اپنے سے پہلے نبی پر نازل ہونے والی کتاب پر ہی عمل جاری رکھتا ہے۔ قدرتاً صاحب کتاب نبی اُس نبی سے افضل ہوتا ہے جس پر کتاب نہیں اُتاری جاتی تاہم رب تعالیٰ جل شانہٗ کے پیغام بر کی حیثیت سے تمام نبیوں کا رتبہ و مرتبہ برابر ہے۔ قرآن حکیم ''نبی'' کیلئے مختلف متبادل و مترادف الفاظ استعمال کرتا ہے۔ ان میں نبی (پیغام بر)، رسول (قاصد)، مُرسل (ایلچی)، بشیر اور مبشر (خوشخبری اور بشارت دینے والا)، نذیر اور منذر (ڈرانے والا) اور ہادی (رہبر و رہنما) شامل ہیں۔ قرآن حکیم میں بیان کئے گئے ان خطابات کو (حضرت) آدم (علیہ السلام) سے لے کر (ختم المرسلین) حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک ہر نبی کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

(91) قرآن مجید اور حدیث پاک دونوں کے مطابق حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اللہ تبارک وتعالیٰ کے آخری نبی ہیں۔ (قرآن پاک میں ارشاد رب العزت ہے:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ
رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ
شَيْءٍ عَلِيْمًا.

(الاحزاب:40)

”اور تمہارے مَردوں میں (لوگو) محمدؐ (بالیقیں)
باپ تو (اس شہرِ مکہ میں) کسی کے ہیں نہیں
بلکہ ہیں پیغمبرِ رب، اور مُہر انبیاء
اور ہے اللہ سب چیزوں کو (بہتر) جانتا“

(اسی طرح حدیث پاک میں ہے: انا خاتم النبیین، لا نبی بعدی میں آخری نبی ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں)

یومِ حساب پر ایمان:

(92) نفسیاتی اعتبار سے یومِ حساب پر ایمان انسان کو نیکی پر مائل کرنے اور بُرائی سے دُور رہنے پر قائل کرنے کا موثر ترین ذریعہ ہے۔ اس دنیا میں ایسے (نیک سیرت) فرشتہ صفت انسان بھی موجود ہیں جو اپنے فرائض انتہائی دیانت دارانہ طور پر ادا کرتے ہیں اور اس کے لیے انہیں کسی (انعام کے) وعدے یا (سزا سے) ڈراوے کی ضرورت نہیں ہوتی مگر ایسے افراد کی تعداد بہت کم ہے۔ ایسے شیطان صفت (بدکردار) افراد بھی ہیں جو تمام تر نگرانی اور سختی کے ہوتے ہوئے بھی معاشرے میں بگاڑ پیدا کرتے ہیں اور قواعد وضوابط پر عمل نہیں کرتے مگر ایسے افراد کی تعداد بھی بہت کم ہے۔ قابل ذکر اکثریت ایسے افراد کی ہے جن کی نگرانی (اعمال پر نظر) کی جائے تو وہ بالکل صحیح کام کرتے ہیں۔ کسی انعام کا وعدہ یا سزا کا ڈراوا بھی ان کے اعمال پر کچھ حد تک اثر انداز ہوتا ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے دنیا کے تمام مذاہب اور تمام قواعد وضوابط وجود میں آئے ہیں۔ اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ مادی سزا کا تصور فائدہ مند ثابت ہوتا ہے مگر بُرائی کی ترغیب اُس وقت زیادہ مؤثر ثابت ہوتی ہے جب کوئی شخص یہ سمجھے کہ وہ پکڑا نہیں جا سکتا (یعنی اس کے بُرے اعمال کے خفیہ راز کسی پر ظاہر نہیں ہو سکتے) یا یہ کہ وہ اس قدر طاقتور (صاحب حیثیت) ہے کہ اُسے دنیا کی کسی عدالت سے سزا نہیں دی جا سکتی (مثلاً کسی ملک کا حکمران)۔ قیامت کے روز (اعمال کے) حساب کتاب کی حقیقت دنیا کے طاقتور ترین حکمران کے لیے بھی (بُرے اعمال سے) رکاوٹ بن سکتی ہے مگر شرط یہ ہے کہ وہ اس (یوم حساب) پر کامل ایمان بھی رکھتا ہو۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح کوئی فرد از خود (کسی کے بیرونی دباؤ کے بغیر) نماز ادا کرتا ہے جبکہ اسے کوئی (دنیاوی شخص) حکم دینے والا بھی نہیں ہوتا یا کوئی فرد وزارت خزانہ کی طرف سے غلطی (کسی اہلکار یا مشین کی نادانستہ غلطی سے ٹیکس کم لگ جانا) کے باوجود پورا پورا ٹیکس ادا کرتا ہے۔ اسلام دونوں طرح کے خوف اور ڈراوے سے کام لیتا

ہے۔ پولیس (سزا دینے والے) بھی موجود ہے اور اس کے ساتھ ہی انسان کے دل میں یہ خوف بھی بیدار کیا جاتا ہے کہ اُسے یومِ حساب رب تعالیٰ جل شانہٗ کے روبرو پیش ہونا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ جسمانی اور روحانی (دونوں قسم کی) سزا و جزا کا دوہرا خوف، صرف روحانی یا صرف مادی سزا کے خوف (یعنی محض ایک سزا) کی نسبت زیادہ مؤثر ثابت ہوگا۔ یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ روحانی سزا پر ایمان، مادی سزا کے تصور سے زیادہ مؤثر ہوتا ہے اور جب جسمانی طور پر (اعمال کی) نگرانی ممکن ہی نہ ہو تو روحانی سزا کا ڈراوا ہی انسان کو بُرائی سے روکنے کا واحد ذریعہ رہ جاتا ہے (مثلاً) خاص طور کسی نبی کے ابتدائی دور میں جب اُسے تبلیغ کے مشن میں پوری آبادی کے نظریات و خیالات کی مخالفت کرنا ہوتی ہے۔ پھر یہ کوئی حیرت والی بات نہیں کہ قرآن حکیم کی ابتدائی سورتوں میں حیات بعد از ممات (موت)، یومِ حساب اور یومِ قیامت کے حوالے کثرت کے ساتھ ہیں۔

صلوٰۃ یا رب تعالیٰ جل شانہٗ کی پرستش کا طریقہ:

(93) کسی حکم کی بجا آوری (عمل پر آمادہ کرنے) کے لیے رواج یقین بخش (یقین دلانے والا) مبلغ ثابت ہوتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ (حضرت) جبرائیل (علیہ السلام) نے نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو سب سے پہلے وضو اور نماز بتائی (یعنی رب تعالیٰ جل شانہٗ کی پرستش کا طریقہ خود عمل کر کے دکھایا) چنانچہ معلم کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم لوگوں سے پوچھ سکتے تھے کہ ''اگر چہ تم لوگ دن اور رات کے 24 گھنٹے اپنی ذات کے لیے کام یا آرام میں گزارتے ہو مگر اپنے خالق و مالک جل جلالہٗ کی اطاعت و بندگی اور شکر و شکریہ کے لیے کتنا وقت صرف کرتے ہو؟'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے قوم سے کسی (مذہبی) فریضہ کی ادائیگی کا مطالبہ کرنے سے پہلے ذاتی مثال پیش کی۔ ہر مذہب حتیٰ کہ بُت پرستی میں بھی عبادت و پرستش کا ایک طریق کار ہوتا ہے۔ آیئے ایک لحہ کا وقفہ لے کر فکر کریں کہ اسلامی نظام عبادت (عبادہ) کی کیا خصوصیات ہیں!

(94) ہادیٔ کون و مکاں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے وضو کو نصف ایمان قرار دیا ہے اور اس کی جامع وجہ ہے۔ دین اسلام انسان کی دنیاوی زندگی کے ساتھ ساتھ اُخروی زندگی میں بھی بھلائی کا خواہش مند ہے۔ چنانچہ اسلام کو اپنے پیروکاروں کو ایسی باتیں ضرور بتانا چاہئیں کہ جن سے ان کے جسم اور روح دونوں کو فائدہ پہنچے۔ بظاہر دنیاوی بات میں بھی اُخروی بہتری کا پہلو ضرور ہونا چاہیے اور بظاہر دینی کام دنیاوی فائدے کا بھی حامل ہونا چاہیے۔ وضو کا

مقصد انسان کے جسم اور لباس کی پاکیزگی ہے جس کی طبی اور معاشرتی اہمیت اتنی واضح ہے کہ اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں لیکن وضو کی علامتی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ وضو میں انسان پہلے جسم کے چھپے ہوئے حصوں کی طہارت (پانی وغیرہ سے دھو کر پاک کرنا) کرتا ہے۔ پھر ہاتھ دھوتا ہے، کلّی (کر کے زبان، دانت اور منہ صاف) کرتا ہے، ناک صاف کرتا ہے، چہرہ دھوتا ہے اور پھر بازو، سر، کان اور پاؤں کی طہارت کرتا ہے۔ ہمارے یہ اعضاء ہمارے گناہوں اور جرائم کا ذریعہ ہیں۔ لکھنا، بولنا، سونگھنا، اپنے چہرے (یعنی اپنی موجودگی) سے کسی پر ناجائز دباؤ ڈالنا، مارنا پیٹنا، غور وفکر کرنا، سننا اور غیر قانونی آمدورفت وغیرہ ایسے بڑے بڑے کام ہیں جنہیں ہم اپنے ان اعضاء کے ذریعے کرتے ہیں۔ ان اعضاء کو دھونے کا مطلب سابقہ غلطیوں کی معذرت (معافی) اور رب رحمٰن ورحیم کے فضل وکرم سے مستقبل میں ایسی غلطیوں کو نہ کرنے کا (عزم بالجزم) یعنی عزم مصمم (پختہ ارادہ) ہے۔ اگر یہ معذرت خواہانہ عزم مصمم نصف ایمان ہے تو باقی نصف ایمان اس عزم مصمم پر مستقل مزاجی کے ساتھ عمل کرنے اور ماضی کی غلطیوں سے اب تک پہنچنے والے نقصان کی ممکن حد تک تلافی ہے۔

(95) پارسی آگ کی پرستش کرتے ہیں جبکہ ہندوؤں کا یہی رویہ گائے کے حوالے سے ہے۔ وہ ظاہری طور پر اس طرح بالواسطہ خدا کی تعریف کرنا چاہتے ہیں۔ ایک فنکار کو خوشی ہوتی ہے جب اُسے یہ کہا جائے کہ وہ اپنے فن میں ماہر ہے اور اس وقت بھی اسے اتنی ہی خوشی ہوتی ہے جب اس کی اپنی تعریف نہ کی جائے بلکہ اس کے فن پارے کے بارے میں کہا جائے کہ ''کس قدر عمدہ تصویر ہے!'' آگ خدا کی ناقابل مزاحمت طاقت کا جبکہ گائے اُس کی مہربانی کا عظیم ترین اظہار ہے۔ بدھ مت میں عبادت کی صورت یہ ہے کہ مراقبہ میں کھڑے رہو جبکہ یہودی خدا تعالیٰ کے کلام 'تورات' کی تلاوت کرتے ہیں جو اس حقیقت کی علامت ہے کہ رب تعالیٰ جل شانہٗ ہر جگہ موجود ہیں (اور ہمیں دیکھ رہے ہیں) لیکن ہم اندھے ہیں اور (اللہ تبارک و تعالیٰ کو) نہیں دیکھ سکتے (یعنی ایسی آنکھیں نہیں رکھتے جو اللہ جل جلالہٗ کو دیکھ سکیں) تاہم اللہ تبارک وتعالیٰ تک پہنچنے کی خواہش ضرور رکھتے ہیں۔ (یہ حقیقت ہے کہ) کسی اندھے کی صرف الفاظ کے ذریعے (بھی) رہنمائی کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے کلام (قرآن مجید) کی پیروی ہمیں صاحب کلام (اللہ جل شانہٗ) تک پہنچا سکتی ہے۔ زیادہ جدید استعارہ (کسی ایک چیز کو خاصیت کی بنیاد پر کسی دوسری چیز کے مساوی قرار دینا) یہ ہے کہ خدا تعالیٰ ماورا (عقل وفہم سے بالاتر) ہستی ہے۔ چنانچہ رب تعالیٰ جل جلالہٗ کا کلام بھی آواز اور زبان کی قید

سے آزاد ہے۔ اگر ہم کلام اللہ (قرآن حکیم) کو موجودہ دور میں بجلی کی رَو (کرنٹ) تصور کر لیں جو غیر مرئی اور بے رنگ بھی ہے لیکن وہ بلب کو روشن کرتی ہے اور ویسا ہی رنگ اختیار کر لیتی ہے جس رنگ کا بلب ہوتا ہے۔ بلب رب تعالیٰ جل شانہٗ کے نبی ہیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ کا کلام ان نبیوں کے رنگ (یعنی ان کی زبان) میں نازل ہوتا ہے۔ اگر کوئی بجلی کی رَو (کرنٹ) کے راستے (بلب سے منسلک تار کے ذریعے آخر تک) سفر کرے تو وہ یقینی طور پر جنریٹر تک پہنچ جائے گا جہاں سے یہ کرنٹ پیدا ہوتا ہے۔ آرتھوڈاکس (قدامت پسند یعنی پرانے خیالات کی تقلید کرنے والے) اور کیتھولک (بے تعصب اور فراخ دل) عیسائیوں نے کلام اللہ کی تلاوت کا یہودی طریقہ اختیار کر لیا ہے اور اس پر "ہم مشربی" کا اضافہ کیا ہے یعنی وہ عبادت کے وقت معمولی خوراک اور شراب نوشی کرتے ہیں۔ یہ رسم مسیح (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کے آخری عشائیہ کی یاد میں ادا کی جاتی ہے جس سے عیسائیوں کا مطلب مسیح کی ذات میں سمو جانا ہے۔ (وہ مسیح کو خدا کہتے ہیں)۔

(96) قرآن الحکیم اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز رب تعالیٰ جل شانہٗ کی حمد کرتی ہے جس میں پہاڑ، درخت، جانور، پرندے اور پانی وغیرہ بھی شامل ہیں۔ ارشاد رب العزت ہے:

I. تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۚ
وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۚ
اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا

(بنی اسرائیل:44)

"ہفت افلاک و زمیں ہیں سبحہ خوانِ کبریا جل جلالہٗ
اور جو کچھ اُن میں ہے (مخلوق چھوٹی یا بڑی)
(اُس کی ہی تسبیح اور تقدیس میں ہیں ہر گھڑی)
اور نہیں ہے ایک کوئی چیز بھی ایسی (یہاں)
جو نہ ہو (حمد و ثنا) کے ساتھ اس کی سبحہ خواں
اُن کی یہ تسبیح لیکن تم سمجھ سکتے نہیں
بُردبار اور بخشنے والا وہی ہے بالیقیں"

II. اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ
(الحج:18)

"(اے مخاطب) کیا نہیں اس بات کو تُو دیکھتا
ہے زمین اور آسمانوں میں جو (مخلوقِ خدا
اور سورج، چاند، تارے، کوہ، پیڑ اور جانور
سرنگوں ہیں سب خدا کے آگے (ماتھا ٹیک کر)
اور بہت سے آدمی بھی (سجدہ کرتے ہیں اُسے)"

III. اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّیْرُ صٰٓفّٰتٍ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِیْحَهٗ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ بِمَا یَفْعَلُوْنَ
(النور:41)

"(اے مخاطب) کیا نظر اس بات پر تُو نے نہ کی؟
ہے زمین و آسماں میں جتنی مخلوقات بھی
سب کے سب مشغول ہیں، تسبیح میں اللہ کی
اور پَر پھیلا کے اُڑنے والے یہ طائر (سبھی)
جانتے ہیں اک طریقہ بندگی و ذکر کا
اور کرتے ہیں یہ جو کچھ، وہ خدا ہے جانتا"

IV. وَیُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِیْفَتِهٖ
(الرعد:13)

"خوبیوں کی اُس کی، ہوتی ہے گرج تسبیح خواں
خوف سے اُس کے فرشتے بھی (ثنا خواں ہیں یہاں)"

V. اَوَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ ﴿۴۸﴾

(النحل:48)

''کیا یہ مخلوقاتِ خالق کو نہیں ہیں دیکھتے؟
سائے ان کے دائیں اور بائیں طرف جھکتے ہوئے
سر بسجدہ ہیں وہ گویا سامنے اللہ کے
عاجزی کا کرتے ہیں اظہار (سجدے میں پڑے)''

VI. وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ﴿۱۱﴾

(الانفال:11)

''آسماں سے اُس نے پھر پانی کی بارش تم پہ کی
تا کہ (اس میں غسل کر کے) پاک ہو جاؤ سبھی
دُور کر دے تم سے وہ شیطان کی سب گندگی
دل تمہارے کر دے مضبوط اور جما دے پاؤں بھی''

اس کائنات میں موجود چیزوں کو تین گروپوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (1) جمادات (پہاڑ وغیرہ) (2) حیوانات (جانور) (3) نباتات (سبزیاں وغیرہ)۔ مسلمانوں کی نماز پہاڑوں (جمادات) کی طرح استقامت کے ساتھ کھڑے رہنے (قیام)، جانوروں (حیوانات) کی طرح رکوع میں جھکنے اور سبزیوں (نباتات) کی طرح (جن کے منہ اُن کی جڑیں ہوتی ہیں) سجدہ کرنے پر مشتمل ہے۔ نماز میں بلند آواز کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی تکبیر (بڑائی) کا اقرار کیا جاتا ہے۔

(اللہ اکبر یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ سب سے بڑے اور عظیم ترین ہیں) مختلف رکعتوں میں ایک ہی عمل سیاروں کی گردش کی طرح دہرایا جاتا ہے۔ مختلف رکعتیں (دھوپ کے) سائے کی طرح گھٹتی اور بڑھتی رہتی ہیں وغیرہ۔ نماز میں کلام اللہ یعنی قرآن الکریم کی تلاوت کی جاتی

ہے۔اس طرح مسلمان نماز کے دوران ہر جگہ پر موجود اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں حاضری دیتا ہے۔انسان اپنے خالق کے اس قدر قریب ہوتا ہے کہ وہ اللہ تبارک وتعالیٰ سے ہم کلام ہونے کا اعزاز حاصل کرتا ہے (التحیات میں تشہد پڑھنا اللہ تبارک وتعالیٰ سے ہم کلامی ہے) جس طرح شمع غارِ حرا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے معراج کی رات اللہ جل شانہٗ سے کلام کیا تھا۔مسلمانوں کی نماز کائنات میں موجود ہر چیز کی عبادتوں کی خوبصورت آمیزش (ملاپ) ہے اور حتیٰ کہ تمام مذاہب کے طریقہ ہائے عبادت کو اسلام کے خصوصی طریق کار میں سمو دیا گیا ہے۔

(97) دوسرے مذہبی فرائض یعنی روزہ وغیرہ کا تذکرہ بعد میں کیا جائے گا۔آغاز میں روزانہ صبح اور بعد از دوپہر کی محض دو نمازیں فرض تھیں۔تہجد کی ادائیگی پیغمبروں کی عادت وعبادت تھی مگر یہ دوسروں پر لازم نہ تھی۔

باب 4

تبلیغ (اسلام) اور اس کے فوری نتائج

(98) دین اسلام کی تبلیغ قدرتی طور پر معلم کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اپنے گھر سے شروع ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ محترمہ (حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا)، بچے، گھریلو ملازم اور لے پالک افراد (حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے آسانی سے نئے دین کو قبول کر لیا کیونکہ وہ سب جانتے تھے کہ صادق اکبر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی بھی جھوٹ نہیں بولا اور یہ کہ ہمیشہ دوسروں کی بے غرض خدمت کی ہے۔ اس کے بعد محبوب خدا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے قریبی دوستوں کو تبلیغ کی۔ خاص طور پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو قبول اسلام کی دعوت دی گئی تو وہ (دین اسلام فوری طور پر قبول کرنے کے ساتھ ساتھ) اسلام کے پُرجوش اور اثر آفریں مبلغ بن گئے۔ ان کی کوششوں اور کاوشوں سے مکہ مکرمہ کے نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد مشرف بہ اسلام ہوئی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہِ تعالیٰ عنہ نے اپنی دولت ایسے غلاموں کو خرید کر آزاد کرنے میں خرچ کی جو کہ دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے اور بت پرستی چھوڑنے کی وجہ سے ان کے مالکان (آقا) ان پر ظلم و تشدد کر رہے تھے۔ اس کے بعد نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رشتہ داروں اور اہلِ قبیلہ کو دعوتِ اسلام دینے کا سب سے مشکل مرحلہ آیا۔ ان لوگوں کا قبول اسلام کفار مکہ کے اس طعنہ کا جواب دینے کے لیے از حد ضروری تھا جب وہ یہ کہتے کہ "دیکھو! محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے رشتہ دار اسے (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) انتہائی قریب سے جاننے کے باوجود اس (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دعوت اسلام کو قبول نہیں کر رہے!" جدت و انقلاب پسند نوجوانوں کے برعکس قدامت پسند عمر رسیدہ افراد کو نئے نظریہ پر مائل و قائل کرنا از حد مشکل ہوتا ہے۔ رسولِ رحمت حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حقیقی چچا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قبیلہ کے سردار جناب ابو طالب اگرچہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حد درجہ محبت کرتے تھے مگر ان کے لیے (عمر میں اپنے سے چھوٹے کی بات کو برتر تسلیم کرنا یعنی) اپنے بھتیجے کی دعوت پر باپ دادا کے مذہب کو ترک کرنا ان کی خود پسندی کے خلاف تھا۔ جناب ابو

طالب کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قبیلہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوسرے حقیقی چچا ابولہب کا مرتبہ تھا مگر ابولہب، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ اگرچہ جناب ابوطالب نے سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوتِ اسلام قبول کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کی تھی مگر ابولہب اپنے جملہ وسائل کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حددرجہ مخالفت پر اُتر آیا تھا۔ جب نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے رشتہ داروں کے اجتماع میں دعوت اسلام دیتے تو ابولہب طنز و توہین سے کام لیتے ہوئے معاملہ بگاڑ دیتا۔ اسی طرح جب سردار الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے رشتہ داروں اور اپنے قبیلہ سے باہر کے افراد کو دعوتِ اسلام دیتے تو ابولہب وہاں بھی (پہنچ جاتا اور) سخت نالائقی اور بے ہودہ گوئی (فضول بکواس) کا مظاہرہ کرتا۔ [ابولہب کا اصل نام عبدالعزیٰ بن عبدالمطلب تھا۔ لہب کے معنی ہیں آگ کا شعلہ جبکہ ابولہب کا لغوی مطلب ہوا 'آگ کے شعلے کا باپ'' چونکہ وہ مرنے کے بعد سخت شعلہ زن آگ میں پہنچنے کا مستحق ٹھہرا اس لیے قرآن پاک کی سورۃ اللھب میں اُسے اُس کے آخری انجام کے حوالے سے ''ابولہب'' کہا گیا۔]

(99) ہادیٔ کون و مکاں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سوچ کے ساتھ کہ میرے رشتہ داروں کا تعصب اور ہچکچاہٹ ایک نہ ایک روز ختم ہو جائے گی شہر مکہ مکرمہ کے عام لوگوں کو دعوتِ اسلام دینا شروع کر دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت نے زیادہ عمر کے افراد کی نسبت (13 سے 29 سال کی عمر کے) نوجوانوں میں زیادہ کامیابی و کامرانی حاصل کی۔

(100) اس (صورت حال) سے غیر متوقع مسائل نے جنم لیا۔ عمر رسیدہ افراد کی دین اسلام سے بے رُخی اس وقت پُر زور دشمنی میں بدل گئی جب اُن کے اپنے کم عمر بچوں اور نوجوان رشتہ داروں نے دائرہ اسلام میں داخل ہونا شروع کر دیا۔ چنانچہ جب مقامی معزز و محترم خاندانوں کے نوجوانوں یعنی فراس ابن النضر، ابوحذیفہ ابن عتبہ، ہشام ابن العاص اور الولید ابن الولید وغیرہ نے اسلام قبول کیا تو ان کے والدین نے اسے اپنی عزت و عظمت کی توہین سمجھا۔ انہوں نے نہ صرف اپنے ان بیٹوں پر ظلم و ستم جاری رکھا بلکہ خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاکیزہ (تبلیغی) کام میں سرِعام مخالفت اور رکاوٹ پیدا کرنے لگے۔ اسلام قبول کرنے والے غلام مردوں اور عورتوں کی حالت (خصوصاً) انتہائی قابل رحم تھی۔ اپنے بچوں کی طرح ان پر کوئی شخص ترس کھانے کو تیار نہیں تھا۔ اور جب رسول مکرم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس امر کی تصدیق کی کہ بت پرستوں کا ٹھکانہ جہنم ہے تو وہ لوگ مشتعل ہو گئے

اور جب یہ اعلان بھی کیا گیا کہ (حتیٰ کہ) ان (بت پرستوں) کے آباء و اجداد بھی رب تعالیٰ جل جلالہٗ کی سزا و جزا کے مستحق ہوں گے تو (اس صورت حال میں) وہ لوگ نئے دین کی حمایت کس طرح کر سکتے تھے! مگر خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اس اعلان پر اشتعال و دشمنی کا مظاہرہ کرنا صرف ایک بچگانہ حرکت تھی۔ کیا اس طرح رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم (بغیر کسی فرق کے) خود اپنے اسلاف کو اس اعلان میں شامل نہیں کر رہے تھے؟

(101) وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ (آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نبوت کی) خبر بتدریج مکہ مکرمہ سے نکل کر شہر کی حدود سے باہر (دُور دُور تک) پھیل گئی۔ (مزید یہ کہ) رسول رحمت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا معمول تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ایام حج میں جبکہ عرب کے ہر حصے سے قافلے حج کی خاطر آ کر مکہ مکرمہ میں اور اس کے اردگرد پھیل جاتے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس اجتماع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں دعوتِ اسلام دیتے۔ چنانچہ اس طرح بہت سے اجنبی ایک خاص تجسس کے زیر اثر بھی معلم کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تبلیغ پر توجہ دیتے تھے۔

(102) ابوذر (قبول اسلام سے پہلے) راہزن تھا۔ ایک روز اُس نے ایک قافلہ پر حملہ کے دوران خواتین اور معصوم بچوں کی چیخ و پکار اور بددعا سنی تو اس کا ضمیر جاگ اُٹھا۔ وہ اپنے اس عمل پر سخت شرمندہ ہوا۔ انہی دنوں اتفاقاً اُسے علم ہوا کہ مکہ مکرمہ میں بلند اخلاق کی ایک تحریک چلائی جا رہی ہے۔ وہ بدر کی وادی سے ایک لمبا فاصلہ طے کرنے کے بعد مکہ مکرمہ پہنچا اور دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ پھر وہ ہادئ کون و مکاں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے کہنے پر واپس اپنے علاقہ پہنچ کر نئے دین (اسلام) کی تبلیغ میں مصروف و مشغول ہو گئے۔

(103) اسلام کے خلاف کفار مکہ کے (جھوٹے) پراپیگنڈہ سے یمن کا ایک باشندہ اس قدر متاثر اور خوف زدہ ہوا کہ جب وہ مکہ مکرمہ آیا تو اُس نے اپنے کانوں میں کپڑے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ٹھونس لیے تا کہ وہ سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی جادو اثر تبلیغ سے بچ سکے مگر جلد ہی اُس نے اپنے اس منفی (بزدلانہ) اور احمقانہ رویہ پر خود کو ملامت کی اور (اپنے آپ سے) کہا "اس (نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی بات سن لینے میں نقصان ہی کیا ہے؟ میں اتنی عقل تو رکھتا ہوں کہ اس (آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی باتوں کو خود پرکھ سکوں"۔ اور پھر اسلام کے سیدھے سادے مگر حکمت و دانائی سے

بھرے اصولوں نے اسے اس قدر متاثر کیا کہ اس نے اسلام قبول کرلیا۔ اسی طرح حبشہ سے مکہ مکرمہ آنے والے بعض افراد بھی جو غالباً تاجر تھے دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

(104) شافع محشر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نوجوان چچا حضرت امیر حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ قدرے مختلف ہے۔ ایک دن وہ سیر و شکار کی صحرائی مہم سے واپس (شہر) پہنچے تو اُن (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کی خادمہ نے انہیں (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) بتایا کہ اس روز ابوجہل نے ان (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے بھتیجے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ سخت زیادتی کی ہے اور یہ کیا ہے، وہ کیا ہے (یعنی مکمل تفصیل بتائی)۔ حضرت امیر حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ابوجہل کے اس عمل کو اپنی اور اپنے خاندان کی بے عزتی سمجھا۔ وہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سیدھے ابوجہل کے پاس پہنچے انہوں (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے ایک بھی لفظ کہے بغیر اپنی کمان سے ابوجہل کو مار پیٹ کر سخت زخمی کر دیا اور اعلان کیا "تمہارے ظلم و زیادتی کی وجہ سے میں نے اسلام قبول کرلیا ہے۔"

(105) حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قبولِ اسلام اپنی نوعیت کا منفرد واقعہ ہے۔ اُس وقت وہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) تیس برس کے ہونے والے تھے اور اپنی پسند و ناپسند میں انتہا پسند تھے۔ اس حقیقت سے آشنا ہوئے بغیر کہ اسلام کیا ہے اور اس کے مقاصد کیا ہیں وہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) مسلمانوں پر سختی کرنے میں شدید اور پُرجوش تھے چاہے وہ ان (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے اپنے خاندان کے افراد ہوں یا خاندان سے باہر کے ہوں۔ ایک روز انہوں (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے پکا ارادہ کرلیا کہ وہ نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو (نعوذ باللہ) قتل کر دیں گے تاکہ اس نئی پریشانی کی اصل وجہ ہی کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم کر دیا جائے (نعوذ باللہ)۔ انہوں (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے اپنے ہتھیار اُٹھائے اور محبوبِ خدا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ راستے میں انہیں (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ان کا ایک رشتہ دار (حضرت نعیم بن عبداللہؓ) ملا جسے انہوں (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے اپنے اس ارادے سے آگاہ کیا۔ اُن (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کا یہ رشتہ دار خفیہ طور پر دائرہ اسلام میں داخل ہو چکا تھا۔ وہ اس بات سے اچھی طرح واقف تھا کہ (حضرت) عمر (فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے ساتھ بحث و دلیل ناممکن ہوتی ہے جب وہ کسی کام کے کرنے کا ارادہ کر لیتے ہیں (تو وہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) اسے لازماً کر گزرتے ہیں)۔ چنانچہ اُس نے کہا "اے عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)! تم نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے قبیلہ سے جنگ شروع

کرنے سے پہلے اپنے گھر کی تو خبر لو۔ تمہاری بہن اور تمہارا بہنوئی دونوں مسلمان ہو چکے ہیں۔"
اس غیر متوقع اطلاع نے (حضرت) عمر (فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو غصے سے آگ بگولا کر دیا۔ وہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سب کچھ بھول گئے اور سیدھے اپنی بہن (حضرت فاطمہ بنت خطابؓ) کے گھر پہنچے۔ دروازے پر انہوں (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے اندر سے قرآن مجید کی تلاوت کی آواز سنی جو کہ انہیں (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ملنے والی اطلاع کا صاف اور واضح ثبوت تھا۔ انہوں (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے اس زوردار طریقے سے دروازہ کھٹکھٹایا کہ گھر کے اندر موجود تمام افراد خوفزدہ ہو گئے۔ قرآن پاک پڑھانے والے (حضرت خباب بن الارتؓ) کو جلدی سے (گھر میں کسی جگہ) چھپا دیا گیا اور (حضرت) عمر (فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے بہنوئی (حضرت سعید بن زیدؓ) نے دروازہ کھولا۔ (حضرت) عمر (فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے غصے سے پوچھا "مجھے بتاؤ کہ تم کیا تلاوت کر رہے تھے؟" جواب دیا گیا کہ "ہم تو کچھ بھی (تلاوت) نہیں کر رہے تھے۔ ہم تو صرف بات چیت کر رہے تھے۔" (اس جواب سے) عمر (فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کا غصہ شدید سے شدید تر ہو گیا۔ (اس عالم میں) انہوں (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے اپنے بہنوئی کو ضرب لگائی۔ ان (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کی بہن (حضرت فاطمہ بنت خطابؓ) اپنے شوہر کو بچانے کیلئے آگے بڑھیں تو خود بھی (حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی) ایک غیر ارادی ضرب سے زخمی ہو گئیں۔ (حضرت) عمر (فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ) معززینِ مکہ میں سے تھے اور وہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کسی خاتون خاص طور پر اپنی پیاری بہن پر ہاتھ نہیں اُٹھا سکتے تھے۔ انہیں (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) اس کا سخت دکھ ہوا۔ انہی لمحات میں بہن نے (حضرت) عمر (فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ) پر ایک جذباتی چوٹ لگائی۔ انہوں (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) نے زخمی شیرنی کی طرح دھاڑتے ہوئے کہا "ہاں! ہم اسلام قبول کر چکے ہیں۔ تم جو چاہو کر لو۔" (حضرت) عمر (فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کا تمام غصہ جاتا رہا۔ وہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) شائستگی سے بولے "مہربانی کرو اور مجھے وہ دکھاؤ جس کی تم تلاوت کر رہے تھے۔"
ان (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کی بہن ابھی تک سخت غصے میں تھیں۔ انہوں (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) نے کہا "تم کافر ہو، ناپاک ہو، چنانچہ تم اس حالت میں پاکیزہ اوراق کو نہیں چھو سکتے۔" (حضرت) عمر (فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے کہا "میں اب تمہارے دین کا دشمن نہیں رہا۔ تم مجھے بتاؤ کہ ان اوراق کو کیسے چھوا جا سکتا ہے؟" اس پر بہن (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) نے کہا "جاؤ پہلے غسل کر کے اپنے جسم کو پاک کرو۔" (حضرت) عمر (فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے اپنی بہن (رضی اللہ

تعالیٰ عنہا) کی ہدایت پر فوری عمل کیا اور خاندان کے افراد نیک توقعات میں سب کچھ بھول گئے اور سب کچھ معاف کر دیا۔ جب عمر (فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ) غسل خانے سے نکلے تو ان (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کی بہن نے انہیں (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) قرآن الحکیم کے چند اوراق دیئے۔ ان اوراق کے مطالعہ سے وہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) قرآن مجید کے پیغام سے اس قدر متاثر ہوئے کہ پکار اُٹھے "تم لوگ اسلام قبول کرنے کیلئے کیا کرتے ہو؟" اس موقع پر قرآن پڑھانے والے اُستادِ محترم جو خوف سے گھر کے اندر ہی چھپے ہوئے تھے باہر نکل آئے۔ انہوں (حضرت خباب بن الارتؓ) نے عمر (فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو بتایا کہ "ایک یا دو روز پہلے نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عاجزی کے ساتھ رب ذوالجلال سے دعا فرمائی تھی کہ اے اللہ جل جلالہٗ! ابوجہل یا عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو دائرہ اسلام میں داخل کر کے ان کی مدد فرما۔ مجھے یقین ہے کہ تم رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اسی عاجزانہ دعا کا خوش گوار انعام ہو۔ میرے ہمراہ آؤ۔ میں تمہیں امام الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لے جاتا ہوں۔" (اُس وقت نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک صحابی حضرت ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر میں موجود تھے۔ حضرت ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک پُر جوش مگر خاموش نومسلم تھے) جب لوگوں نے (حضرت ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر کے دروازے پر) عمر (فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کی آواز سنی تو وہ ازحد خوفزدہ ہوئے مگر رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "ڈرو نہیں۔ تم زیادہ تعداد میں ہو جبکہ وہ تنہا ہے۔" جب عمر (فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ) اندر آئے تو ہادیٔ کون و مکاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سے بڑے پُر جوش انداز میں مصافحہ کیا اور فرمایا "اے عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) تم کب تک غلط راستے پر چلتے رہو گے؟" اس کے جواب میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے زوردار آواز میں مسلمان ہونے کا اقرار کیا۔ یہ اقرار اس قدر غیر متوقع تھا کہ وہاں پر موجود مسلمانوں کے گروہ نے بے اختیار اللہ اکبر (اللہ جل جلالہٗ، عظیم ترین ہیں) کا نعرہ بلند کیا۔ قریبی گھروں کے رہائشی حیران ہو گئے کہ حضرت ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خاموشی والے گھر میں کیا ہوا ہے! (اسلام قبول کرنے کے بعد) حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تجویز دی "کافر تو سرعام پرستش (بت پرستی) کرتے ہیں ہم چھپ کر ایسا (اللہ جل شانہٗ کی پرستش) کیوں کریں؟" چنانچہ فوراً مسلمانوں کا جلوس حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سرکردگی میں کعبۃ اللہ کے صحن میں پہنچا اور وہاں سرعام نماز ادا کی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی موجودگی ہی کسی

بھی قسم کے ناخوش گوار ردعمل کو روکنے کے لیے کافی تھی۔ نماز کے بعد (مسلمانوں کا) گروہ خاموشی سے واپس آ گیا۔

(106) نہ صرف مشرکین کے خاندانوں کے نوجوان اور غلام بلکہ ان کے تعلق دار اور لے پالک تک ان کے ظلم وستم کا شکار تھے۔ حضرت عمار ابن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جو یمنی الاصل تھے اور قبیلہ مخزوم سے تعلق رکھتے تھے (ابو جہل بھی اسی قبیلہ سے تھا) ان پر اس قدر سخت تشدد کیا جاتا کہ وہ بے ہوش ہو جاتے۔ وہ خود کو اس ناقابل برداشت اذیت سے بچانے کے لیے کچھ بھی کہنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ ایک موقع پر وہ رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس روتے ہوئے آئے اور بتایا کہ انہیں کس طرح شدید ترین ظلم وستم کے ذریعے دین اسلام سے لاتعلقی اور کفر کا اقرار کرنے پر مجبور کیا گیا۔

نبی رحمت حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "جب تک تم دل سے مومن و مسلمان ہو، زبان سے ایسے اقرار سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" پاخ رضی اللہ تعالیٰ عنہا (عرف سمیہؓ) جو حضرت عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بوڑھی والدہ تھیں فطری وقدرتی طور پر اپنے بیٹے پر تشدد برداشت نہیں کر سکتی تھیں، ایک مرتبہ انہوں نے ابو جہل کو بددعا دی اور اس کی بے عزتی کی۔ ابو جہل غصے میں آ گیا اور اس نے اپنا نیزہ بوڑھی خاتون کے پیٹ میں گھونپ کر انہیں جان سے مار دیا۔ حضرت عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی والدہ محترمہ کے نام پاخ (جدید ترکی زبان میں پاموک کہا جاتا ہے) سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاید وہ ترک نسب تھیں۔ وہ اسلام کی راہ میں شہید ہونے والی پہلی خاتون ہیں۔ ان کا تعلق کاسکر (کسکر) سے تھا (جو ایران کے خطہ زندورد کا ایک علاقہ ہے)۔

(107) رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پاک کو بھی مشرکین کی طرف سے تکلیف واذیت پہنچائی جاتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کے دروازے اور خاص طور پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کی گلی میں اُس وقت کانٹے بچھائے اور کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا تھا جب نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رات کو دیر سے گھر لوٹتے تھے اور گلیوں میں روشنی نہیں ہوتی تھی یا جب سردار الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کعبہ کے صحن میں نماز ادا فرماتے اور سجدے میں ہوتے تو شریر مشرکین آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سر یا پیٹھ پر بھاری پتھر یا (بتوں کے نام پر) قربان کیے گئے جانوروں کی (وزنی اور بدبودار) اوجھڑی رکھ دیتے تھے اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا تھا۔

(108) انسانی فطرت ایک پوشیدہ راز ہے اور (مختلف معاملات میں) مختلف افراد کا ردِعمل مختلف ہوتا ہے۔ رکانہ نامی ایک شخص مکہ مکرمہ کا پیشہ ور پہلوان تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اس قدر طاقتور تھا کہ اگر وہ کسی جانور کی کھال پر کھڑا ہو جاتا تھا تو بہت سے افراد اس کھال کو کھینچ کر اُسے وہاں سے ہلا نہیں سکتے تھے حتیٰ کہ کھال پھٹ جاتی تھی۔ ایک دفعہ وہ سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا "اگر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مجھے کشتی میں شکست دے دیں تو میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اللہ (جل شانہٗ) کا نبی مان لوں گا۔" حتیٰ کہ (بعض روایات کے مطابق) اُس نے اس کشتی پر اپنی بھیڑوں کا ایک تہائی ریوڑ دینے کی شرط بھی ازخود لگالی۔ (نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور رکانہ پہلوان میں) مقابلہ ہوا اور رکانہ پہلوان کو شکست ہوئی مگر اُسے ایک شکست پر اطمینان نہ ہوا اور اُس نے دوبارہ مقابلہ کرنے کی درخواست کی۔ جب رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُسے مسلسل تین دفعہ شکست دے دی تو اُس نے رونا شروع کر دیا۔ وہ کہنے لگا "میں اپنی تمام بھیڑیں شرط میں ہار چکا ہوں۔ اس بارے میں اپنی بیوی سے کیا کہوں گا؟" رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے عالی ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی تمام بھیڑیں اُسے واپس کر دیں مگر رسولِ مکرم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس مہربانی پر خوش گوار ردِعمل کا اظہار کرنے کی بجائے دوڑ کر مشرکین مکہ کے گروہ میں جا پہنچا اور ان سے کہنے لگا "محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو نقصان پہنچانے کی بجائے ان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حفاظت کرو۔ اگر تمہیں کبھی کسی دشمن قبیلے سے جنگ کا سامنا ہو تو تم انہیں بتا سکتے ہو کہ تمہارے پاس ایک ایسا جادوگر (نعوذ باللہ) ہے جس پر کوئی قابو نہیں پا سکتا۔ ربِ کعبہ کی قسم! محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حیرت انگیز کارنامے سرانجام دے سکتا ہے۔ وہ اس زمانے کا عظیم ترین جادوگر ہے۔" (نعوذ باللہ)

(109) ابوجہل تو ایک اور ہی طرح کی نفسیاتی اُلجھن کا شکار تھا۔ اُس نے ایک دفعہ کہا کہ "مجھے علم ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سب کچھ درست کہتے ہیں مگر (اصل بات یہ ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعلانِ نبوت سے پہلے) ان (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کا قبیلہ خیرات کرتا تھا تو ہم بھی اسی طرح کرتے تھے۔ جب وہ کوئی پُرتکلف دعوت کرتے تو ہم بھی جواب میں پُرتکلف دعوت کر دیتے یعنی یہ کہ ان (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کا قبیلہ عزت و وقار کے اظہار کے لیے جو کچھ بھی کرتا تھا ہم اس کا بھرپور مقابلہ کرتے تھے لیکن اب محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا قبیلہ فخر و اعزاز سے کہتا ہے کہ ہمارے پاس ہم ہی میں سے ایک نبی ہے، اب ہم

اپنے قبیلے میں نبی کہاں سے لائیں؟ چنانچہ میں یہ کبھی تسلیم نہیں کروں گا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) نبی ہیں۔"

(110) مکہ مکرمہ میں شریف النفس معززین کی کمی نہیں تھی۔ جب کبھی آوارہ لڑکے (بڑوں کے بہکاوے میں آ کر) گلیوں میں سرور کونین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا پیچھا کرتے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر پتھر وغیرہ پھینکتے اس وقت اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ابو سفیان (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے گھر کے قریب ہوتے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس گھر میں پناہ حاصل کرتے تھے۔ ابو سفیان (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) آوارہ لڑکوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیتے۔ جب آوارہ لڑکے بھاگ جاتے تو خاتم النبیین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اپنی منزل کی جانب چل پڑتے۔ ایک دن بزدل کمینے ابوجہل نے سردار الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی کم سن بیٹی حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو دیکھا تو ان (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) سے ایسا (گستاخانہ) برتاؤ کیا کہ وہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) بدبخت ابوجہل کو بددعا دیئے بغیر نہ رہ سکیں۔ اس پر ابوجہل نے حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے رخسار مبارک پر اس قدر زوردار تھپڑ مارا کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا رونے لگیں۔ ابو سفیان (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ادھر سے گزر رہے تھے۔ انہوں نے بچی (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) سے رونے کی وجہ دریافت کی۔ (حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے سارا) ماجرا سن کر ابو سفیان (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) بچی کو بازو سے تھام کر سیدھے ابوجہل کے پاس گئے اور اُس کے دونوں ہاتھ قابو کر لیے۔ پھر انہوں نے حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کہا کہ وہ ابوجہل کے منہ پر تھپڑ مار کر اپنا بدلہ لے لیں۔ حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ابوجہل کو تھپڑ مارا اور مسکراتی ہوئی گھر لوٹ گئیں۔ فطری بات ہے کہ جب محبوب خدا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اس واقعہ کا علم ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ابو سفیان (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے ممنون ہوئے (حالانکہ اس وقت حضرت ابو سفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ مشرف بہ اسلام نہیں ہوئے تھے)۔

(111) مکہ مکرمہ کی معاشرتی تنظیم (ڈھانچہ) ایسی تھی کہ لوگ قبیلوں میں تقسیم تھے۔ اگرچہ دفاع اور امور خارجہ میں مکہ مکرمہ کے تمام قبائل ایک وفاقی حکومت کی شکل اختیار کر لیتے تھے مگر داخلی معاملات میں ہر قبیلہ مکمل طور پر آزاد تھا۔ ہر قبیلہ میں زبردست اتحاد و اتفاق تھا یعنی ایک سب کے لیے اور سب ایک کے لیے خوشی غمی کے ساتھی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ایک قبیلہ کے افراد کیلئے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ آسانی سے دوسرے قبیلے کے افراد کو نقصان پہنچا سکیں۔ رسول مکرم

حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قبیلہ بڑا طاقتور تھا۔ ایک تو قبیلہ بنو ہاشم کے افراد تعداد میں بہت زیادہ تھے دوسرا ان کا عم زاد قبیلہ بنوالمطلب کے ساتھ دفائی معاہدہ بھی تھا۔ مزید یہ کہ قبیلہ بنو ہاشم کا ایک پڑوسی طاقتور قبیلہ بنوخزاعہ سے بھی قریبی اتحاد تھا۔ اس کے علاوہ قبیلہ بنونجار کے مدنی رشتہ دار بھی ہر وقت نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان کی حمایت و مدد کے لیے تیار رہتے تھے۔ چنانچہ اہل مکہ رسول خدا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آسانی سے اس وقت تک دشمنی مول نہیں لے سکتے تھے جب تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قبیلہ بنو ہاشم کے سردار جناب ابو طالب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حمایتی تھے۔ جناب ابو طالب نے چونکہ اسلام قبول نہیں کیا تھا چنانچہ کفار مکہ کو ان سے کچھ امید و توقع تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کفار مکہ کا ایک وفد جناب ابو طالب کے پاس آیا اور ان سے کہا ”آپ کا بھتیجا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مکہ شہر میں غیر ضروری کشیدگی پیدا کر رہا ہے۔ وہ خاندانوں کو تقسیم کر رہا ہے اور دوستوں کو ایک دوسرے سے الگ کر رہا ہے۔ اگر وہ دولت چاہتا ہے تو ہم اس کو اتنی رقم دینے کو تیار ہیں جتنی وہ طلب کرے۔ اگر وہ شادی کا خواہش مند ہے تو ہم مکہ شہر کی حسین ترین دوشیزہ سے اس کا نکاح کرنے کو تیار ہیں۔ اگر وہ اقتدار چاہتا ہے تو ہم اسے اپنا بادشاہ تسلیم کرنے کیلئے رضا مند ہیں مگر ہماری صرف اور صرف ایک شرط ہے کہ وہ ہمارے معبودوں (بتوں) کو ذلیل کرنا اور ہمارے آباء واجداد کے عقائد کی توہین کرنا بند کر دے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو پھر یہ جان لو کہ تم اپنے قبیلے کے خلاف پورے مکہ شہر کے لوگوں کو متفقہ دشمن بنا رہے ہو۔“ جناب ابو طالب نے اس معاملہ پر غور کرنے کا وعدہ کیا اور پھر پیغمبر خدا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا ”آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مکہ مکرمہ کے لوگوں کی پیشکش رد کرنے سے پہلے دوبارہ غور کر لیں۔“ مگر نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فوری جواب دیتے ہوئے کہا ”اگر مشرکین مکہ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی رکھ دیں تو پھر بھی میں دین اسلام کی تبلیغ چھوڑنے کو تیار نہیں ہوں گا کیونکہ تبلیغ و دعوت کا حکم مجھے اللہ تبارک وتعالیٰ نے دیا ہے۔ اگر آپ میرا ساتھ چھوڑنا چاہتے ہیں تو اللہ جل شانہٗ عظیم ترین ہیں۔ وہ میرے تمام مخالفین کے خلاف میری حفاظت فرمائیں گے۔“ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آنسوؤں اور سسکیوں کے ساتھ اپنے چچا سے رخصت ہوئے تو جناب ابو طالب نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فوراً آواز دے کر بلایا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتایا کہ وہ کسی قیمت پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تنہا نہیں چھوڑیں گے۔

(112) کفار مکہ کا ایک اور وفد آیا اور اُس نے ایک ''معاہدہ'' کی تجویز پیش کی۔ (وفد کے اراکین نے کہا) ''ہم محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے خدا (تعالیٰ جل شانہٗ) کی پرستش کرنے کیلئے تیار ہیں مگر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کو بھی ہمارے معبودوں (بتوں) کی پوجا کرنا ہوگی تاکہ ان دونوں میں سے جو بھی سچا ہوگا وہ ہمیں فائدہ پہنچائے گا اور اس طرح دوہری پرستش سے ہمیں کوئی نقصان بھی نہیں ہوگا۔'' مشرکین مکہ کی اس تجویز پر خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے قرآن الحکیم کی ان آیات کی تلاوت سے (ان کی گھناؤنی تجویز کا) کھلا کھلا جواب دیا:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۙ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۙ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۚ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۙ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۭ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝

(الکٰفرون: 1 تا 6)

''کہہ دو، اے کفار! میں ان کو نہیں ہوں پوجتا پوجتے ہو تم جنہیں، (اللہ برتر کے سوا) پوجتا ہوں میں جسے، اُس کو نہیں تم پوجتے اور جس کو پوجتے ہو تم، نہ میں پوجوں اُسے پوجتا ہوں میں جسے، تم اس کو پوجو گے نہیں تم کو اپنا دین (مبارک) اور مجھ کو اپنا دین ﴾

(113) کفار مکہ (سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اس قرآنی جواب پر) اور بھی اشتعال میں آ گئے اور انہوں نے مسلمانوں پر مظالم کی رفتار تیز کر دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جب یہ دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم دوسرے قبائل سے تعلق رکھنے والے اپنے پیروکاروں کو تحفظ نہیں دے سکتے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان لوگوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کا مشورہ دیا۔ رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے انہیں بتایا کہ ''حبشہ کا بادشاہ ایک انصاف پسند حکمران ہے۔ اس کی سلطنت میں کسی پر ظلم نہیں کیا جاتا۔'' ممکن ہے نبی مکرم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اپنے بے شمار تجارتی سفروں کے دوران کسی ایک سفر میں ذاتی طور پر حبشہ کے بادشاہ کے بارے میں اس بات کا علم ہوا ہو کیونکہ آنحضور صلی

اللہ علیہ وآلہ وسلم شام، فلسطین، عمان اور یمن کا سفر کر چکے تھے۔ یہ بھی امکان ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی تجارتی سفر کے دوران یمن سے باب المندب عبور کر کے حبشہ بھی گئے ہوں۔ علامہ طبری کے مطابق دراصل محبوب خدا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک خط میں لکھا ہے کہ "میں نے اپنے چچازاد جعفر کو آپ کے پاس چند مسلمانوں کے ہمراہ بھیجا ہے۔ اگر وہ آپ کے پاس آئیں تو اُن کی مہمان نوازی کریں اور ان پر ظلم نہ کریں۔" یہ ایک تعارفی خط معلوم ہوتا ہے جو رسول مکرم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے چچازاد حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن ابی طالب کو اس وقت دیا تھا جب وہ ہجرت کر کے حبشہ کی جانب روانہ ہوئے تھے۔ پہلے مسلمان مہاجرین کے ساتھ بہتر برتاؤ کی وجہ سے مکہ مکرمہ سے مزید (مسلمان حبشہ کی طرف) ہجرت کرنے لگے جس سے مشرکین مکہ کے غصہ وغضب میں مزید اضافہ ہوا۔

(114) مکہ مکرمہ میں ایک پُر تجسس غلط فہمی پیدا ہوئی۔ ایک روز رسول رحمت حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوران نماز قرآن الحکیم کی یہ آیات بہ آوازِ بلند تلاوت فرمائیں۔

أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّىٰ ۝ وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَىٰ ۝

(النجم:19،20)

"لات اور عزیٰ کو دیکھو تو ذرا (اے مشرکو)
اور جو ہے اک تیسری دیوی منات (اُس دیوی) کو
(ہیں یہ کیا چیز اور ان میں کتنی ہے تاب وتواں)"

ان آیات میں مشرکین مکہ کے دو معبودوں (پوجے جانے والے دو بڑے بتوں) لات اور عزّیٰ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد بعض لوگوں نے سنا کہ "وہ عظیم معبود ہیں اور وہ اپنی پرستش کرنے والوں کی شفاعت کر سکتے ہیں" (نعوذ باللہ) بعض افراد کا کہنا ہے کہ یہ الفاظ شیطان نے کہے تھے جبکہ بعض کا خیال ہے کہ ہو سکتا ہے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ الفاظ سوالیہ انداز میں کہے ہوں [یعنی "(کیا) وہ عظیم معبود ہیں اور (کیا) وہ اپنی پرستش کرنے والوں کی شفاعت کر سکتے ہیں؟"] درحقیقت قرآن الحکیم میں متعدد ایسی آیات موجود ہیں جن کا آغاز اگرچہ سوالیہ الفاظ سے نہیں ہوتا تاہم ان میں سوال ضرور پایا جاتا ہے مثلاً

فَمَالِ هَٰؤُلَاءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ حَدِيثًا ۝

(النسا:78)

"جانب حق سے ہے سب (نفع و ضرر) ان سے کہو
کیا ہوا ان کو؟ سمجھتے ہی نہیں یہ بات کو؟

اسی طرح

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ

(الاعراف:115)

"بولے ساحر، ڈالتے ہو موسیٰ تم اپنا عصا
یا ہم اپنی (رسیاں اور لکڑیاں) ڈالیں، بھلا؟"

[تاہم جو الفاظ بعض لوگوں نے سنے ان کا ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے]۔ پھر نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم رکوع میں جھکے اور اس کے بعد سجدہ میں چلے گئے۔ جو نمازی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے دُور کعبہ کے صحن میں نماز ادا کر رہے تھے انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی قرأت براہ راست نہیں سنی تھی بلکہ ایک مکی مکبر (بلند آواز سے دہرانے والا) کی آواز ان تک پہنچی تھی جس نے سرورکونین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زبان مبارک سے ان الفاظ کو غلطی سے (سوالیہ کی بجائے) مثبت سمجھا اور بتوں کی "عظمت اور شفاعت" کے حوالے سے سوالیہ انداز والے الفاظ کو بلند آواز کے ساتھ (مثبت انداز میں) دہرایا۔ پھر خوشی کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی امامت میں رکوع اور بعدازاں سجدہ میں چلا گیا۔ جب بتدریج یہ بات عام ہوئی اور نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو بھی اس کی خبر ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بتوں کی تعریف والے الفاظ کی (سختی کے ساتھ) یکسر تردید کی۔ اگرچہ غلط فہمی دُور ہو گئی مگر مشرکین مکہ کے غصہ و غضب (کے جذبات) میں اضافہ ہوا چنانچہ انہوں نے حبشہ کی جانب ہجرت کرنے والے مسلمانوں سے انتقام لینے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے ایک وفد (حبشہ کے بادشاہ) نجاشی سے ملنے کے لیے بھیجا۔ اس وفد نے بادشاہ کے درباریوں کو رشوت دے کر مطالبہ کیا کہ دین اسلام کے پیروکاروں کو حبشہ سے نکال دیا جائے۔ بادشاہ نجاشی نے (مسلمان) مہاجرین کا جواب (مؤقف) سنا تو اُس نے کفار مکہ کی سازش کو بھانپ کر ان کا غیر منصفانہ مطالبہ مسترد کر دیا۔

(115) اس ناکامی سے دل برداشتہ ہو کر مشرکین مکہ نے جناب ابوطالب کو پُرزور الفاظ میں کہنا شروع کر دیا کہ وہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حمایت ترک کر دیں۔ مشرکین مکہ کا ایک وفد جناب ابوطالب سے ملا اور تجویز دی کہ "محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) آپ کا

حقیقی بیٹا تو ہے نہیں صرف لے پالک ہی ہو سکتا ہے۔ اسے ہمارے سپرد کر دیجیے۔ ہم اس کے متبادل آپ کو مکہ مکرمہ کا خوبصورت ترین اور ذہین ترین نوجوان پیش کرتے ہیں۔ آپ اسے اپنا لے پالک بیٹا بنالیں۔" اس تجویز پر جناب ابو طالب نے انہیں طنز و توہین آمیز جواب دیا: "میں اپنے بیٹے (محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تمہارے سپرد اس لیے کر دوں کہ تم اس کی گردن اڑا سکو لیکن تمہارے بیٹے کی پرورش کرنے کیلئے اُسے اپنے پاس رکھ لوں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟"

(116) اس کے بعد مشرکین مکہ نے آپس میں صلاح مشورہ کیا اور جنگ کے خطرہ کے بغیر ایک حل ڈھونڈ لیا۔ مکہ مکرمہ کے تمام اسلام دشمن قبائل اکٹھے ہوئے۔ قریبی علاقہ کے اتحادیوں خصوصاً احابیش نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ [ان احابیش کو حبشہ والوں سے کوئی نسبت نہیں تھی۔ ان احابیش (حبشیوں) کا تعلق عرب قبیلہ بنو کنعان سے تھا۔ احابیش کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے رب تعالیٰ کی قسم اٹھا کر عزم کیا تھا کہ وہ اپنے مخالفین کے مقابلہ میں اس وقت تک یک جان رہیں گے جب تک رات تاریک اور دن روشن رہے گا اور جب تک حُبشی کا پہاڑ اپنی جگہ پر قائم رہے گا۔ اسی حبشی پہاڑ کی نسبت سے یہ لوگ احابیش کہلائے] ان لوگوں نے رسول رحمت حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان کے بائیکاٹ کا عزم کیا (یعنی یہ کہ) "کوئی شخص نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان کے کسی فرد سے کوئی گفتگو نہیں کرے گا۔ نہ ہی ان سے خرید و فروخت کرے گا اور نہ ہی ان سے رشتہ داری (بیٹی دے یا لے کر) قائم کرے گا۔" (اس صورت حال میں) سرور کونین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قبیلہ مکہ شہر سے نکل کر ایک انتہائی الگ تھلگ علاقہ میں چلا گیا جو مکہ مکرمہ کے نواح میں واقع تھا۔ اس جگہ بچوں اور خواتین پر مشرکین مکہ کی تیر اندازی اور سنگ باری کا آسانی کے ساتھ دفاع کیا جا سکتا تھا۔ ناقابل اصلاح و ہدایت ابولہب نے اپنے قبیلہ (بنو ہاشم) سے علیحدہ ہو کر مشرکین مکہ کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی۔ وہ مکہ مکرمہ ہی میں رہا (جہاں شاید اس کا معمولی سا کاروبار تھا)۔ مشرکین مکہ کا یہ فیصلہ باقاعدہ تحریر میں لایا گیا اور دستاویز کو کعبہ کے اندر لٹکا دیا گیا۔ یہ بائیکاٹ متواتر کئی سال تک جاری رہا اور یہ انتہائی ناقابل برداشت تکالیف کا حامل تھا۔ اس دوران رسول مکرم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قبیلہ میں بیاہی جانے والی خواتین یعنی حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا وغیرہ کے رشتہ دار وقتاً فوقتاً (مشرکین مکہ سے) چھپ کر کھانے پینے کے سامان سے امداد کرتے تھے۔ ایام حج کے دوران غیر ملکیوں

(بیرون مکہ سے آنے والے تاجروں) سے اشیائے ضرورت خریدنے کا امکان ہوتا تھا۔ مگر (اس طرح) صرف اخراجات ہی تھے جبکہ آمدنی بالکل نہیں تھی کیونکہ کاروباری معاملات رُک گئے تھے۔

(117) ایک روایت کے مطابق ایک روز رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے (اپنے ساتھیوں کو) بتایا کہ مشرکین مکہ نے (ان کے) بائیکاٹ کی جو دستاویز (معاہدہ) کعبہ میں لٹکا رکھی تھی اسے دیمک نے مکمل طور پر چاٹ کر ختم کر دیا ہے اور اس پر صرف ''اللہ'' (جل جلالہٗ) اور ''محمد'' (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے نام باقی رہ گئے ہیں۔ جناب ابو طالب نے مشرکین مکہ کو اس حقیقت سے آگاہ کیا۔ چنانچہ مشرکین مکہ نے (جا کر دیکھا تو محبوب خدا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی بات درست پائی۔ اگرچہ وہ سخت حیران ہوئے مگر ان پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ تاہم بائیکاٹ کے خلاف بعض افراد کی ذاتی کاوشیں مؤثر ثابت ہوئیں۔ ان میں سے ایک (رحمدل) شخص جو بھوک اور پیاس سے نڈھال بچوں کی آہ وزاری برداشت نہ کر سکا اپنے ایک با اعتماد دوست سے ملا اور اس سے مشاورت کی۔ اس کا دوست بھی یہی رائے رکھتا تھا مگر (کوئی قدم اٹھانے سے پہلے) مزید دوستوں کا تعاون حاصل کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ چنانچہ جب مختلف قبائل کے چھ ہم خیال افراد مل گئے تو انہوں نے یہ فیصلہ کرنے کے لیے ایک خفیہ اجلاس منعقد کیا کہ کس طرح پیش رفت کی جائے۔ (فیصلہ کے مطابق) اگلے دن صبح کو ایک نے کعبہ کے صحن میں کھڑے ہو کر سب کے سامنے برملا اعلان کیا کہ وہ (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے قبیلہ کے) بائیکاٹ کا مخالف ہے۔ ابوجہل نے فوراً اس کی مخالفت کی۔ پھر وہ چھ ہم خیال افراد یکے بعد دیگرے کھڑے ہوئے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ ان کے قبیلوں کے افراد بائیکاٹ کے معاہدہ سے متفق نہیں ہیں اس لیے وہ اس کی پابندی نہیں کریں گے۔

(118) یوں سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا خاندان واپس مکہ شہر آ گیا۔ فاقوں اور پریشان حالی نے کئی افراد کی صحت تباہ کر دی تھی۔ اس کے بعد جلد ہی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اہلیہ محترمہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اللہ تبارک و تعالیٰ کو پیاری ہو گئیں۔ ان کے بعد آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حمایتی چچا جناب ابو طالب بھی وفات پا گئے۔ اس طرح اب قبیلے کا سردار ابولہب بن گیا۔

(119) کچھ وقت خاموشی اور پریشانی میں گزر گیا۔ مکہ مکرمہ کی ایک عمر رسیدہ خاتون حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد اپنے شوہر کے ہمراہ حبشہ چلی گئی تھیں۔

حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا شوہر (جس کا نام سکران تھا) حبشہ میں قیام کے دوران عیسائی مذہب کی طرف راغب ہو گیا مگر حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تمام تر دباؤ اور لالچ کے باوجود دین اسلام پر قائم رہیں۔ رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ثابت قدمی کی تعریف کی اور ان سے اپنے نکاح کی تجویز پیش کی اور حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے رسول رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے عطا ہونے والے اعزاز کو بخوشی قبول و منظور کر لیا۔ حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی کوئی اولاد نہیں تھی اور وہ رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بچوں سے نہایت محبت و شفقت کے ساتھ پیش آتی تھیں۔

(120) ابولہب، نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف دلی نفرت کے جذبات کو زیادہ دیر تک پوشیدہ نہ رکھ سکا۔ اس نے بہت جلد آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معاشرتی بائیکاٹ کا بہانہ بنا ہی لیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو باغی قرار دے دیا۔ اب اس صورت حال میں کوئی بھی شخص کسی خوف و خطرہ کے بغیر آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جان سے مار سکتا تھا (نعوذ باللہ) نتیجتاً رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی اور قبیلہ کی پناہ حاصل کرنے کی بجائے ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا۔ طائف کا قصبہ مکہ مکرمہ سے دو دن کی مسافت پر تھا۔ طائف میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چند ماموں بھی رہتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ان رشتہ داروں کو آزمانا چاہتے تھے۔ چنانچہ سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے بیوی بچوں کو گھر میں چھوڑ کر بڑی آس و امید کے ساتھ اپنے وفادار ملازم حضرت زید ابن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہمراہ طائف پہنچے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طائف کے سرداروں کو کہا کہ اسلام قبول کر کے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدد کریں تو ان کا ردعمل غیر متوقع طور پر بہت زیادہ سخت تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فوری طور پر شہر سے نکل جانے کا کہا گیا۔ گلیوں کے آوارہ اور اوباش لڑکے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے لگا دیئے گئے۔ انہوں نے شدید سنگ باری سے رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ملازم کو بہت زیادہ زخمی کر دیا۔ رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص (باغ کا نگران) کو ایک باغ کے دروازے پر کھڑے دیکھا جس نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پناہ دینے پر رضامندی ظاہر کی اور پتھر مارنے والے آوارہ لڑکوں کا پیچھا کر کے انہیں بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اس باغ کا وہ نگران ایک عیسائی غلام تھا۔ اُس نے باغ کے کچھ پھل پیش کر کے رسول رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مہمان نوازی کی۔ قرآن مجسم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھل کھانے سے پہلے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

پڑھی تو عیسائی غلام کی انسان نوازی میں تجسس شامل ہوا۔ چنانچہ عیسائی غلام (اس کا نام عداس تھا) اور آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دونوں نے مذہبی مسائل پر ایک طویل گفتگو کی۔ جب سکون ہو گیا تو نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ مکرمہ واپسی کا سفر شروع کیا۔ راستے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نخلہ کے مقام پر رات بسر کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز ادا کی اور مصائب میں بے یار و مددگار رہنے پر رب کریم و رحیم سے مدد طلب کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مایوس ہر گز نہیں تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے التجا کی کہ وہ انہیں ہمت و طاقت عطا فرمائیں تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں تک رب کائنات کا پیغام پہنچانے کی کوششیں جاری و ساری رکھ سکیں۔ اس مخصوص موقع کی دعا کا متن من و عن محفوظ ہے اور مسلمانوں کیلئے یقینی طور پر متبرک ہے۔ [امام یوسف الصالحی الشامی نے اپنی کتاب ''سبل الہدیٰ والرشاد'' جلد دوم صفحہ 577 پر اس دعا کا متن دیا ہے جس کا اردو ترجمہ یہ ہے کہ ''اے اللہ جل شانہٗ! میں اپنی طاقت کی ناتوانی، اپنی قوت عمل کی کمی اور لوگوں کی نگاہوں میں اپنی بے بسی کا ذکر آپ کی بارگاہ میں کرتا ہوں۔ اے ارحم الراحمین! آپ کمزوروں کے رب ہیں۔ آپ میرے بھی رب ہیں۔ آپ مجھے کس کے حوالے کرتے ہیں! ایسے کے حوالے جو ترش روئی سے میرے ساتھ پیش آتا ہے۔ کیا کسی دشمن کو آپ نے میری قسمت کا مالک بنا دیا ہے! اگر آپ مجھ سے ناراض نہیں تو مجھے ان تکالیف کی کوئی پروا نہیں۔ پھر بھی آپ کی طرف سے عافیت اور سلامتی میرے لیے زیادہ دل کشا ہے۔ میں پناہ مانگتا ہوں آپ کی ذات کے نور کے ساتھ کہ جس سے تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں اور دنیا و آخرت کے کام سنور جاتے ہیں۔ میں آپ کی رضا طلب کرتا رہوں گا یہاں تک کہ آپ راضی ہو جائیں۔ آپ کی ذات کے بغیر نہ میرے پاس کوئی طاقت ہے اور نہ کوئی قوت ہے۔''] رب کریم و عظیم نے (اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی) دعا کو قبولیت کا اعزاز عطا کیا اور قرآن مجسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن الحکیم کی 72 ویں سورۃ الجن نازل ہوئی۔ [اسی طرح ایک اور موقع پر بھی ارشاد رب العزت ہے

وَإِذْ صَرَفْنَا إِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُونَ الْقُرْآنَ فَلَمَّا حَضَرُوهُ قَالُوا أَنصِتُوا
فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا إِلَىٰ قَوْمِهِم مُّنذِرِينَ ﴿٢٩﴾ قَالُوا يَا قَوْمَنَا إِنَّا
سَمِعْنَا كِتَابًا أُنزِلَ مِن بَعْدِ مُوسَىٰ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ
يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ وَإِلَىٰ طَرِيقٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿٣٠﴾

(الاحقاف: 29، 30)

"(اے پیغمبرؐ!) ان سے ذکر اس واقعے کا بھی کرو
جب تمہاریؐ سمت لائے ہم کئی جنات کو
تاکہ وہ قرآں سنیں، حاضر ہوئے (تعمیل کو
بولے (آپس میں) کہ چپ (بیٹھے ہوئے سنتے) رہو
ختم جب (قرآں) ہوا (اُس کا اثر دل میں لیے
ڈر سناتے پھر وہ اپنی قوم میں واپس ہوئے
بولے، اے جنو! سنی ہے (آج) ہم نے اک کتاب
بعد موسیٰؑ کے جو اُتری ہے (نہایت کامیاب
کرتی ہے تصدیق اُن اگلے صحف کی (لا کلام
ہیں جو موجود اس کے موجودہ زمانے میں (تمام)
دینِ حق ہے وہ بتاتی اور سیدھا راستا
(روح خوش ہوتی ہے، دل ہوتا ہے لذت آشنا)"

سورۃ الجن کے آغاز میں ہی کہا گیا ہے

قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۙ
(الجن:1)

"(اے پیمبرؐ) ان سے کہہ دو، مجھ پر آئی ہے وحی
کہ جنوں کی اک جماعت ہے (یہ قرآں) سن گئی"

اس کا مطلب یہ ہوا کہ نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو (اُس رات) ان غیر مرئی ملاقاتیوں (جنوں) کے گروہ کی موجودگی سے پیشگی باخبر رکھا نہیں گیا تھا۔

(121) آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واپس مکہ مکرمہ کے نواح میں غار حرا کے قریب پہنچ کر ایک اُجرتی قاصد اپنی والدہ محترمہ کے خاندان کے ایک فرد کے پاس یہ کہہ کر بھیجا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی حفاظت میں لے لیں مگر اس شخص نے انکار کر دیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی نئی اہلیہ محترمہ حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ایک رشتہ دار کو آزمایا۔ اُس نے بھی انکار کر دیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی مرحوم زوجہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ایک رشتہ دار کو آزمایا جو نہ صرف رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان کے بائیکاٹ کا زبردست مخالف رہا

تھا بلکہ بائیکاٹ کے دوران انہیں خوراک بھی بھجوایا کرتا تھا۔ اُس نے (پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت کے لیے) رضامندی کا اظہار کیا۔ چنانچہ وہ اپنے خاندان کے چند دوسرے افراد کے ساتھ مسلح ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بحفاظت مکہ مکرمہ واپس پہنچانے کے لیے غار حرا میں آیا اور اُس نے (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ مکہ مکرمہ پہنچ کر) کعبہ کے صحن میں برسر عام للکار کر کہا کہ اُس نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی حفاظت میں لے لیا ہے۔

معراج

(122) مکہ شہر میں کوئی اصلاحی و فلاحی کام کرنے کا کوئی موقع نہیں تھا۔ رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنا زیادہ تر وقت ذکر و فکر میں گزارتے تھے۔ مکہ مکرمہ میں نہ صرف یہ کہ دین اسلام کے پھیلاؤ کا کوئی (روشن) مستقبل محسوس ہوتا تھا بلکہ جو چند افراد اسلام قبول کر چکے تھے ان کے لیے (اپنے عقیدہ کے مطابق) عبادت اور دینی فرائض ادا کرنے کی آزادی بھی نہیں تھی۔ طائف سے واپسی کے فوراً بعد ایک دن سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے مرحوم چچا جناب ابو طالب کے اہل خانہ کے پاس گئے۔ شاید آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں طائف کے رشتہ داروں کے حوالے سے اپنے تجربہ کے بارے میں بتانا چاہتے تھے۔ رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یقیناً جناب ابو طالب مرحوم کی یاد نے غلبہ کیا ہوگا کہ جن کی زندگی میں انہیں ایک طرح سے (دشمنان اسلام سے) تحفظ حاصل تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رات وہاں بسر کی اور وہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک باعث عزت و عظمت خواب دیکھا۔

(123) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا جیسے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کعبہ کے صحن میں موجود ہیں۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جگا کر اللہ جل شانہٗ کی طرف سے دعوت دی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رب رحمٰن و رحیم نے ملاقات کیلئے آسمانوں پر بلایا ہے۔ سواری کے لیے براقؑ (جنت کا جانور) ساتھ تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم براق پر سوار ہوئے جبکہ حضرت جبرائیل علیہ السلام راستے کے گائیڈ (رہنما) کے طور پر ساتھ پرواز کر رہے تھے۔ ایک لمحے میں رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلے آسمان کے دروازے پر پہنچ گئے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کا اعلان کیا اور پہلے آسمان کے دربان نے تصدیق کے بعد دروازہ کھول دیا۔ وہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت آدم علیہ السلام کو دیکھا جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا استقبال اپنے "بیٹے" کی حیثیت سے تمام تر پدرانہ محبت و شفقت اور فخر کے ساتھ کیا۔ وہ "بیٹا" جو عظیم تر

اعزازات سے نوازا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہلے آسمان کے عجائبات بھی دکھائے گئے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوسرے، تیسرے، چوتھے اور آخرکار ساتویں آسمان پر پہنچے۔ ہر آسمان پر ایک یا دو پیغمبروں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال کیا۔ ان میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت یحیٰی علیہ السلام، حضرت ہارون علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام وغیرہ جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ساتویں آسمان پر تھے۔ دوسرے پیغمبروں نے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا استقبال اپنے ''بھائی'' کے طور پر کیا جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال اپنے ''بیٹے'' کے طور پر کیا۔ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعزازات پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبارکباد دی۔ ہر جگہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ناقابل بیان عجائبات دیکھے۔ پھر یہ مختصر سا قافلہ ایک بلند مقام پر پہنچا جہاں ''جوجوب (سدرہ)'' کا ایک درخت ناقابل عبور سرحد کا نشان ہے [عربی لغت میں ''سدرہ'' کہتے ہیں بیری کے درخت کو، اور المنتہیٰ کے معنی انتہا یا آخری کنارا کے ہیں۔ یہ آسمانوں پر وہ مقام ہے جو حضرت جبرئیل علیہ السلام کی پرواز کی آخری حد ہے۔ انگریزی میں اسے ''جوجوب'' (JUJUBE) کہا جاتا ہے۔ حدیث مبارکہ میں آیا ہے کہ آسمان میں عالم بالا سے جو احکامات نازل ہوتے ہیں وہ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچتے ہیں۔ پھر وہاں سے ملائکہ زمین پر لاتے ہیں۔ ساتویں آسمان میں عرشِ رحمٰن کے نیچے یہ درخت ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اس کا پھل مٹکوں جیسا اور اس کا پتا ہاتھی کے کان برابر ہوتا ہے۔] حضرت جبرئیل علیہ السلام نے یہ کہہ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے واپسی کی اجازت طلب کی کہ ''اگر میں اس حد سے آگے گیا تو اللہ تبارک وتعالیٰ کا نور مجھے زندہ جلا دے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے مہمان ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رب رحمٰن ورحیم کی طرف سے دعوت دی گئی ہے اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آگے جاسکتے ہیں۔'' پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دائیں بائیں مڑتا ہوا آگے جانے کا راستہ بتایا۔ مختلف نشانیوں کی مدد سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں انہوں نے (لکھنے والے) قلموں سے لکھائی کی آواز سنی۔ یہ وہ ''بیورو'' (مقام، دفتر) تھا جہاں اللہ جل شانہٗ کے احکامات وصول کرنے کے متعلقہ ہستیوں تک پہنچائے جاتے تھے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آگے بڑھتے رہے حتیٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ''حظیرۃ القدس'' (حظیرہ کا لغوی مطلب ہے احاطہ جبکہ قدس کا مطلب ہے پاکیزہ یعنی پاکیزہ اور مقدس احاطہ یا علاقہ) تک پہنچ

گئے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اللہ جل شانہٗ کے درمیان ''دو کمانوں'' کے مساوی یا حتیٰ کہ اس سے بھی کم فاصلہ (فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی ۔ (النجم:9) ''دو کماں کا یا کچھ اس سے رہا کم فاصلہ'') رہ گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ٹھہر گئے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے حضور ''پاکیزہ اور پُر خلوص سلام (التحیات)'' پیش کیا فوراً ہی جواب ملا

اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے التحیات جاری رکھا اور دوسروں کو اللہ جل شانہٗ کی مہربانیوں، کرم نوازیوں اور عنایتوں میں شریک کرنے کی خاطر مزید کہا:

اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَ عَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ

''سلامتی ہو ہم پر اور اللہ جل شانہٗ کے پاکیزہ کردار بندوں پر''

پہلے ذکر کیا گیا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ساتوں آسمانوں پر کچھ پیغمبروں سے ملے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام کی حدِ پرواز کو عبور کیا اور ''ملائکہ مقربین'' (رب تعالیٰ جل شانہٗ کے مقرب فرشتے) سے بھی آگے نکل گئے۔

لَنْ یَّسْتَنْکِفَ الْمَسِیْحُ اَنْ یَّکُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰہِ وَلَا الْمَلٰٓئِکَۃُ الْمُقَرَّبُوْنَ

(النساء:172)

''عار عیسیٰ کو نہیں اس سے کہ ہو عبدِ خدا
اور فرشتوں کو بھی جو ہیں (بالیقیں) قربِ آشنا''

اور پھر سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، رب تعالیٰ جل شانہٗ کے پاس پہنچے۔ یہاں غور وفکر کا نکتہ ہے۔ روایت کردہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں میں سے صرف آٹھ پیغمبر آسمانوں پر رہائش پذیر ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام پہلے آسمان پر، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام دوسرے آسمان پر، حضرت یوسف علیہ السلام تیسرے آسمان پر، حضرت ادریس علیہ السلام چوتھے آسمان پر، حضرت ہارون علیہ السلام پانچویں آسمان پر، حضرت موسیٰ علیہ السلام چھٹے آسمان پر اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ساتویں آسمان پر تھے۔ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ ان پیغمبروں کو بھی معراج کا شرف حاصل ہوا۔ حضرت آدم علیہ السلام زمین پر آنے سے پہلے جنت میں تھے اور رب تعالیٰ جل شانہٗ کے بہت قریب تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام، رب تعالیٰ جل شانہٗ کی طرف اُٹھائے گئے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دراصل حضرت یحییٰ علیہ السلام کے

پیروکار اور ان کی تعلیمات کو جاری رکھنے والے تھے۔ لہٰذا ان دونوں پیغمبروں کا آپس میں قریبی تعلق تھا۔

بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَكِیْمًا ۝

(النساء:158)

”بلکہ اپنی سمت اُٹھایا ہے انہیں اللہ نے
ہے زبردست اور ذی حکمت خدا (واضح رہے)“

رب تعالیٰ جل شانہٗ کی مدد و قدرت کا اظہار حضرت یوسف علیہ السلام پر اس وقت ہوا جب وہ وزیر مصر کی بیوی کی ترغیب سے محفوظ رہے۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا ۚ لَوْلَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ ۝

(یوسف:24)

”(حضرت یوسف سے) فکرِ (کارِ بد) عورت نے کی
(اور) اگر بُرہانِ حق اُن کو نہ (فوراً) سوجھتی
وہ بھی اُس کے ساتھ نیت اپنی بد، کر بیٹھتے
ہم نے یوں (ثابت قدم یوسف کو رکھا، فضل سے)
تاکہ اُن سے بے حیائی اور بُرائی دُور ہو
وہ ہمارے برگزیدہ بندوں میں سے تھے (سنو)“

حضرت ادریس علیہ السلام کو بلند مقام پر اُٹھا لیا گیا

وَاذْكُرْ فِی الْكِتٰبِ اِدْرِیْسَ ۫ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّیْقًا نَّبِیًّا ۝ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِیًّا ۝

(مریم:56، 57)

”(اے پیغمبرؐ!) ذکر قرآں میں پڑھو ادریس کا
بالیقیں وہ بھی تھے اک سچے نبی (مردِ خدا)
اور لیا ہم نے انہیں ایوانِ عالی میں اُٹھا)

حضرت ہارون علیہ السلام کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ساتھی اور معاون پیغمبر بنایا گیا۔

وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ۙ هٰرُوْنَ اَخِي ۙ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ۙ
وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ۙ

(طٰہٰ:29 تا 32)

''اہل سے ہارونؑ کو میرے، جو ہے بھائی مرا
کر دے نائب میرا، اور اُس سے مری ڈھارس بندھا

پس جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رب ذوالجلال کی قدرت کا مظاہرہ دیکھا تو اس کا تعلق حضرت ہارون علیہ السلام سے بھی تھا۔

وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ
اِلَيْكَ ۭ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ
مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا
وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ
وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ

(الاعراف:143)

''پہنچے موسیٰؑ (طور پر) بر وقت جب (با احترام)
اُن کے رب نے (پردے میں رہ کر) کیا اُن سے کلام
بولے موسیٰؑ مجھ کو یا رب اپنا تُو جلوہ دکھا
میں نظر بھر کر تجھے دیکھوں (یہ ارماں ہے مرا)
حکم آیا، دیکھ سکتے تم نہیں ہم کو، مگر
کوہِ (سینا) کی طرف اپنی لگی رکھو نظر
وہ (تجلی سے) اگر اپنی جگہ قائم رہا
تم بھی ہم کو دیکھ لو گے، (جلوہ ہے تاب آزما)۔
کوہ کی جانب تجلی کی جو پھر اللہ نے
کوہ ٹکڑے ہو گیا، غش کھا کے موسیٰؑ گر پڑے
ہوش جب آیا تو (موسیٰؑ سہم کر) کہنے لگے
پاک تیری ذات ہے۔ توبہ ہے میری (آج سے)

سب سے پہلے میں ہوں ایماں لانے والوں میں ترے"

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو رب تعالیٰ جل شانہٗ نے زمین و آسمان کے اعلیٰ وارفع انتظامات دکھائے۔

وَكَذَٰلِكَ نُرِيٓ إِبْرَٰهِيمَ مَلَكُوتَ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ وَلِيَكُونَ مِنَ ٱلْمُوقِنِينَ ۝

(الانعام:75)

"پھر دکھائے ہم نے ابراہیمؑ کو یوں ہی تمام
تھے زمین و آسماں میں جو عجوبہ انتظام
تاکہ ہو اہل یقیں میں (خاص اُن کا اک مقام)

کسی شخص سے آگے بڑھنے کیلئے اس کے برابر کی سطح تک آنا ہوتا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان پیغمبروں سے ملاقات ان کی خصوصیات کا اعلیٰ پیمانے پر حصول تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام کے پاس اپنی غلطی کے اعتراف کی جرأت تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دنیاوی اور مادی آسائشوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے عصمت و پاکیزگی کی مثال قائم کی۔ حضرت ادریس علیہ السلام کے بارے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتایا کہ وہ تحریر کے موجد تھے جس سے تمام انسانی تہذیب وترقی ہوئی۔ حضرت ہارون علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اہل ایمان کو ظالم فرعون کے ظلم وستم سے بچایا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہمیں توحید کا پاکیزہ ترین مفہوم سمجھایا مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ اور اللہ تعالیٰ کے کاموں کے مابین فرق قائم کیا۔ یہ ایک اچھے مومن کی بنیادی خصوصیات ہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان تمام خصوصیات کو حاصل کیا حتیٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرشتوں سے بھی آگے نکل گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم عاجز مومنین کو بھی رب رحمٰن و رحیم کے فضل وکرم اور عنایات میں اپنے ساتھ شامل کیا۔ کیا ایسے رحیم و کریم پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی مسلمان محبت نہیں کرے گا؟ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (کا اُمتی ہونے) پر فخر نہیں کریگا؟

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۝

(التوبہ:128)

"لوگو! تم میں سے تمہارے پاس آئے ہیں رسولؐ
دیکھ کر تکلیف میں تم کو، جو ہوتے ہیں ملول
ہے بھلائی کی تمہاری، حرص انؐ کو (بے کراں)
اور ہیں ایمانداروں پر شفیق و مہرباں"

رب تعالیٰ جل شانہٗ نے اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر "سینا" میں دس احکام نازل فرمائے تھے تو نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بارہ احکام نازل فرمائے جو زیادہ جامع ہیں اور انتہائی عمدہ ضابطہ اخلاق ترتیب دیتے ہیں۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَ
بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ
كِلٰـهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا
كَرِيْمًا۝ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ
رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا۝ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ
اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا۝ وَاٰتِ
ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا۝
اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ
لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا۝ وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَاۗءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ
تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا۝ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً
اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا۝
اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَقْدِرُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ

خَبِيْرًاۢ بَصِيْرًا ۝ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ
نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝ وَلَا تَقْرَبُوا
الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا ۝ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ
الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا
لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ۝
وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِىَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ
اَشُدَّهٗ ۠ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ۝ وَاَوْفُوا
الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ
وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ
وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ۝ وَلَا تَمْشِ
فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ
طُوْلًا ۝

(بنی اسرائیل:23 تا 37)

"(1) اور تمہارے رب نے ہے یہ حکم قطعی دے دیا
ہاں نہ کرنا تم عبادت غیر کی اُس کے سوا

(2) اور سلوک نیک کرنا ساتھ ماں اور باپ کے
اور ایک اُن میں سے یا دونوں تمہارے سامنے
بوڑھے ہو جائیں، تو اُن سے تم نہ "ہوں" کہنا (کبھی)
اور نہ تم اُن کو جھڑکنا، بات جب کہنا کوئی
تو ادب کے ساتھ کہنا (حکم ہے تم کو یہی)
پیار سے تم ان کے آگے اپنے شانے دو جھکا
اور کہو، ان پر تُو اپنا رحم فرما اے خدا
جیسے پالا مجھ کو چھٹ پن میں (کرم مجھ پر کیا)
جو تمہارے دل میں ہے لوگو، خدا ہے جانتا
ہو سعادت مند اگر تم (عفو کر دے گا خدا)
بخش دیتا ہے وہ، توبہ کرنے والوں کی خطا

(3) ہے قرابت داروں کا جو حق، کرو وہ بھی ادا
اور مسکین و مسافر کا بھی حق دو (برملا)
اور بے جا خرچ کرنا بھی نہیں (لوگو) روا
شک نہیں اس میں کہ مُسرف بھائی ہیں شیطان کے
اور ہے ناشکر شیطاں اپنے رب کا (جہل سے)
اور جو تم کو اپنے رب کے فضل کا ہو انتظار
اور توقع پر کرو ان سے تغافل (یا فرار)
تو انہیں نرمی سے سمجھا دو (بہ طرزِ خوشگوار)

(4) اور سکیڑو تم نہ اپنا ہاتھ (لوگو) اس قدر
گویا گردن میں بندھا ہے (ہو گیا ہے مختصر)
اور نہ بالکل ہاتھ یوں کھولو کہ پچھتانا پڑے
بیٹھے رہ جاؤ تہی دست اور ملامت میں گھرے
جس کی روزی چاہتا ہے کھول دیتا ہے خدا
تنگ کر دیتا ہے روزی جس کی ہے وہ چاہتا
دیکھنے اور جاننے والا وہی ہے بندوں کا

(5) مارو بچوں کو نہ اپنے خوف سے افلاس کے
رزق ہم دیتے ہیں تم کو اور اُن کو (فضل سے)
جان لینا اُن کی ہے بھاری خطا (باور رہے)

(6) اور زنا کے پاس ہو کر بھی نہ تم پھٹکو کبھی
کیونکہ وہ ہے بے حیائی اور اِک راہِ بدی

(7) اور حرام اللہ نے ہے قتل جس کا کر دیا
اس کو ناحق قتل کر دینا نہیں ہرگز روا
اُس کے وارث کو، جو مارا جائے کوئی ظلم سے
اختیار (خوں بہا) ہم نے دیا ہے (گر، وہ لے)
خون کے بدلے میں لیکن ہو نہ کوئی زیادتی
واجبی بدلے میں بھی (بے شک) ہے اُس کی جیت ہی

(8) اور جواں جب تک نہ ہو جائے کوئی (طفلِ) یتیم

پاس تک جانا نہ اُس کے مال کے (بے خوف و بیم)
ہاں مگر اس طرح سے، بہتر جو اُس کے حق میں ہو

(9) اور کرو جو عہد (اے لوگو) اُسے پورا کرو
باز پُرسِ عہد ہو گی حشر میں (آگاہ رہو)

(10) پورا پیمانہ بھرو، جب ناپ کر دینے لگو
اور جب تولو، تو ڈنڈی تول کی سیدھی رکھو
(یہ طریق) اچھا ہے، ہے اچھا مآل اس کا (سنو)

(11) اور (اے انساں) نہ ہو علم الیقیں جس بات کا
اس کے در پے تجھ کو ہونا ناروا ہے ناروا
کیونکہ کان اور آنکھ اور دل، سب سے ہی روزِ جزا
پوچھ گچھ ہونی ہے (سارا بھید پھر کھل جائے گا)

(12) اور زمیں پر (اے مخاطب) چل نہ اِتراتا ہوا
پھاڑ سکتا تُو نہیں (سطحِ) زمیں کو (دیکھنا)
تُو پہاڑوں کی بلندی تک پہنچنے سے رہا

رب کریم ورحیم نے یہ چاہا کہ جہاں اُس کے محبوب نبی محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُس کے فضل وکرم کے حقدار ہیں وہاں اُس کے نیک بندوں کو بھی (عنایات میں سے) حصہ ملنا چاہیے چنانچہ رب رحمٰن ورحیم نے فرمایا کہ اُس کے نیک بندے دن میں 50 بار نماز ادا کر کے اس کی رحمت کے خزانہ میں حصہ دار ہو سکتے ہیں اور رب تعالیٰ جل شانہٗ اپنے نیک بندوں کو (اُن کی نیکیوں کا) فوری بدلہ دیں گے۔ جب رب کائنات نے (ملاقات کے بعد) رسول مکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو واپس زمین پر جانے کی اجازت عطا فرمائی تو رب تعالیٰ نے "عرش کے خزانہ" میں سے ایک قیمتی تحفہ اُٹھایا اور اپنے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عنایت کیا۔ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث کے مطابق اس تحفہ کا ذکر قرآن الحکیم کی دوسری سورۃ (البقرہ) کی آخری آیت میں کیا گیا ہے۔ درحقیقت ہم وہاں پڑھتے ہیں کہ:

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا

(البقرہ:286)

"حسب وسعت، نفس کو تکلیف دیتا ہے خدا"

انسانوں کے لیے ان کی تمام تر خامیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس سے زیادہ قیمتی (اور کارآمد) تحفہ اور کون سا ہوسکتا ہے!!! اگر رب ذوالجلال ہماری طاقت واستطاعت کو پیش نظر نہ رکھتے ہوئے احکامات نافذ فرما دیتے تو محشر کے روز ہمارا کیا حال ہوتا؟ واپسی کے سفر پر جبرئیل علیہ السلام نے سرورِ کونین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جنت اور دوزخ بھی دکھائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنت الفردوس میں مختلف پیغمبروں سے بھی ملاقات فرمائی۔ ان پیغمبروں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عالی شان اعزازات پانے پر مبارکباد دی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے علم میں جب یہ بات آئی کہ اُمت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے دن میں 50 نمازوں کا حکم ہوا ہے تو انہوں نے اپنی قوم کے تلخ تجربہ کا تذکرہ کیا اور آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نمازوں کی تعداد میں کمی کیلئے (بارگاہ رب العزت میں) درخواست فرمائیں۔ چنانچہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی متعدد بار درخواست پر رب رحمٰن ورحیم نے 50 نمازوں کی بجائے پانچ نمازوں کا حکم دیا اور رب کریم و عظیم نے یہ وعدہ فرمایا کہ ان پانچ نمازوں کا دس گنا اجر یعنی ثواب 50 نمازوں کے برابر ہی ملے گا۔ قرآن الحکیم میں ارشاد رب العزت ہے:

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ

(الانعام:160)

"ایک نیکی لے کے جو (روز قیامت) آئے گا
دس گنا اُس کا ثواب (اللہ سے) وہ پائے گا"

اور پھر اللہ تبارک وتعالیٰ کے محبوب نبی حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اعلان کیا کہ:

الصَّلٰوةُ مِعْرَاجُ الْمُؤمِن
"نماز ہے معراج، مومن کی"

ایک اور روایت کی رُو سے "نماز ہر مسلمان کیلئے اللہ تبارک وتعالیٰ کا قرب (قربت کا وسیلہ) ہے۔" درحقیقت بارگاہ رب العزت میں ہر شخص کیلئے اللہ جل شانہٗ کی قربت کا درجہ اُس کے اعلیٰ وادنیٰ تقویٰ کے مطابق مختلف ہوگا۔ جو لوگ نماز کا صحیح مفہوم سمجھتے ہیں وہ یہ علم رکھتے ہیں کہ نماز کے دوران اللہ تعالیٰ کا بندہ اللہ جل شانہٗ سے ہم کلام ہوتا ہے۔ (التحیات للہ) پھر جب بندے کو روحانی طور پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی حضوری حاصل ہوتی ہے (تشہد) تو وہ بالکل

اسی طرح عمل کرتا ہے جیسے رسول مکرم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معراج کی رات رب کائنات کی حضوری کے وقت کیا تھا۔ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپسی پر پہلے بیت المقدس میں اُترے جہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے کے تمام پیغمبر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے استقبال کیلئے اکٹھے ہوئے تھے۔ یہاں دو رکعت نفلِ شکرانہ ادا کیے گئے۔ تمام پیغمبروں کی متفقہ درخواست پر نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس نماز کی امامت فرمائی۔ اور پھر وہاں سے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ مکرمہ میں اپنے بستر پر واپس تشریف لے آئے۔

(124) اللہ اکبر کی ذات پاک چونکہ ہر جگہ موجود ہے اس لیے کسی مادی فاصلے کو طے کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا قرآن پاک نے اس کے لیے لفظ ''رویا'' (خواب) استعمال کیا ہے۔

وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ

(بنی اسرائیل: 60)

''اور ہم نے یہ خواب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو صرف اس لیے دکھایا تاکہ لوگوں کی آزمائش کی جا سکے۔''

خود رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ ''یہ اُس وقت ہوا جب میں نیند اور بیداری کی درمیانی کیفیت میں تھا'' چند سال بعد سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیاری زوجہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے واقعۂ معراج کی تفصیل دریافت کی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی نسبت چونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زیادہ قریب تھیں لہٰذا قدرتی طور پر انہوں نے اس تفصیل کو زیادہ بہتر سمجھا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ ''یہ ایک روحانی سفر اور خواب تھا۔'' علامہ المقریزی نے اس میں اضافہ کیا ہے کہ ''آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دو صحابہ کرام حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی واضح طور پر یہی رائے قائم کی ہے۔'' تاہم حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس بات پر اصرار کرتے تھے کہ معراج ایک جسمانی سفر تھا۔ معراج کی نوعیت (جسمانی یا روحانی) چاہے کچھ بھی ہو یہ ایک عظیم ترین انسانی تجربہ تھا۔ حضرت ادریس علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام اور کئی دوسرے پیغمبروں کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ اسی قسم کے تجربے سے گزرے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سینا پہاڑ (کوہ

طور) پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے تجلی دکھائی مگر محبوب رب العالمین، رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رب ذوالجلال نے ''حظیرۃ القدس'' (حظیرہ کا لغوی مطلب ہے احاطہ جبکہ قدس کا مطلب ہے پاکیزہ یعنی پاکیزہ احاطہ) تک پہنچنے کی اجازت دی۔ ہمیں معراج کے سفر کو سیر وتفریح خیال کرنے کی بجائے اس کے روحانی مفہوم ومدعا کو سمجھنا چاہیے۔ ایک روایت کے مطابق معراج 27 رجب المرجب [ہجرت سے قبل 620 یا 621 عیسوی مطابق 11 یا 12 نبوی] کو ہوا۔

(125) (معراج سے) اگلے روز جب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سفرِ معراج کا اعلان فرمایا تو ہر شخص کا ردعمل اُس کے مزاج کے مطابق مختلف تھا۔ حضرت (عبداللہ) ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تو اس قدر یقین واعتماد تھا کہ انہوں نے رسول مکرم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے براہ راست تصدیق کیے بغیر ہی اس کی توثیق کر دی جس کے بعد سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دربار سے انہیں ''صدیق'' کا اعلیٰ فخر واعزاز کا حامل خطاب ملا۔ مشرکین مکہ نے اس قدرتی واقعہ کو جھوٹ قرار دیا اور مذاق اُڑایا۔ مشرکین مکہ میں سے چند افراد نے مطالبہ کیا کہ بیت المقدس کا نقشہ بیان کیا جائے کیونکہ وہ خود تجارت کے سلسلہ میں بیت المقدس جا چکے تھے تاہم وہ لوگ یہ بھول گئے کہ خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی تو حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے تجارتی قافلہ کے نگران کے طور پر بیت المقدس سے آگے بصرہ تک جا چکے تھے۔ مشرکین مکہ نے بغض اور بے وقوفانہ سوالات بھی کئے۔ وہ اس امر کو خاص طور پر حقارت سے دیکھتے تھے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو، چاہے خواب میں ہی کیوں نہ ہو، رب تعالیٰ جل شانہٗ نے ملاقات کا اعزاز عطا کیا ہے۔ اس کے بعد مشرکین مکہ کی دشمنی کی حرارت اور ظلم وتشدد کی شدت بڑھ گئی۔ ایک یمنی شخص الطفیل الدوسی نے اس موقع پر مکہ مکرمہ کا دورہ کیا۔ اس نے غیر متعصب ذہن کے ساتھ جائزہ لینے کے بعد اسلام کو انتہائی معقول اور بت پرستی کی نسبت کہیں اعلیٰ وبرتر مذہب پایا۔ اُس نے نہ صرف یہ کہ فوری طور پر اسلام قبول کیا بلکہ وہ نئے دین اسلام کا پُرجوش مبلغ بن کر اپنے گھر (یمن) واپس گیا۔ چند سال بعد وہ مدینہ منورہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں اپنے قبیلہ کے 80 کے قریب خاندانوں کو مسلمان کر کے اپنے ہمراہ لئے حاضر ہوا۔ جب حضرت الطفیل الدوسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مکہ مکرمہ میں اسلام قبول کیا تھا تو اُس نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یمن آنے کی دعوت نہیں دی تھی۔ اس کی وجہ یہ دکھائی دیتی ہے کہ یمن میں کعبۃ اللہ کا مدمقابل ''ذوالکفین'' نامی بت خانہ تھا۔ اس بت خانہ کے محافظ خاندان کے مفادات پر ایک کمزور قبیلہ کیسے ضرب لگا سکتا تھا جس کے حضرت الطفیل الدوسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک فرد تھے۔

باب 5

اور یثرب جب شہر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بنا!

(126) جائے امن کی تلاش جاری و ساری ہے تاہم رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حج کے دنوں میں میدانِ منیٰ میں ایک قبیلہ سے دوسرے قبیلہ کے وفد سے ان کے کیمپوں میں تشریف لے جاتے ہیں اور انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دینے کے ساتھ ساتھ بتاتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اللہ تبارک وتعالیٰ کے پیغمبر ورسول ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تبلیغ اسلام میں ان کی مدد بھی طلب فرماتے ہیں۔ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن سے (اُس وقت بظاہر ناقابل یقین) یہ وعدہ بھی فرماتے ہیں کہ ''اگر آپ لوگ اسلام قبول کرلیں تو وہ دن دور نہیں جب آپ دنیا کی دو عظیم مملکتوں یعنی بازنطینی اور ساسانی کی ملکیت حاصل کریں گے۔'' آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حقیقی چچا مگر جانی دشمن ابولہب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعاقب کرتا ہے اور ان قبائلی نمائندوں سے ملاقات کرکے انہیں خبردار کرتا ہے کہ اگر انہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات مانی یا حفاظت فراہم کی تو انہیں ناقابل بیان خطروں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ (بدبخت) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پاک پر عجیب وغریب قسم کے بہتان بھی لگاتا ہے۔ ایک روایت کے مطابق پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس دن تقریباً 15 قبائل کے نمائندوں سے ملاقات فرمائی جنہوں نے مختلف ردعمل کا مظاہرہ کیا۔ بعض نے تو یہاں تک کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نازیبا الفاظ کے ساتھ کیمپ سے نکال دیا جبکہ بعض نے نرم الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے عذر و بہانے کے ساتھ ٹال دیا اور کہا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حفاظت فراہم نہیں کریں گے مگر ہادیٔ برحق حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے دین اسلام کی تبلیغ جاری رکھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سولھویں کوشش و کاوش بڑی امید افزا رہی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس کامیاب و کامران کوشش و کاوش پر روشنی ڈالنے سے پہلے اس بات کا ذکر دلچسپی کا حامل ہوگا کہ خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کی جن 15 قبائل سے تبلیغ و گفتگو کامیاب نہیں رہی تھی وہ تمام جزیرہ نمائے عرب کی نمائندگی کر رہے تھے۔ (مشہور سیرت نگار) ابن ہشام کی روایت ہے کہ یہ قبائل شمالی، جنوبی، مشرقی، مغربی اور وسطی عرب سے تعلق رکھتے تھے جو اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے کہ کعبہ کا حج چند قبائل عرب تک محدود نہیں تھا بلکہ پورا عرب اس پر اعتماد و اعتقاد رکھتا تھا۔ کعبہ کی اس روحانی فضیلت سے تاجر حضرات پورا پورا مالی فائدہ اُٹھاتے تھے کیونکہ مکہ مکرمہ میں زراعت اور صنعت و حرفت سرے سے ناپید تھی اور نہ ہی کوئی اور ایسی کشش و دل کشی تھی کہ جس کی بدولت مکہ مکرمہ کو عرب کے بین الاقوامی تجارتی شہر کا درجہ دیا جاسکتا۔

(127) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سولھویں تبلیغی کامیاب کوشش و کاوش کا تعلق قبیلہ بنوخزرج کے کچھ افراد پر مشتمل ایک گروپ سے تھا یہ وہی قبیلہ ہے جس سے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دادا حضرت عبدالمطلب کی والدہ ماجدہ کا تعلق تھا۔ یہ گروپ حج کی آخری رسم کی تکمیل کی خاطر بال کٹوا رہا تھا۔ یہ لوگ شاید (شیطان کے بڑے ستون) جمرہ کے قریب ایک علیحدہ سی جگہ پر بیٹھے ایک دوسرے کے بال کاٹ رہے تھے۔ قبیلہ ''بنو خزرج'' نے ماضی قریب ہی میں اپنے عم زاد اور مدمقابل قبیلہ ''بنی اوس'' پر شاندار فتح حاصل کی تھی۔ (ان دنوں قبیلہ بنی اوس کا ایک وفد مشرکین مکہ سے فوجی معاہدہ کے لئے بھرپور کوششوں میں مصروف و مشغول تھا) قبیلہ بنوخزرج کے افراد یہودیوں کے پڑوسی ہونے کی وجہ سے دوسرے عربی قبائل کی نسبت الہامی کتب، وحیٔ نبی اور متوقع مسیحا (نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم) کی آمد جیسے تصورات و نظریات سے زیادہ بہتر آگاہ و آشنا تھے۔ جب محبوب خدا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے روبرو خوبصورت آواز میں قرآن الحکیم کی چند آیات کی تلاوت فرمائی اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہونے کی وضاحت کی تو بنوخزرج کے اس گروپ کے افراد کو یاد آیا کہ کس طرح ان کے مجبور و بے بس پڑوسی یہودی انہیں طنزیہ طور پر کہا کرتے تھے کہ ''کچھ مدت انتظار کرو۔ جلد ہی اللہ تبارک و تعالیٰ کا آخری نبی آئے گا جس کی سربراہی میں ہم تم لوگوں کو زیر کرلیں گے اور ہماری بالادستی قائم ہوجائے گی۔'' گروپ کے ارکان نے محسوس کیا کہ نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے روبرو جو کچھ بیان کیا ہے نیز جس طریقے اور سلیقے سے تبلیغ و دعوت اسلام دی ہے اس کے مدنظر نبیٔ آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کے امکان کو سراسر مسترد نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے سوچا کہ کیوں نہ (اسلام قبول کرنے میں) پہل کرکے

موقع سے فائدہ اٹھائیں؟ انہوں نے آپس میں تبادلہ خیال کیا تو اپنے خیالات میں اتفاق پایا۔ چنانچہ انہوں نے فوری طور پر (آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست مبارک پر) اسلام قبول کر لیا پھر انہوں نے یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ واپس یثرب (مدینہ منورہ) جا کر دین اسلام کی تبلیغ و اشاعت کریں گے اور اس کے نتائج سے آئندہ سال اسی جگہ پر سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو (صورت حال سے) آگاہ و آشنا کریں گے۔ (اور پھر یوں ہوا کہ) وہ اگلے سال ایام حج میں حیران کن کامیابیوں کی نوید لے کر پہنچے۔

(128) قبائل بنو اوس اور بنو خزرج (''اوس'' کے لغوی معنی عطیہ اور ''خزرج'' ٹھنڈی ہوا کو کہتے ہیں) کے مابین خونیں لڑائیوں نے فکر و نظر کے حامل مدنی افراد کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ عددی اعتبار سے برتر اور فاتح قبیلہ بنو خزرج نے اپنی بالادستی برقرار رکھتے ہوئے مدینہ منورہ میں مستقل و مستحکم امن کے قیام کا قوی عہد کیا ہوا تھا۔ اور درحقیقت انہوں نے اپنے قبیلہ کے سربراہ ابن ابی کو یثرب کا بادشاہ بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس کے لئے سونے کا تاج بنوانے کے لئے مقامی سُنار کو آرڈر بھی دے دیا تھا۔ قبیلہ بنو اوس کے افراد خونی جنگوں سے سخت اُکتائے ہوئے تھے نتیجتاً وہ تمام آبادی پر ابن ابی کی بادشاہت کو ماننے کے کیلئے آسانی سے تیار نہیں تھے۔ حج سے واپس پہنچنے والے بنو خزرج کے چھ افراد کے گروپ نے امن اور اخوت و مروت کا جو پیغام پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وصول کیا تھا اس کی تبلیغ و اشاعت انہوں نے مدینہ منورہ میں شروع کر دی اور اس کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ بنو خزرج کے ساتھ ساتھ بنو اوس کے افراد بھی دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ مدینہ منورہ میں دین اسلام کے ان چھ مبلغوں کے گروپ کی یہ بات بھی قابل تحسین ہے کہ انہوں نے قبیلہ بنو اوس پر اپنی فوجی برتری کو یکسر بھلا دیا اور اسلام قبول کرنے والے قبیلہ بنو اوس کے افراد کو اپنے برابر کے بھائیوں کی طرح گلے لگا لیا۔ نتیجتاً اگلے برس ایام حج میں 12 خاندانوں نے نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں سلام عقیدت و محبت پیش کرنے کیلئے اپنے نمائندے منیٰ میں بھیجے۔ ان نمائندوں میں سے 9 کا تعلق قبیلہ بنو خزرج سے اور 3 کا تعلق قبیلہ بنو اوس سے تھا۔ (بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ یہ افراد مدینہ منورہ کی تمام عرب آبادی کی نمائندگی کر رہے تھے) ان نمائندوں نے خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے وفاداری کا حلف اُٹھایا اور عہد کیا کہ ''ہم اللہ تبارک و تعالیٰ کے سوا کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ چوری اور زنا نہیں کریں

گے۔(غربت اور افلاس کے خوف سے) اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گے اور نہ بہتان کی اولاد لائیں گے اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کسی نیک بات میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی نہیں کریں گے۔"

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ
يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ
وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ
اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ
وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

(الممتحنہ:12)

"(اے پیمبرؑ!) جب تمہارے پاس مومن عورتیں
آئیں، اور پھر تم سے اس (اقرار) پر بیعت کریں
کہ شریکِ رب کسی کو بھی نہ وہ ٹھہرائیں گی
اور نہ اب چوری کریں گی اور نہ بدکاری کبھی
اب نہ وہ اولاد ہی کو اپنی ماریں گی (کبھی)
اور نہ بہتان اپنے دست و پا سے باندھیں گی کوئی
(یعنی اپنے دست و پا سے کوئی غلط کام کریں۔ بچہ جنیں
اور کسی اور سے منسوب کردیں یا کسی دوسرے کے بچہ کے
بارے میں کہیں کہ ہم نے جنا ہے)
نیک کاموں میں نہ وہ تم سے کریں گی سرکشی
تو قبول ان کی کرو بیعت (مناسب ہے یہی)
اُن کی بخشش کے لیئے اللہ سے مانگو دُعا
بالیقیں آمرزگار و مہرباں ہے کبریا"
("آمرزگار" یعنی بخشنے والا)

اس کے بعد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ میں اپنے 12 نقیب (نمائندے) نامزد کیے اور ان میں سے ایک کو نقیب النقباء (سربراہ) مقرر کیا۔ مستقبل میں بھی

جب مکمل مدینہ منورہ دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا تو ان نقیبوں کی تعداد 12 ہی رہی۔ مدینہ منورہ سے آئے ہوئے وفد کے اراکین نے معلم کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی کہ انہیں دین اسلام کے احکام وآداب سکھانے کے لئے کوئی معلم مقرر کیا جائے جو ان کے ہمراہ مدینہ منورہ تشریف لے جائے چنانچہ حضرت مصعب ابن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان کے ہمراہ مبلغ ومعلم کے طور پر بھیج دیا گیا۔ (اس کے بھائی ابوالروم کی والدہ یونانی نسل کی تھی۔ ہوسکتا ہے یہ دونوں حقیقی بھائی ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایرانیوں اور بازنطینیوں کی باہمی جنگوں کی وجہ سے یونانی لڑکے اور لڑکیاں غلام اور لونڈیوں کے طور پر خریدے اور فروخت کئے جاتے تھے۔ اس طرح کے کئی غلام اور لونڈیاں عرب گھرانوں میں موجود تھیں۔ عکرمہ بن ابو جہل کے گھر میں بھی ایک یونانی غلام تھا۔ طائف کے بعض گھرانوں میں بھی یونانی نسل کے غلام اور لونڈیاں کام کرتی تھیں۔)

(129) حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مدینہ منورہ میں (تبلیغ اسلام کا) جو کام کیا اس سے مدینہ منورہ کی اس دور کی معاشرت کا بھی علم ہوتا ہے۔ وہاں دین اسلام سے ہمدردی رکھنے والوں نے حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مشورہ دیا کہ "فلاں شخص کو قابو کرنا اگرچہ مشکل امر ہے تاہم اگر وہ اسلام قبول کر لے تو پھر آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہیں رہے گی۔" اس حقیقت کا علم ہوتے ہی حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس شخص کے باغ میں پہنچ کر کھجوروں کے ایک جھنڈ کے نیچے بیٹھ گئے اور خوبصورت لحن کے ساتھ قرآن الحکیم کی (بہ آواز بلند) تلاوت شروع کر دی۔ باغ کے مالک کے قبیلہ کے بعض افراد حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بے ضرر خوش الحانی سے متاثر و متجسس ہو کر آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اردگرد اکٹھے ہو گئے۔ جب باغ کے مالک اور قبیلے کے سردار کو اپنے باغ میں ایک (اجنبی) شخص کی "مداخلتِ بے جا" کا بتایا گیا تو وہ نیزہ لہراتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ اس نے گرجدار آواز میں کہا "تم میری اجازت لئے بغیر میرے باغ میں کیسے داخل ہو سکتے ہو؟ فوراً یہاں سے چلے جاؤ ورنہ میں تمہیں اپنے نیزے سے مار دوں گا۔" حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اُس کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور میٹھی آواز میں اس سے مخاطب ہوئے۔ "آپ بالکل صحیح فرما رہے ہیں مگر آپ (ایک دفعہ) میری بات سن لیں۔ اگر آپ کو میری بات بُری لگے تو میں فوراً یہاں سے چلا جاؤں گا۔" قبیلہ کے سردار اور باغ کے مالک نے اپنا نیزہ زمین میں گاڑ دیا اور بولا "تم نے بڑی منصفانہ بات کی ہے (کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟)" اور پھر حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے

انتہائی خوبصورت لحن کے ساتھ قرآن الحکیم کی چند آیات کی تلاوت فرمائی۔ اکھڑ عرب سردار اس سے ازحد متاثر ہوا۔ اس نے حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا "یہ کیا ہے؟ اور اس کا مطلب و مفہوم کیا ہے؟" حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے بتایا "یہ قرآن الحکیم کی آیات ہیں جو رب تعالیٰ جل شانہٗ نے اپنے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل فرمائی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اللہ تبارک وتعالیٰ کے رسول ہیں اور قرآن مجید کے مبلغ ہیں اور قرآن الحکیم یہ کہتا ہے کہ اللہ جل شانہٗ صرف ایک ہیں۔ انسان کے بنائے ہوئے بتوں کی پرستش جائز نہیں۔ یہ کائنات اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہی تخلیق کی ہے۔ قرآن الحکیم انصاف، احسان وکرم اور ایک رب تعالیٰ کی اطاعت کا سبق دیتا ہے۔" اس عرب سردار کو مزید معلومات کی ضرورت نہیں تھی وہ پکار اُٹھا "یہ اصول وضوابط اپنانے کیلئے تم کیا کرتے ہو؟" جب اُسے بتایا گیا کہ اُسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانا ہوگا۔ تو اس نے نیزہ اُکھاڑا اور جوش وخروش کے ساتھ واپس چلا گیا۔ اس نے اپنے قبیلہ کے تمام افراد کو اکٹھا ہونے کا حکم دیا۔ جب اس کے قبیلہ کے تمام افراد، غلام اور ملازم ایک جگہ اکٹھے ہو گئے تو اس نے زوردار آواز میں ان سے سوال کیا "میں کون ہوں؟" اسے اس طرح غصے میں دیکھ کر اس کے قبیلہ کے تمام افراد نے جواب دیا "آپ ہمارے سردار ہیں۔ سب سے زیادہ عقل مند اور سب سے بڑے بہادر!" پھر اس نے اپنا نیزہ ہوا میں لہرایا اور بولا "اگر تم لوگوں نے فوراً اسلام قبول نہ کیا کہ جس کی تعلیم (میرے باغ میں موجود) وہ مکی مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ دیتا ہے تو میں تمہارا سب سے بڑا دشمن ہوں گا۔" اور (ایسا ہوا کہ) اس کا پورا قبیلہ سورج غروب ہونے سے پہلے دائرہ اسلام میں داخل ہو چکا تھا۔

پہلی نمازِ جمعہ:

(130) حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کامیابیوں اور کامرانیوں میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وقتاً فوقتاً ختم المرسلین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان خوشخبریوں سے تحریری طور پر اطلاع دیتے رہتے تھے۔ شاید آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے خطوط میں معلم کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مزید احکامات وہدایات اور مدنی افراد کے سوالات کے جوابات طلب فرماتے ہوں۔ ایک روز حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک خط وصول ہوا جو آپ رضی

اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک خط کے جواب میں لکھا گیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس خط میں لکھا تھا کہ:

''ہر جمعۃ المبارک کو جبکہ یہودی اگلے دن کے ''یوم السبت'' (سبت ہفتہ کے دن کو کہتے ہیں۔ یہ دن بنی اسرائیل کے لئے مقدس قرار دیا گیا تھا اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے اور اولادِ اسرائیل کے درمیان پشت در پشت تک دائمی عہد کا نشان قرار دیتے ہوئے تاکید کی تھی کہ اس روز کوئی دنیاوی کام نہ کیا جائے۔ گھروں میں آگ نہ جلائی جائے۔ جانوروں اور غلاموں سے کوئی کام نہ لیا جائے اور جو شخص اس ضابطہ کی خلاف ورزی کرے اسے قتل کر دیا جائے) منانے کی تیاری کرتے ہیں تم دوپہر کے بعد مسلمانوں کی نماز باجماعت کا انتظام کیا کرو اور اس کی امامت خود کیا کرو۔'' چنانچہ پہلے جمعۃ المبارک کی نماز میں 12 افراد نے شرکت کی۔

(131) اس وقت مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں سے کوئی بھی مسلم ملک نہیں تھا تاہم مدینہ منورہ میں مسلمانوں کو اپنے ضمیر کے مطابق عمل کی آزادی حاصل تھی۔ چنانچہ مدینہ منورہ جیسے اس وقت کے غیر مسلم ملک میں ہادیٔ کون و مکاں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نمازِ ظہر کی جگہ نمازِ جمعۃ المبارک ادا کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ ذرائع سے یہ علم نہیں ہوتا کہ حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پہلی نماز جمعۃ المبارک میں خطبہ ارشاد فرمایا تھا یا نہیں۔ تاہم جب سرورِ کونین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باقاعدگی کے ساتھ جمعۃ المبارک کی نماز کے دوران خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔

مدینہ منورہ کی جانب ہجرت کا فیصلہ:

(132) اگلے حج کے موقع پر حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سمیت 500 مدنی افراد مکہ مکرمہ روانہ ہوئے۔ یہ سب مسلمان نہیں تھے اور نہ ہی ان میں سے اکثریت مسلمانوں کی تھی بلکہ ان میں محض 74 مسلمان تھے۔ ان مسلمانوں میں دو خواتین بھی شامل تھیں جن میں سے ایک کے ہاں دورانِ حج مکہ مکرمہ میں بچے کی پیدائش بھی ہوئی۔ مدینہ منورہ سے آنے والے مسلمانوں کے ساتھ نبی مکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ملاقات کا اہتمام چاند کی چودھویں رات کو منیٰ میں کیا گیا اور مدنی مسلمان انتہائی رازداری کے ساتھ ملاقات کیلئے پہنچے کہ ان کے کیمپ میں مقیم دیگر افراد کو اس بات کا قطعی علم نہ ہو سکا۔ انہوں نے ایک ایک کر کے محمد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے اسلام لانے کا اقرار کیا اور آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت (معاہدہ واقرار) کا شرف حاصل کیا [یہ دوسری بیعت عقبہ کہلاتی ہے "معجم البلدان" جلد چہارم صفحہ 134 پر علامہ یاقوت حموی لکھتے ہیں کہ منیٰ اور مکہ کے درمیان ایک اونچا ٹیلہ ہے جو عقبہ کے نام سے موسوم ہے۔ یہاں سے مکہ مکرمہ دو میل کے فاصلہ پر ہے۔ عقبہ کا لغوی مفہوم ہے وہ راستہ جو پہاڑ کی چوٹی کی طرف جاتا ہے] انہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا "ہم بالکل اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تحفظ کریں گے جس طرح ہم اپنے اہل خانہ کا تحفظ کرتے ہیں چاہے اس کے لئے ہمیں تمام مخالف دنیا سے ہی جنگ کیوں نہ کرنا پڑے۔ ہم ہر حال میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ساتھ دیں گے چاہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مدمقابل ہمارے اپنے رشتہ دار ہوں یا اجنبی" پھر انہوں نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مکی پیروکاروں کو مدینہ منورہ آنے کی دعوت دی تاکہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی میزبانی وحفاظت کا شرف حاصل کرسکیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتہائی عقل مند چچا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھے۔ انہوں نے مدنی مسلمانوں کی دعوت کا جواب دیتے ہوئے فرمایا "اس امر میں کوئی شک نہیں کہ تمہیں ساری دنیا سے جنگ کا سامنا ہوگا لہٰذا اگر تم نے مدینہ بلانے کے بعد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بے یارومددگار چھوڑنا ہے تو اس سے بہتر یہی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مدینہ منورہ آنے کی دعوت بالکل نہ دو کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہاں اپنے خاندان میں محفوظ ہیں ...." اس پر مدنی مسلمانوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے اپنی بے پایاں عقیدت اور خلوص کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سنجیدگی کے ساتھ دعوت دے رہے ہیں اور اس دعوت سے پیدا ہونے والے خطرات کا بھی پوری طرح احساس رکھتے ہیں (اور یہ کہ ہم وفاداری کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تحفظ کرنا جانتے ہیں) اس پر سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مطمئن ہوگئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "آج کے بعد تمہارا خون میرا خون ہے۔ تمہارا خون بہنے کا مفہوم میرا خون بہنا ہے۔ میں تمہارا ہوں اور تم میرے ہو۔"

(133) منیٰ کے واقعات کی غیر تصدیق شدہ افواہ مشرکین مکہ کو بھی پہنچی اور انہوں نے اس سے خطرہ محسوس کیا۔ دراصل ان کی تجارت کے مدینے سے گزرنے والے شمالی راستے بند ہوسکتے تھے۔ مزید یہ کہ مدنی قبائل کی مدد سے مکہ مکرمہ پر فوج کشی کا بھی امکان تھا۔ چنانچہ مشرکین مکہ

کے نمائندے مدنی افراد کے کیمپ میں آئے اور معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اتفاقاً انہوں نے مدینہ منورہ کے مشرکین سے رابطہ کیا۔ جنہوں نے حلف اُٹھا کر بتایا کہ انہیں ایسی کسی ملاقات یا واقعے کا علم نہیں اور یہ کہ ان کے علم میں لائے بغیر ایسا کوئی بھی اجتماع نہیں ہو سکتا (اور وہ اپنی اس بات میں سچے تھے کیونکہ واقعی انہیں کوئی خبر نہ تھی) اس پر مکی مشرکین کے نمائندے مطمئن ہو کر واپس چلے گئے تاہم بعد میں انہیں مدنی مسلمانوں اور نبیٔ آخر الزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مابین معاہدے کی تفصیلات کا پتہ چل گیا مگر اس وقت تک مدنی مسلمان منیٰ سے واپس جا چکے تھے۔ تاہم آخر میں جانے والا ایک مدنی مسلمان اُن کے قابو آ گیا جس سے انہوں نے معاہدے کی خبر لینے کے لئے اس کی خوب خبر لی لیکن بعد میں انہوں نے محسوس کیا کہ اس شخص کے کسی قسم کے نقصان کی صورت میں اس کا سارا قبیلہ مشرکین مکہ کے خلاف ہو جائے گا چنانچہ اُسے چھوڑ دیا گیا۔

(134) مکہ مکرمہ کے مسلمان مختصر گروپوں کی شکل میں خاموشی کے ساتھ مدینہ منورہ روانہ ہونا شروع ہوئے جہاں اُن کا خیر مقدم کیا گیا۔ تقریباً دو مہینوں کے عرصہ ہی میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اوران دونوں کے اہل بیت و اہل خانہ کے ساتھ ساتھ زبردستی روک لئے گئے اور قید کیے گئے نوعمر مسلمان بچوں اور غلاموں کے علاوہ اور کوئی مسلمان مکہ مکرمہ میں نہیں رہا تھا۔ ایک بہت اچھا مسلمان زرگر بھی مکہ مکرمہ میں تھا جس نے قبولیتِ اسلام کو ظاہر نہیں کیا تھا وہ جان بوجھ کر مکہ مکرمہ میں رہائش پذیر رہا۔ شاید وہ رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ایجنٹ کے طور پر مکہ میں رہ رہا تھا تاکہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو مکہ مکرمہ کی صورت حال کی خبر پہنچا سکے۔ البلاذری (مشہور سیرت نگار) کے مطابق وہ مسلمانوں کے لئے خفیہ طور پر یہ کام کرتا تھا کہ مدینہ منورہ سے جو ایجنٹ مکہ مکرمہ بھیجے جاتے تھے وہ انہیں اپنی حفاظت و پناہ میں چھپا لیتا تھا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی اسی طرح مکہ مکرمہ پہنچے تاہم ان کا معاملہ قدرے مختلف ہے۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مقدس چشمہ زمزم کے محافظ و نگران تھے اور یوں آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکہ مکرمہ کی حکمران کونسل کے دس (10) معزز اراکین میں سے ایک رکن تھے۔

(135) مشرکین مکہ نے غصہ میں آ کر مدینہ منورہ ہجرت کر جانے والے مسلمانوں کی املاک پر قبضہ کر لیا۔ انہوں نے باہمی مشورہ کے لئے ایک مجلس کا انعقاد کیا جو تاریخ میں ''یوم الزحمہ'' (یعنی بہت بڑے اجتماع کا دن، ''الزحمہ'' کے لغوی معنی ہیں ''ہجوم'') کے نام سے معروف ہے۔

اس مجلس مشاورت میں (بظاہر مؤثر مگر خام خیالی پر مبنی) ایک قرار داد منظور کی گئی وہ یہ کہ "محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو قتل کر دیا جائے (نعوذ باللہ) مگر اس قتل میں ایک یا دو افراد کی بجائے مکہ مکرمہ کے تمام قبیلوں سے منتخب نوجوان شامل ہوں۔ چونکہ قتل کی ذمہ داری تمام قبیلوں پر عائد ہوگی اس لئے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا قبیلہ قاتلوں کے خلاف اعلانِ جنگ نہیں کر سکے گا اور اُسے صرف خون بہا ہی لینا پڑے گا جبکہ خون بہا کی رقم کو آسانی سے اکٹھا اور ادا کیا جا سکے گا۔" مشرکین مکہ کا یہ منصوبہ اتنا ناپختہ تھا کہ اسے راز میں رکھنا ممکن ہی نہیں تھا چنانچہ ایک دن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک خالہ دوڑی ہوئی آئیں اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتایا کہ انہیں رات کے وقت قتل کرنے کی سازش تیار کر لی گئی ہے۔ یہ سب کچھ شاید اس نے اپنے شوہر کے خاندان والوں سے سنا تھا۔

﴿قرآن الحکیم میں ارشادِ رب العزت ہے:

وَاِذْ یَمْكُرُ بِكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْكَ اَوْ یَقْتُلُوْكَ اَوْ یُخْرِجُوْكَ ؕ وَیَمْكُرُوْنَ وَیَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَیْرُ الْمٰكِرِیْنَ۝

(الانفال:30)

"(قبل ہجرت) داؤ کرتے تھے یہ کافر (مکروفن)
قتل کر دیں، قید کر لیں تم کو، کر دیں بے وطن
داؤ وہ بھی کرتے تھے اور کرتا تھا۔ اللہ بھی
سب سے بہتر داؤ کرنے والا ہے اللہ ہی"﴾

(136) رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوپہر کے وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالٰی عنہ کے گھر تشریف لے گئے اور انہیں اپنی اس (خلافِ معمول) غیر متوقع آمد کا مقصد بتایا۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ مکہ مکرمہ سے ہجرت کی جائے۔ یہ (قمری مہینے) ربیع الاوّل کے ابتدائی دن تھے اور ان دنوں کی راتیں چاند کی چاندنی سے محروم ہوتی ہیں۔ دونوں (دوستوں) کو رات کے اندھیرے میں مکہ مکرمہ سے نکل کر ایک نواحی پہاڑ "ثور" کے غار تک پہنچنا تھا۔ وہاں رات گزارنے کے بعد اس وقت مدینہ منورہ کو روانہ ہونا تھا جب مکہ مکرمہ میں سکون بحال ہو جائے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالٰی عنہ نے سواری اور گائیڈ (راستے کا

رہنما) کے انتظام کی ذمہ داری لے لی۔ رسولِ مکرم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے لے پالک بیٹے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ وہ رات کے لمحات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر سو جائیں۔ امینِ اکبر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (مکی افراد کی) تمام امانتیں بھی حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دے دیں تاکہ وہ اصل مالکان تک پہنچائی جائیں اور پھر حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ امانتیں واپس کرنے کے بعد مدینہ منورہ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس پہنچیں۔ ان انتظامات کے بعد سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر دوبارہ پہنچے۔ کافی رات ڈھلنے کے بعد دونوں (دوست) مکان کے عقبی حصہ کی ایک کھڑکی سے باہر نکلے اور جلد ہی انہوں نے ثور پہاڑ کی جانب اونچائی والے راستے پر چڑھنا شروع کر دیا۔ راستے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک دوست نے پہچان لیا مگر وہ اس کے شک وشبہ کو رفع کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ روایات کے مطابق جب دونوں (دوست) کوہِ ثور کے مطلوبہ مقام پر پہنچے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پہلے غار میں داخل ہوئے تاکہ غار کی صفائی کر سکیں۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنا کرتہ پھاڑ کر غار کے تمام سوراخ بند کئے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان میں سے کوئی سانپ نکل آئے مگر آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس احتیاط کے باوجود ایک سانپ نکل آیا اور اس نے حضرت (عبداللہ) ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایڑی پر ڈس لیا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تکلیف برداشت کرنے کی کوشش کی مگر آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو کر رسولِ رحمت حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرۂ مبارک پر گرے جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نیند سے بیدار ہو گئے (کیونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زانو پر سر رکھ کر آرام فرما رہے تھے) جب سرور کونین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس بات کا پتہ چلا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سانپ کی ڈسی ہوئی جگہ پر اپنا لعاب دہن ملا جس سے حضرت (عبداللہ) ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تکلیف رفع ہو گئی۔ (اسی دوران) ایک مکڑی نے غار کے دہانے پر جالا بُن دیا۔ اگلی صبح کو کبوتروں کے ایک جوڑے نے وہاں ایک گھونسلا بنا دیا اور اس میں انڈے بھی دے دیئے۔ اہتمام یہ کیا گیا تھا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک صاحبزادی (حضرت اسماء

رضی اللہ تعالیٰ عنہا) روزانہ غار میں کھانا پہنچایا کرے گی جبکہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک بیٹا (حضرت عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہم) رات کو وہاں پہنچ کر مکہ مکرمہ کی صورت حال سے مطلع کرے گا۔ نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روپوشی سے ان کے اہل بیت و اہل خانہ کو قدرے پریشانی تو ضرور ہوئی مگر کوئی سنجیدہ واقعہ پیش نہیں آیا۔ مشرکین مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی جگہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اہل بیت کو سزا دینے سے پرہیز کیا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ جو نوجوان پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے قتل کے لئے تیار کئے گئے تھے وہ ساری رات آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے گھر کے باہر کھڑے رہے لیکن اندر داخل ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو بستر پر ہی قتل نہیں کیا (نعوذ باللہ) حالانکہ ان کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی شاید یہ عرب کے رواج یا توہم پرستی کی وجہ سے انہوں نے ایسا کیا۔ ان کا خیال تھا کہ صبح سویرے جب نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نماز فجر ادا کرنے کے لئے کعبۃ اللہ تشریف لے جائیں گے تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر حملہ کر کے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو قتل کر دیں گے۔ (نعوذ باللہ)

(137) مشرکینِ مکہ نے خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تلاش شروع کر دی۔ انہوں نے (پاؤں کے نشانات کی مدد سے کھوج (سراغ) لگانے والے) ایک کھوجی کی مدد حاصل کی۔ یہ کھوجی مشرکین مکہ کو (پاؤں کے نشانات دیکھتا ہوا) غار ثور تک لے گیا مگر وہاں مکڑی کے جالے اور کبوتر کے انڈوں نے مشرکین مکہ کو دھوکہ دیا۔ تین دن (کی بے سود تلاش) کے بعد مشرکین مکہ کو یقین ہو گیا کہ سردار الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مکہ مکرمہ کی حدود میں نہیں ہیں۔ انہوں نے اگرچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو گرفتار کرنے والے شخص کے لئے انعام کا اعلان تو ضرور کیا مگر تلاش و نگرانی کم ہو گئی۔ جب پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے غار ثور کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا تو دو 2 اونٹنیاں اور ایک گائیڈ (عبداللہ بن اریقط) وہاں پہنچ گئے۔ ان کا انتظام یارِ غار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کیا تھا۔ (آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جس اونٹنی پر سوار ہوئے اس کا نام الجدعاء تھا) اور اس طرح یہ چھوٹا سا قافلہ مدینہ منورہ کی جانب روانہ ہوا۔ اگرچہ راستے کا رہنما

جان بوجھ کر مشہور راستوں کی بجائے غیر معروف راستوں پر سفر کرتا رہا تاکہ مشرکین مکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچ نہ سکیں مگر اس کے باوجود بھی سراقہ بن مالک مدلجی نے انہیں دیکھ لیا اور پہچان لیا۔ دراصل وہ مشرکین مکہ کے اعلان کئے گئے انعام کے لالچ میں وہاں پہنچا تھا۔ وہ ایک توہم پرست شخص تھا۔ اس نے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نقصان پہنچانے سے پہلے تیر سے فال نکالی تو فال اس کے حق میں نہ نکلی۔ [زمانہ جہالت میں عربوں کا دستور تھا کہ جب کوئی اہم کام کرنے لگتے تو وہ اپنے تھیلے میں رکھے ہوئے تیروں سے فال نکال کر اس کے مطابق عمل کرتے۔ ایک تیر پر لکھا ہوتا تھا ''میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے'' دوسرے تیر پر لکھا ہوتا تھا ''میرے رب نے منع کیا ہے۔'' ان کے علاوہ خالی تیر ہوتے۔ اگر پہلا تیر نکلتا تو وہ کام کرتے۔ دوسرا نکلتا تو رک جاتے۔ تیسری قسم کا نکلتا تو ازسرنو فال نکالتے یہاں تک کہ پہلا یا دوسرا تیر نکلتا۔

(''سبل الہدیٰ'' جلد سوم صفحہ 352)]

چنانچہ وہ اس قافلے کی راہ روکنے سے گریزاں رہا۔ پھر جب وہ ریت میں اپنے گھوڑے کے ٹھوکر کھانے سے نیچے گر گیا تو اس نے نہ صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوست (حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو نقصان پہنچانے کا خیال مکمل طور پر ترک کر دیا بلکہ ان سے معافی طلب کرنے کے ساتھ ساتھ مہمان نوازی کی پیش کش کی۔ مگر اس کی اس پیش کش کا شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا گیا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آٹھ دن کا تھکا دینے والا لمبا سفر کیا۔ کسی روز انہیں اپنے ساتھ لئے ہوئے زادِ راہ سے بہتر کھانے پینے کو مل جاتا۔ راستے میں انہوں نے ایک بوڑھی خاتون ام معبد کے خیمے میں اتنی بوڑھی بکری دیکھی جو چراگاہ تک بھی نہیں جا سکتی تھی مگر اس روز اس بکری نے معجزاتی طور پر اتنا دودھ دیا جو نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قافلہ کے ساتھ ساتھ اس چرواہا خاتون کے خاندان کے لئے بھی کافی تھا۔ راستے میں ایک اور واقعہ ہوا وہ یہ کہ ینبوع کے قریب بنو اسلم کے لوگوں نے قافلہ کو پریشان کرنے کی کوشش کی کیونکہ نبیٔ رحمت حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقت بنو اسلم کے علاقہ سے گزر رہے تھے۔ مگر قبیلہ کے سردار نے جیسے ہی قرآن مجید کی دل پذیر و دل کش

آیات سنیں تو وہ مشرف بہ اسلام ہو گیا۔ جس کے بعد اس نے خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھیوں کو ''گارڈ آف آنر'' پیش کیا اور پھر محافظین کا یہ دستہ اس قافلے کو اپنی علاقائی حدود کے اختتام تک بحفاظت چھوڑ آیا۔

(138) مدینہ منورہ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی (مکہ مکرمہ سے) ہجرت (اور مدینہ منورہ میں آمد) کی اطلاع پہنچ چکی تھی اور شہر کے لوگ بے چینی و بے تابی کے ساتھ ہادیٔ کون و مکاں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی آمد کے انتظار میں تھے۔ وہ مدینہ منورہ کے جنوب میں قُبا کے قریب ایک اونچی پہاڑی ''ثنیاتِ الوداع'' پر روزانہ اکٹھے ہوتے اور تمام دن آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی آمد کے منتظر رہتے۔ ایک گرم دن (سوموار 12 ربیع الاوّل، 31 مئی 622ء) کو جبکہ لوگ مایوس ہو کر اس پہاڑی سے واپس جا چکے تھے۔ کسی نے شہر کے ایک بلند مینار سے کچھ فاصلے پر ایک مختصر سا قافلہ شہر کی جانب آتے دیکھا۔ چنانچہ رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے استقبال کے لئے لوگ دوبارہ اکٹھے ہوئے۔ انہوں نے بہترین لباس پہن رکھا تھا اور مکمل طور پر مسلح تھے۔ لڑکوں اور لڑکیوں نے ''دف'' تھامے ہوئے تھے اور بے مثل تاریخی عقیدت وخلوص کے ساتھ ہم آواز ہو کر ایک خیر مقدمی نظم گا رہے تھے۔

طلع البدر علینا من ثنیاتِ الوداع

''ثنیاتِ الوداع (وہ چوٹی جہاں مہمانوں کو الوداع کہی جاتی ہے) سے چودھویں کے چاند نے ہم پر طلوع فرمایا ہے۔

وجب الشکر علینا مادعا للہ داع

جب تک اللہ تبارک وتعالیٰ کو پکارنے والا اس ذات پاک کو پکارتا رہے گا ہم پر لازم ہے کہ ہم اس نعمت کا شکر ادا کرتے رہیں۔

ایھا المبعوث فینا جئت بالا مرالمطاع

اے ہمارے پاس نبی (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) بن کر تشریف لانے والے! آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) اس طرح تشریف لے آئے ہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے ہر حکم کی اطاعت کی جائے گی۔''

(139) شافع محشر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے قُبا کے قریب پہنچ کر کھجور کے

درختوں کے ایک جھنڈ کے سائے میں قدرے آرام فرمایا۔ یہاں یکے بعد دیگرے لوگوں کے گروپ آتے رہے اور سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر سلام عقیدت پیش کرتے رہے اور یوں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خیر مقدم ہوتا رہا۔ جلد ہی معلم کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (لوگوں کے ساتھ مل کر) یہاں ایک جھونپڑی کی تعمیر میں حصہ لیا جو مسجد کے طور پر استعمال کی جاتی تھی۔ رسولِ مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز پنجگانہ کی امامت فرماتے۔ اپنا باقی وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تبلیغ و اشاعت اسلام میں گزارتے۔ لوگوں کو نیکی کی تلقین کرتے اور احسان کی ترغیب فرماتے مزید یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مقامی افراد کے ساتھ ساتھ بے روزگار مکی مہاجرین کے مسائل حل کرنے کی کوشش فرماتے۔ نبیٔ آخر الزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چند روز بعد قُبا سے نزدیکی اپنی عارضی قیام گاہ سے نکل کر مستقل رہائش گاہ کی تلاش شروع کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہر قدم پر وفود آتے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان کے ہاں قیام کرنے کی درخواست کرتے مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک ہی جواب دیتے کہ ''میری اونٹنی ہی میری رہائش کے لئے جگہ منتخب کرے گی۔ اسے بغیر رکاوٹ کے جانے دو۔ یہ جس جگہ بیٹھ جائے گی میں نیچے اُتر آؤں گا۔'' کئی کلومیٹر کا سفر طے کرنے کے بعد اونٹنی ایک کھلی جگہ پر بیٹھ گئی۔ رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی اونٹنی (جس کا نام ''قصواء'' تھا) کو ایڑ لگا کر اُٹھایا تو وہ چند قدم چلنے کے بعد واپس پہلی جگہ پر آ کر بیٹھ گئی۔ رب کریم و رحیم نے اس جگہ کو منتخب فرما لیا تھا۔ جس جگہ اونٹنی پہلے بیٹھی تھی اور اُٹھانے پر جہاں تک جا کر واپس سابقہ جگہ پر آ گئی تھی اس درمیانی فاصلے کے زمینی ٹکڑے کو پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے لئے منتخب کرنا تھا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زمین کا وہ حصہ خرید لیا تاکہ وہاں ایک مسجد کے ساتھ ساتھ چند ایسے کمرے بنائے جا سکیں جن میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت رہائش پذیر ہو سکیں۔ اس قطعہ زمین [یہ ایک کھلا قطعہ زمین تھا جسے ''مربد'' کہتے تھے۔ اہل مدینہ یہاں اپنی کھجوریں دھوپ میں خشک ہونے کیلئے ڈال دیتے تاکہ انہیں آسانی سے ذخیرہ کیا جا سکے] کے قریب حضرت ایوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ (حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو استنبول میں ابدی نیند سو رہے ہیں) کا مکان تھا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے دادا حضرت عبدالمطلب کی والدہ ماجدہ کے قبیلہ سے تھے۔ اس غیر متوقع اور رب رحمٰن ورحیم کے بھیجے ہوئے مہمان کی آمد پر آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بے پایاں مسرت وشادمانی ہوئی۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبیٔ آخرالزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سامان اُٹھایا اور اپنے گھر لے گئے یوں سردار الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کی تعمیر کی تکمیل تک حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے محبوب خدا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی میزبانی کا شرف حاصل کیا۔

بے گھر افراد (مہاجرین) کی آبادکاری:

(140) اگر چہ سینکڑوں کی تعداد میں مکی مسلمان مدینہ منورہ میں پناہ حاصل کر چکے تھے مگر یہاں ان کی عملاً کوئی جائیداد نہیں تھی۔ اس لئے انہیں مقامی معیشت میں داخل کرنے کی شدید ضرورت تھی۔ خود ہادیٔ کون ومکاں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے بھی کسی حد تک یہی مسئلہ تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ مکرمہ سے کچھ نقدی لائے تھے جس سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کئی اونٹنیاں اور بکریاں خریدکیں یوں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روزانہ کے مہمانوں کی ضروریات عمدگی کے ساتھ پوری ہونے لگیں۔ کھانے کے وقت جو شخص بھی موجود ہوتا سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُسے کھانے میں شرکت کی دعوت دے دیتے۔ کئی مدنی مسلمانوں نے اپنے اپنے باغ میں ایک ایک کھجور کا درخت سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیش کر دیا۔ بعدازاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ، خیبر اور فدک میں زرعی زمینیں خریدکیں۔ یہ زمینیں مسلم مملکت کی ملکیت تھیں۔ ان کی پیداوار سے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی اور اپنے اہل بیت کی ضروریات پوری کرنے کے بعد باقی رقم بیت المال کے حوالے کر دیتے تاکہ غریب اور ضرورت مند مسلمانوں کے کام آسکے۔ مدینہ کا ایک خاندان رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں اپنے جذباتِ خلوص وعقیدت پیش کرنے کے لئے حاضر ہوا۔ انہوں نے اپنا دس سالہ فرزند "انس" سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتی خدمت کے لئے پیش کیا۔ اس خاندان کو اپنے بیٹے کے اس کم عمری میں لکھنا پڑھنا جاننے پر فخر وناز تھا۔

(141) رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکی مہاجرین کی فلاح وامداد

کی خاطر ایک اجلاسِ عام بلایا۔ جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تجویز دی کہ مدینہ منورہ کے برسر روزگار اور باحیثیت مسلمان ایک ایک مکی (مہاجر مسلمان) کو اپنا بھائی بنا لیں۔ اور دونوں بھائیوں کے خاندان اکٹھے مل کر کام کریں اور روزی کمائیں اور حتیٰ کہ دوسرے رشتہ دار بھائیوں کی طرح ترکہ میں بھی حصہ دار ہوں۔ رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تجویز سے سب لوگ متفق ہوئے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بذات خود ہر ایک کی ذاتی خوبیوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک مکی کو ایک مدنی کا بھائی بنا دیا۔ (یہ واقعہ ''مواخات'' کہلاتا ہے جس کے معنی ہیں بھائی چارہ قائم کرنا یا ہونا) یہ انتظام واہتمام کئی سال تک جاری رہا تاہم مکی مسلمان یہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ مدنی مسلمانوں پر کسی قسم کا بوجھ بنیں چنانچہ جب انہوں نے محنت و مشقت سے کافی دولت کمالی تو انہوں نے اپنے میزبان مدنی بھائیوں کی املاک شکریہ کے ساتھ واپس کر دیں اور یوں ہر مکی مہاجر آزاد ہو گیا۔

(142) چند مثالیں قابل غور ہیں: حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے مدنی بھائی (حضرت عتبان بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سے کہا ''ایک دن میں آپ کے باغ میں کام کروں گا اور آپ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس میں دن گزاریں گے اور شام کو مجھے وہاں کی تمام کارروائی یعنی نازل ہونے والی نئی آیات قرآن، سیاسی و معاشرتی فیصلے وغیرہ بتائیں گے۔ اگلے روز میں دربار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر رہوں گا اور آپ باغ میں کام کریں گے (جبکہ شام کو وہاں کی تمام کارگزاری میں آپ کو بتاؤں گا) ایک اور مکی حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان کے مدنی بھائی (حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے کہا ''یہ میری جائیداد ہے۔ آدھی آپ کی ہوئی۔ میری دو بیویاں ہیں۔ ان میں سے جسے آپ چاہیں منتخب کر لیں۔ میں اسے طلاق دے دوں گا اور آپ اس سے شادی کر لیں..........'' اس پر حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا ''اللہ تبارک و تعالیٰ آپ کو آپ کی جائیداد اور اہل خانہ مبارک کرے۔ مجھے صرف مقامی منڈی کا راستہ بتا دیجئے..........'' وہاں سے انہوں نے کچھ چیزیں اُدھار پر خرید کیں اور اسی وقت فروخت کر دیں۔ تمام دن انہوں نے ایسا کئی بار کیا۔ شام کو انہوں نے نہ صرف قرض واپس کر دیا بلکہ اتنا کمایا کہ رات کا کھانا خرید سکیں۔ چند روز بعد انہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضری دی۔ انہوں نے نیا اور قیمتی لباس پہنا ہوا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہوں نے

حال ہی میں شادی کی ہے۔ جلد ہی وہ (حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ) شہر کے امیر ترین تاجروں میں شمار ہونے لگے۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بڑے سخی، غرباء کی مدد کرنے والے اور دینِ اسلام (کے فروغ) کے لئے کام کرنے والے تھے۔

اہلِ مکہ کا ردِ عمل:

(143) شافع محشر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مکہ مکرمہ سے یوں بحفاظت چلے جانے کے معاملہ کو مشرکین مکہ نے انتہائی سنجیدگی سے لیا۔ انہوں نے ایک وفد مدینہ منورہ بھیجا اور مطالبہ کیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مدینہ منورہ سے نکال دیا جائے یا اُن کے حوالے کر دیا جائے جبکہ ایسا کرنے سے انکار کی صورت میں سنگین نتائج کی دھمکی دی۔ مشرکین مکہ کا یہ وفد ناکام و نامراد لوٹا لیکن ہر شخص اس بات پر متفق تھا کہ پریشانی کا سامنا ضرور ہو گا لہٰذا دفاع اور سلامتی کے لئے اقدامات ضروری ہیں۔ درحقیقت اس واقعہ سے دو اہم اور دور رس نتائج نکلے۔ ایک یہ کہ مدنی ریاست کا آئین مرتب ہوا۔ دوسرا یہ کہ مدینہ منورہ کے ارد گرد "بفراسٹیٹ" (دو بڑی ریاستوں کے درمیان ایک چھوٹی مگر غیر جانبدار ریاست یعنی "فاصل ریاست") کا قیام عمل میں آیا۔

مدینہ منورہ میں شہری ریاست:

(144) رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ کے مسلم اور غیر مسلم باشندوں کا ایک اجلاس عام اپنے ذاتی ملازم حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے والد کے گھر پر طلب کیا۔ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق اس اجلاس میں سرکار دو عالم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تجویز دی کہ مدینہ کے باشندوں کے اندرونی جھگڑوں کے خاتمہ اور کسی بیرونی حملہ آور کی حوصلہ شکنی کے لئے مدینہ منورہ کے علاقہ میں ایک شہری ریاست کا قیام عمل میں لایا جائے جس کی شکل ایک کنفیڈریشن (خودمختار ریاستوں یا صوبوں کا اتحاد) کی ہو جس میں تمام یونٹوں (چھوٹی ریاستوں) کو وسیع خودمختاری حاصل ہو گی۔ (حکومتی کی بجائے) پرائیویٹ سطح پر انصاف (فیصلوں) کی فراہمی پر پابندی ہو گی اور (کسی جرم کے حوالے سے دی گئی سزا کے خلاف) ریاست کے سربراہ سے اپیل کی جا سکے گی اور یہ کہ سربراہ ریاست کو جنگ یا امن کے دوران کسی مہم کی خاطر افراد کے قطعی انتخاب کا اختیار حاصل ہو گا۔

سماجی و معاشرتی تحفظ کی خاطر ایک ٹھوس اور مضبوط نظام قائم ہوگا۔ یوں قتل کے مجرم کو سزائے موت نہ دینے کی صورت میں جاری رقم کی ادائیگی کا پابند کیا جائے گا نیز جنگی قیدیوں کی رہائی پر بھی فدیہ لیا جائے گا۔ معاہدے کی تمام دفعات پر متفق ہونے کے بعد انہیں تحریر کیا گیا جو کسی سربراہ ریاست کی طرف سے جاری اور نافذ ہونے والا دنیا کا پہلا تحریری دستور ہے۔ اس تاریخی دستاویز کو یہاں بیان کرنا بے جا نہ ہوگا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

١۔ هٰذَا كِتَابٌ مِنْ مُحَمَّدٍ النَّبِيِّ (رَسُوْلِ اللّٰهِ) بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قُرَيْشٍ (وَأَهْلِ) يَثْرِبَ وَمَنْ تَبِعَهُمْ فَلَحِقَ بِهِمْ وَجَاهَدَ مَعَهُمْ۔

٢۔ إِنَّهُمْ أُمَّةٌ وَاحِدَةٌ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ

٣۔ اَلْمُهَاجِرُوْنَ مِنْ قُرَيْشٍ عَلٰى رَبْعَتِهِمْ يَتَعَاقَلُوْنَ بَيْنَهُمْ وَهُمْ يَفْدُوْنَ عَانِيَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَالْقِسْطِ بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ

٤۔ وَبَنُوْ عَوْفٍ عَلٰى رَبْعَتِهِمْ يَتَعَاقَلُوْنَ مَعَاقِلَهُمُ الْأُوْلٰى وَكُلُّ طَائِفَةٍ تَفْدِيْ عَانِيَهَا بِالْمَعْرُوْفِ وَالْقِسْطِ بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ

٥۔ وَبَنُو الْحَارِثِ (بْنِ الْخَزْرَجِ) عَلٰى رَبْعَتِهِمْ يَتَعَاقَلُوْنَ مَعَاقِلَهُمُ الْأُوْلٰى وَكُلُّ طَائِفَةٍ تَفْدِيْ عَانِيَهَا بِالْمَعْرُوْفِ وَالْقِسْطِ بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔

۶۔ وَبَنُو سَاعِدَةَ، عَلٰى رَبْعَتِهِمْ يَتَعَاقَلُونَ مَعَاقِلَهُمُ الْاُوْلٰى وَكُلُّ طَائِفَةٍ تَفْدِىْ عَانِيَهَا بِالْمَعْرُوْفِ وَالْقِسْطِ بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔

۷۔ وَبَنُو جُشَمٍ، عَلٰى رَبْعَتِهِمْ يَتَعَاقَلُونَ مَعَاقِلَهُمُ الْاُوْلٰى وَ كُلُّ طَائِفَةٍ تَفْدِىْ عَانِيَهَا بِالْمَعْرُوْفِ وَالْقِسْطِ بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ

۸۔ وَبَنُو النَّجَّارِ، عَلٰى رَبْعَتِهِمْ يَتَعَاقَلُونَ مَعَاقِلَهُمُ الْاُوْلٰى وَكُلُّ طَائِفَةٍ تَفْدِىْ عَانِيَهَا بِالْمَعْرُوْفِ وَالْقِسْطِ بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔

۹۔ وَبَنُو عَمْرِو بْنِ عَوْفٍ، عَلٰى رَبْعَتِهِمْ يَتَعَاقَلُونَ مَعَاقِلَهُمُ الْاُوْلٰى وَكُلُّ طَائِفَةٍ تَفْدِىْ عَانِيَهَا بِالْمَعْرُوْفِ وَالْقِسْطِ بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔

۱۰۔ وَبَنُو النَّبِيْتِ عَلٰى رَبْعَتِهِمْ يَتَعَاقَلُونَ مَعَاقِلَهُمُ الْاُوْلٰى وَكُلُّ طَائِفَةٍ تَفْدِىْ عَانِيَهَا بِالْمَعْرُوْفِ وَالْقِسْطِ بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔

۱۱۔ وَبَنُو الْاَوْسِ عَلٰى رَبْعَتِهِمْ يَتَعَاقَلُونَ مَعَاقِلَهُمُ الْاُوْلٰى وَ كُلُّ طَائِفَةٍ تَفْدِىْ عَانِيَهَا بِالْمَعْرُوْفِ وَالْقِسْطِ بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔

۱۲۔ وَاِنَّ الْمُؤْمِنِيْنَ لَا يَتْرُكُوْنَ مُفْرَحًا بَيْنَهُمْ اَنْ يُّعْطُوْهُ بِالْمَعْرُوْفِ فِىْ فِدَاءٍ اَوْ عَقْلٍ۔

۱۲ ب ۔ وَاَنْ لَا يُحَالِفَ مُؤْمِنٌ مَوْلٰى مُؤْمِنٍ دُوْنَهٗ

۱۳ ۔ وَاِنَّ الْمُؤْمِنِيْنَ الْمُتَّقِيْنَ اَيْدِيْهِمْ عَلٰى كُلِّ مَنْ بَغٰى مِنْهُمْ اَوِ ابْتَغٰى دَسِيْعَةَ ظُلْمٍ اَوْ اِثْمًا، اَوْ عُدْوَانًا، اَوْ فَسَادًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِنَّ اَيْدِيَهُمْ عَلَيْهِ جَمِيْعًا وَلَوْ كَانَ وَلَدَ اَحَدِهِمْ ۔

۱۴ ۔ وَلَا يَقْتُلُ مُؤْمِنٌ مُؤْمِنًا فِىْ كَافِرٍ ۔ وَلَا يَنْصُرُ كَافِرًا عَلٰى مُؤْمِنٍ ۔

۱۵ ۔ وَاِنَّ ذِمَّةَ اللّٰهِ وَاحِدَةٌ يُجِيْرُ عَلَيْهِمْ اَدْنَاهُمْ وَاِنَّ الْمُؤْمِنِيْنَ بَعْضُهُمْ مَوَالِىْ بَعْضٍ دُوْنَ النَّاسِ ۔

۱۶ ۔ وَاِنَّهٗ مَنْ تَبِعَنَا مِنْ يَهُوْدٍ فَاِنَّ لَهُ النَّصْرَ وَالْاُسْوَةَ غَيْرَ مَظْلُوْمِيْنَ وَلَا مُتَنَاصِرٍ عَلَيْهِمْ ۔

۱۷ ۔ وَاِنَّ سِلْمَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاحِدَةٌ لَا يُسَالَمُ مُؤْمِنٌ دُوْنَ مُؤْمِنٍ فِىْ قِتَالٍ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِلَّا عَلٰى سَوَاءٍ وَعَدْلٍ بَيْنَهُمْ ۔

۱۸ ۔ وَاِنَّ كُلَّ غَازِيَةٍ غَزَتْ مَعَنَا يُعْقِبُ بَعْضُهَا بَعْضًا

۱۹ ۔ وَاِنَّ الْمُؤْمِنِيْنَ يُبِيْئُ بَعْضُهُمْ عَنْ بَعْضٍ بِمَا نَالَ دِمَاءَهُمْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔

۲۰ ۔ وَاِنَّ الْمُؤْمِنِيْنَ الْمُتَّقِيْنَ عَلٰى اَحْسَنِ هُدًى وَاَقْوَمِهٖ

۲۰ ب ۔ وَاِنَّهٗ لَا يُجِيْرُ مُشْرِكٌ مَالًا لِقُرَيْشٍ وَلَا نَفْسًا وَلَا يَحُوْلُ دُوْنَهٗ عَلٰى مُؤْمِنٍ ۔

٢١- وَاِنَّهٗ مَنِ اعْتَبَطَ مُؤْمِنًا قَتْلًا عَنْ بَيِّنَةٍ فَاِنَّهٗ قَوَدٌ بِهٖ اِلَّا اَنْ يَّرْضٰى وَلِيُّ الْمَقْتُوْلِ (بالعقل) وَاِنَّ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَيْهِ كَافَّةً وَّلَا يَحِلُّ لَهُمْ اِلَّا قِيَامٌ عَلَيْهِ۔

٢٢- وَاِنَّهٗ لَا يَحِلُّ لِمُؤْمِنٍ اَقَرَّ بِمَا فِيْ هٰذِهِ الصَّحِيْفَةِ وَاٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يَّنْصُرَ مُحْدِثًا اَوْ يُؤْوِيْهِ وَاَنَّ مَنْ نَصَرَهٗ اَوْ اٰوَاهُ فَاِنَّ عَلَيْهِ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَغَضَبَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهُ صَرْفٌ وَّلَا عَدْلٌ۔

٢٣- وَاِنَّكُمْ مَهْمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ مَرَدَّهٗ اِلَى اللّٰهِ وَاِلٰى مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

٢٤- وَاِنَّ الْيَهُوْدَ يُنْفِقُوْنَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ مَا دَامُوْا مُحَارِبِيْنَ

٢٥- وَاِنَّ يَهُوْدَ بَنِيْ عَوْفٍ اُمَّةٌ مَّعَ الْمُؤْمِنِيْنَ لِلْيَهُوْدِ دِيْنُهُمْ وَلِلْمُسْلِمِيْنَ دِيْنُهُمْ مَوَالِيْهِمْ وَاَنْفُسُهُمْ وَاِلَّا مَنْ ظَلَمَ وَاَثِمَ فَاِنَّهٗ لَا يُوْتِغُ اِلَّا نَفْسَهٗ وَاَهْلَ بَيْتِهٖ۔

٢٦- وَاِنَّ لِيَهُوْدِ بَنِي النَّجَّارِ مِثْلَ مَا لِيَهُوْدِ بَنِيْ عَوْفٍ

٢٧- وَاِنَّ لِيَهُوْدِ بَنِي الْحَارِثِ مِثْلَ مَا لِيَهُوْدِ بَنِيْ عَوْفٍ

٢٨- وَاِنَّ لِيَهُوْدِ بَنِيْ سَاعِدَةَ مِثْلَ مَا لِيَهُوْدِ بَنِيْ عَوْفٍ

٢٩- وَاِنَّ لِيَهُوْدِ بَنِيْ جُشَمٍ مِثْلَ مَا لِيَهُوْدِ بَنِيْ عَوْفٍ

٣٠- وَاِنَّ لِيَهُوْدِ بَنِي الْاَوْسِ مِثْلَ مَا لِيَهُوْدِ بَنِيْ عَوْفٍ

٣١- وَاِنَّ لِيَهُوْدِ بَنِيْ ثَعْلَبَةَ مِثْلَ لِيَهُوْدِ بَنِيْ عَوْفٍ اِلَّا مَنْ

ظَلَمَ وَاَثِمَ۔ فَاِنَّهٗ لَا يُوْتِغُ اِلَّا نَفْسَهٗ وَاَهْلَ بَيْتِهٖ

۳۲۔ وَاِنَّ جَفْنَۃَ بَطْنٍ مِّنْ ثَعْلَبَۃَ كَاَنْفُسِهِمْ۔

۳۳۔ وَاِنَّ لِبَنِي الشُّطَيْبَةِ مِثْلَ مَا لِيَهُوْدِ بَنِي عَوْفٍ وَاِنَّ الْبِرَّ دُوْنَ الْاِثْمِ۔

۳۴۔ وَاِنَّ مَوَالِيَ ثَعْلَبَةَ كَاَنْفُسِهِمْ

۳۵۔ وَاِنَّ بِطَانَةَ يَهُوْدٍ كَاَنْفُسِهِمْ

۳۶۔ وَاِنَّهٗ لَا يَخْرُجُ مِنْهُمْ اَحَدٌ اِلَّا بِاِذْنِ مُحَمَّدٍ (صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ)

۳۶ب۔ وَاِنَّهٗ لَا يَنْحَجِزُ عَلٰى ثَاْرِ جُرْحٍ وَاِنَّهٗ مَنْ فَتَكَ فَبِنَفْسِهٖ وَاَهْلِ بَيْتِهٖ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى اَبَرِّ هٰذَا۔

۳۷۔ وَاِنَّ عَلَى الْيَهُوْدِ نَفَقَتَهُمْ وَعَلَى الْمُسْلِمِيْنَ نَفَقَتَهُمْ وَاِنَّ بَيْنَهُمُ النَّصْرَ عَلٰى مَنْ حَارَبَ اَهْلَ هٰذِهِ الصَّحِيْفَةِ وَاِنَّ بَيْنَهُمُ النُّصْحَ وَالنَّصِيْحَةَ وَالْبِرَّ دُوْنَ الْاِثْمِ۔

۳۷ب۔ وَاِنَّهٗ لَا يَاْثَمُ اِمْرُءٌ بِحَلِيْفِهٖ وَاِنَّ النَّصْرَ لِلْمَظْلُوْمِ۔

۳۸۔ وَاِنَّ الْيَهُوْدَ يُنْفِقُوْنَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ مَادَامُوْا مُحَارِبِيْنَ۔

۳۹۔ وَاِنَّ يَثْرِبَ حَرَامٌ جَوْفُهَا لِاَهْلِ هٰذِهِ الصَّحِيْفَةِ۔

۴۰۔ وَاِنَّ الْجَارَ كَالنَّفْسِ غَيْرُ مُضَارٍّ وَّلَا اٰثِمٍ۔

۴۱۔ وَاِنَّهٗ لَا تُجَارُ حُرْمَةٌ اِلَّا بِاِذْنِ اَهْلِهَا۔

۴۲۔ وَاِنَّهٗ مَا كَانَ بَيْنَ اَهْلِ هٰذِهِ الصَّحِيْفَةِ مِنْ حَدَثٍ اَوْ

اِشْتِجَارٍ يُخَافُ فَسَادُهُ فَإِنَّ مَرَدَّهُ إِلَى اللهِ وَإِلَى مُحَمَّدٍ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - وَأَنَّ اللهَ عَلَى أَتْقَى فِي هٰذِهِ الصَّحِيفَةِ وَأَبَرِّهِ -

۴۳ - وَإِنَّهُ لَا تُجَارُ قُرَيْشٌ وَلَا مَنْ نَصَرَهَا -

۴۴ - وَإِنَّ بَيْنَهُمُ النَّصْرَ عَلَى مَنْ دَهَمَ يَثْرِبَ -

۴۵ - وَإِذَا دُعُوا إِلَى صُلْحٍ يُصَالِحُونَهُ وَيَلْبَسُونَهُ فَإِنَّهُمْ يُصَالِحُونَهُ وَيَلْبَسُونَهُ وَإِنَّهُمْ إِذَا دَعَوْا إِلَى مِثْلِ ذٰلِكَ فَإِنَّ لَهُمْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِلَّا مَنْ حَارَبَ فِي الدِّينِ -

۴۵ ب - وَعَلَى كُلِّ أُنَاسٍ حِصَّتُهُمْ مِنْ جَانِبِهِمُ الَّذِي قِبَلَهُمْ

۴۶ - وَإِنَّ يَهُودَ الْأَوْسِ مَوَالِيَهُمْ وَأَنْفُسَهُمْ عَلَى مِثْلِ مَا لِأَهْلِ هٰذِهِ الصَّحِيفَةِ مَعَ الْبِرِّ الْمَحْضِ مِنْ أَهْلِ هٰذِهِ الصَّحِيفَةِ وَإِنَّ الْبِرَّ دُونَ الْإِثْمِ وَلَا يَكْسِبُ كَاسِبٌ إِلَّا عَلَى نَفْسِهِ وَإِنَّ اللهَ عَلَى أَصْدَقِ مَا فِي هٰذِهِ الصَّحِيفَةِ وَأَبَرِّهِ

۴۷ - وَإِنَّهُ لَا يَحُولُ هٰذَا الْكِتَابُ دُونَ ظَالِمٍ أَوْ آثِمٍ وَإِنَّهُ مَنْ خَرَجَ آمِنٌ وَمَنْ قَعَدَ آمِنٌ بِالْمَدِينَةِ إِلَّا مَنْ ظَلَمَ وَأَثِمَ وَإِنَّ اللهَ جَارٌ لِمَنْ بَرَّ وَاتَّقَى وَمُحَمَّدٌ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ -

رحم والے اور مہربان خدا کے نام سے۔

(۱) یہ ایک حکمنامہ ہے نبی اور اللہ کے رسول محمد کا قریش اور اہل یثرب میں سے ایمان اور اسلام لانے والوں اور ان لوگوں کے مابین جو ان کے تابع ہوں اور ان کے

ساتھ شامل ہو جائیں اور ان کے ہمراہ جنگ میں حصہ لیں۔

(۲) تمام (دنیا کے) لوگوں کے بالمقابل ان کی ایک علیحدہ سیاسی وحدت (اُمت) ہوگی۔

(۳) قریش سے ہجرت کر کے آنے والے اپنے محلے کے (ذمہ دار) ہوں گے اور اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائیں گے تا کہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

(۴) اور بنی عوف اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تا کہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

(۵) اور بنی الحارث بن خزرج اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تا کہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

(۶) اور بنی ساعدہ اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تا کہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

(۷) اور بنی جشم اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو فدیہ دے کر چھڑائے گا تا کہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

(۸) اور بنی النجار اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تا کہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

(۹) اور بنی عمرو بن عوف اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تا کہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

(۱۰) اور بنی النبیت اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تا کہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

(۱۱) اور بنی الاوس اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تا کہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

(۱۲-الف) اور ایمان والے کسی قرض کے بوجھ سے دبے ہوئے کو مدد دیے بغیر چھوڑ نہ دیں گے تا کہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

(۱۲-ب) اور یہ کہ کوئی مؤمن کسی دوسرے مؤمن کے مولا (معاہداتی بھائی) سےخود معاہدہ برداری نہیں پیدا کرے گا۔

(۱۳) اور متقی ایمان والوں کے ہاتھ ہر اس شخص کے خلاف اُٹھیں گے جو ان میں سرکشی کرے یا استحصال بالجبر کرنا چاہے یا گناہ یا تعدی کا ارتکاب کرے یا ایمان والوں میں فساد پھیلانا چاہے اور ان کے ہاتھ سب مل کر ایسے شخص کے خلاف اُٹھیں گے خواہ وہ ان میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

(۱۴) اور کوئی ایمان والا کسی ایمان والے کو کسی کافر کے بدلے قتل نہ کرے گا اور نہ کسی کافر کی ایمان والے کے خلاف مدد کرے گا۔

(۱۵) اور خدا کا ذمہ ایک ہی ہے۔ ان (مسلمانوں میں) کا ادنیٰ ترین فرد بھی کسی کو پناہ دے کر سب پر پابندی عائد کر سکے گا اور ایمان والے باہم بھائی بھائی ہیں (ساری دنیا کے) لوگوں کے مقابل۔

(۱۶) اور یہ کہ یہودیوں میں سے جو ہماری اتباع کرے گا تو اسے مدد اور مساوات حاصل ہوگی۔ نہ ان پر ظلم کیا جائے گا اور نہ ان کے خلاف کسی کو مدد دی جائے گی۔

(۱۷) اور ایمان والوں کی صلح ایک ہی ہوگی۔ اللہ کی راہ میں لڑائی ہو تو کوئی ایمان والا کسی دوسرے ایمان والے کو چھوڑ کر (دشمن سے) صلح نہیں کرے گا جب تک کہ (یہ صلح) ان سب کے لیے برابر اور یکساں نہ ہو۔

(۱۸) اور ان تمام لشکریوں کو جو ہمارے ہمراہ جنگ کریں باہم نوبت بہ نوبت چھٹی دلائی جائے گی۔

(۱۹) اور ایمان والے باہم اس چیز کا انتقام لیں گے جو خدائی راہ میں ان کے خون کو پہنچے۔

(۲۰-الف) اور بے شبہ متقی ایمان والے سب سے اچھے اور سب سے سیدھے راستے پر ہیں۔

(۲۰-ب) اور یہ کہ کوئی مشرک (غیر مسلم رعیت) قریش کی جان اور مال کو کوئی پناہ نہ دے گا اور نہ اس سلسلے میں کسی مومن کے آڑے آئے گا۔

(۲۱) اور جو شخص کسی مومن کو عمداً قتل کرے اور ثبوت پیش ہو تو اس سے قصاص لیا جائے گا بجز اس کے کہ مقتول کا ولی خون بہا پر راضی ہو جائے۔ اور تمام ایمان والے اس کی تعمیل کے لیے اُٹھیں گے اور اس کے سوائے انہیں کوئی اور چیز جائز نہ ہوگی۔

(۲۲) اور کسی ایسے ایمان والے کے لیے جو اس دستور العمل (صحیفہ) کے مندرجات (کی تعمیل) کا اقرار کر چکا ہو اور خدا اور یوم آخرت پر ایمان لا چکا ہو، یہ بات جائز نہ ہوگی کہ کسی قاتل کو مدد یا پناہ دے۔ اور جو اسے مدد یا پناہ دے گا تو قیامت کے دن اس پر خدا کی لعنت اور غضب نازل ہوں گے اور اس سے کوئی رقم یا معاوضہ قبول نہ ہوگا۔

(۲۳) اور یہ کہ جب کبھی تم میں کسی چیز کے متعلق اختلاف ہو تو اسے خدا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کیا جائے گا۔

(۲۴) اور یہودی اس وقت تک مومنین کے ساتھ اخراجات برداشت کرتے رہیں گے جب تک وہ مل کر جنگ کرتے رہیں۔

(۲۵) اور بنی عوف کے یہودی، مومنین کے ساتھ، ایک سیاسی وحدت (یا اُمت) تسلیم کیے جاتے ہیں یہودیوں کو اُن کا دین اور مسلمانوں کو اُن کا دین۔ موالی ہوں کہ اصل۔ ہاں جو ظلم یا عہد شکنی کا ارتکاب کرے تو اس کی ذات یا گھرانے کے سوائے کوئی مصیبت میں نہیں پڑے گا۔

(۲۶) اور بنی النجار کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

(۲۷) اور بنی الحارث کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

(۲۸) اور بنی ساعدہ کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

(۲۹) اور بنی جشم کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

(۳۰) اور بنی الاوس کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

(۳۱) اور بنی ثعلبہ کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔ ہاں جو ظلم یا عہد شکنی کا ارتکاب کرے تو خود (اس کی ذات) یا گھرانے کے سوائے کوئی مصیبت میں نہیں پڑے گا۔

(۳۲) اور جفنہ جو (قبیلۂ) ثعلبہ کی ایک شاخ ہے، اُسے بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کو۔

(۳۳) اور بنی الشطیبہ کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔ اور وفا شعاری ہو نہ کہ عہد شکنی۔

(۳۴) اور ثعلبہ کے موالی کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کو۔

(۳۵) اور یہودیوں (کے قبائل) کی ذیلی شاخوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کو۔

(۳۶-الف) اور یہ کہ ان میں سے کوئی بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر (فوجی کارروائی کے لیے) نہیں نکلے گا۔

(۳۶-ب) اور کسی مار، زخم کا بدلہ لینے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی اور جو خونریزی کرے تو اس کی ذات اور اس کا گھرانہ ذمہ دار ہوگا ورنہ ظلم ہوگا۔ اور خدا اس کے ساتھ ہے جو اس (دستور العمل) کی زیادہ سے زیادہ وفا شعارانہ تعمیل کرے۔

(۳۷-الف) اور یہودیوں پر ان کے خرچے کا بار ہوگا اور مسلمانوں پر ان کے خرچے کا۔

(۳۷-ب) اور جو کوئی اس دستور والوں سے جنگ کرے تو ان (یہودیوں اور مسلمانوں) میں باہم امداد عمل میں آئے گی۔ اور ان میں باہم حسن مشورہ اور وفا شعاری ہوگی نہ کہ عہد شکنی۔

(۳۸) اور یہودی اس وقت تک مؤمنین کے ساتھ اخراجات برداشت کرتے رہیں گے جب تک کہ وہ مل کر جنگ کرتے رہیں۔

(۳۹) اور یثرب کا جوف (یعنی میدان جو پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے) اس دستور والوں کے لیے ایک حرم (اور مقدس مقام) ہوگا۔

(۴۰) پناہ گزیں سے وہی برتاؤ ہوگا جو اصل (پناہ دہندہ) کے ساتھ۔ نہ اس کو ضرر

پہنچایا جائے اور نہ خود وہ عہد شکنی کرے گا۔

(۴۱) اور کسی پناہ گاہ میں وہاں والوں کی اجازت کے بغیر کسی کو پناہ نہیں دی جائے گی (یعنی پناہ دینے کا حق پناہ گزیں کو نہیں)۔

(۴۲) اور یہ کہ اس دستور والوں میں جو کوئی قتل یا جھگڑا رونما ہو جس سے فساد کا ڈر ہو تو اسے خدا کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے (جن پر خدا کی توجہ اور سلامتی ہو) رجوع کیا جائے گا اور خدا اس شخص کے ساتھ ہے جو اس دستور کے مندرجات کی زیادہ سے زیادہ احتیاط اور زیادہ سے زیادہ وفا شعاری کے ساتھ تعمیل کرے۔

(۴۳) اور قریش کو کوئی پناہ نہیں دی جائے گی اور نہ اس کو جو انہیں مدد دے۔

(۴۴) اور ان (یہودیوں اور مسلمانوں) میں باہم مدد دہی ہو گی اگر کوئی یثرب پر ٹوٹ پڑے۔

(۴۵-الف) اور اگر ان کو کسی صلح میں مدعو کیا جائے تو وہ بھی صلح کریں گے اور اس میں شریک رہیں گے اور اگر وہ کسی ایسے ہی امر کے لیے لائیں تو مومنین کا بھی فریضہ ہوگا کہ ان کے ساتھ ایسا ہی کریں، بجز اس کے کہ کوئی دینی جنگ کرے۔

(۴۵-ب) ہر گروہ کے حصے میں اسی رُخ کی (مدافعت) آئے گی جو اسکے بالمقابل ہو۔

(۴۶) اور (قبیلہ) الاؤس کے یہودیوں کو جو موالی ہوں کہ اصل، وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اس دستور والوں کو اور وہ بھی اس دستور والوں کے ساتھ خالص وفا شعاری کا برتاؤ کریں گے۔ اور وفا شعاری ہو گی نہ عہد شکنی۔ جو جیسا کرے گا ویسا خود ہی بھرے گا۔ اور خدا اس کے ساتھ ہے جو اس دستور کی مندرجات کی زیادہ سے زیادہ صداقت اور زیادہ سے زیادہ وفا شعاری کے ساتھ تعمیل کرے۔

(۴۷) اور یہ کہ حکمنامہ کسی ظالم یا عہد شکن کے آڑے نہ آئے گا۔ اور جو جنگ کو نکلے تو بھی امن کا مستحق ہو گا اور جو مدینے میں بیٹھ رہے تو بھی امن کا مستحق ہو گا ورنہ ظلم اور عہد شکنی ہو گی۔ اور خدا اس کا نگہبان ہے جو وفا شعاری اور احتیاط (سے تعمیل عہد) کرے اور اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی جن پر خدا کی توجہ اور سلامتی ہو۔

معاہدے برائے دفاع:

(145) داخلی طور پر مضبوط و مستحکم امن کے حصول کے بعد معلم کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی

اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ سے باہر آباد قبائل سے تعلق و رابطہ استوار کیا۔ ان میں خاص طور پر وہ قبائل تھے جن کے علاقوں میں سے مکہ والوں کے (تجارتی) قافلے گزر کر عراق، شام یا مصر کی طرف جاتے یا اُدھر سے آتے تھے۔ سپہ سالار اعظم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان قبائل کے ساتھ ایک دوسرے کی فوجی امداد کی بنیاد پر بیرونی حملہ کے خلاف دفاعی معاہدے کرنے میں کامیابی و کامرانی حاصل کی۔ (معاہدوں کی رو سے) مسلمانوں کے فوجی دستے ان قبائل کے علاقوں میں گشت کر سکتے تھے جبکہ مشرکین کو ایسی رعایت و اجازت حاصل نہیں تھی۔

(146) ان قبائل میں (جن کے ساتھ رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معاہدے کئے) ضمرہ، جہینہ اور مزینہ نامی قبائل شامل تھے۔ یہ قبائل بالترتیب مدینہ منورہ کے جنوب وشمال اور مغرب میں آباد تھے۔ بڑے شہر عام طور پر اردگرد آباد خانہ بدوش اور نیم خانہ بدوش قبائل کی مصنوعات اور پیداوار کی مارکیٹ ہوتے ہیں۔ مدینہ منورہ کے آس پاس رہائش پذیر ان قبائل کی معیشت کا انحصار بھی مدینہ منورہ کی مارکیٹ پر تھا اور (درحقیقت) ان کے پاس اس کا کوئی متبادل بھی نہیں تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اسلام کی آمد سے پہلے کے زمانے میں اہل مدینہ اور بعض نواحی قبائل کے مابین بھی (دفاعی) معاہدے رہے ہوں جیسا کہ قبیلہ جہینہ کے سردار کے ایک واقعہ سے یہی ظاہر ہوتا ہے (ایسا ہوا کہ) مسلمانوں کا ایک فوجی دستہ جب قریش مکہ کے ایک تجارتی قافلے کا راستہ روکنے کیلئے اس (سردار) کے علاقہ میں گیا تو قبائلی سردار مجدی ابن عمرو نے مداخلت کی کیونکہ وہ دونوں فریقوں کا اتحادی تھا۔ یوں مسلمانوں کے فوجی دستہ کو کسی قسم کی کارروائی کے بغیر ہی واپس مدینہ منورہ آنا پڑا۔

(147) جہاں تک قبیلہ بنوضمرہ کا تعلق ہے یہ حضرت ابوذر الغفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قبیلہ تھا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ظہورِ اسلام کے آغاز میں مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ مسلمانوں کا جو دفاعی معاہدہ قبیلہ بنوضمرہ سے ہوا ہوسکتا ہے اس میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا ہو۔ اس معاہدہ میں اس امر کا واضح طور پر حوالہ دیا گیا تھا کہ مذہب کی بنیاد پر ہونے والی جنگ میں بنوضمرہ شامل نہیں ہوں گے۔ اگرچہ قبیلہ بنوضمرہ کے افراد مسلمانوں سے ہمدردی رکھتے تھے مگر انہوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ بنوضمرہ، بنوغفار، بنوربعہ اور بنوزرعہ قبائل سے کئے گئے معاہدوں کے متن ہم تک پہنچے ہیں لیکن جنوب میں آباد قبیلہ بنومدلج کے معاہدہ کا متن معلوم نہیں ہوسکا تاہم اس معاہدہ کی دفعات بھی یقینی طور پر دوسرے معاہدوں کی طرح ہی ہوں گی۔ قبیلہ بنومدلج کے فرد سراقہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) [جس

نے سفر ہجرت کے دوران نبیٔ آخر الزماں حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھیوں کو ہراساں کرنے کی کوشش کی تھی] کا رویہ از حد ہمدردانہ اور عقیدت مندانہ تھا۔ جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مشرکین مکہ کے ایک تجارتی قافلہ کے خلاف کارروائی کے لئے العشیر ہ گئے تو سراقہ بن مالک (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے پورے (مسلمان) فوجی دستہ کے اعزاز میں انتہائی شاندار اور پُر تکلف دعوت کا اہتمام کیا تاہم اس دعوت کی وجہ سے مسلمانوں کا قیمتی وقت ضائع ہو گیا۔ نتیجتاً دشمن کے تجارتی قافلے کے خلاف کارروائی ممکن نہ ہو سکی۔

(148) ان معاہدوں اور ان جیسے دوسرے معاہدوں کے ذریعے خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلامی علاقے کی سلامتی و حفاظت میں روز بروز اضافہ فرمایا۔ ان معاہدوں کی وجہ سے پُر امن طور پر کام کرنے کی راہ ہموار ہوئی اور ان قبائل کے افراد میں دین اسلام سرایت کرنا شروع ہوا۔ جلد ہی قبیلہ بنوضمر ہ نے اسلام کو بہترین سفیر فراہم کیا۔ یہ شخص عمر بن امیہ الضمر ی، محبوب خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس قدر وفادار تھے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں ان کے اسلام قبول کرنے سے پہلے ہی جنگ بدر کے بعد حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے پاس اپنا سفیر بنا کر بھیجا تاکہ وہ وہاں پر ہونے والی مشرکین مکہ کی سازشوں کا منہ توڑ جواب دے سکیں۔

(149) جب علاقے کے چند قبائل اتحادی ہو گئے تو محبوب خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر مشرکین مکہ پر اقتصادی دباؤ ڈالنا چاہتے تھے۔ قریش مکہ کے تجارتی قافلے شمال کی جانب جاتے ہوئے یا واپس آتے ہوئے انہی علاقوں سے گزرتے تھے (جن علاقوں کے قبائل سے مسلمانوں نے معاہدے کئے تھے) یہ اقدام تمام تر اخلاقی بنیادوں کے حوالے سے بالکل صحیح تھا۔ مشرکین مکہ نے ہجرت کر کے مدینہ منورہ آنے والے مسلمانوں کی جائیدادیں ضبط کر لی تھیں۔ دونوں فریق حالتِ جنگ میں تھے۔ پوری دنیا میں یہی دستور ہے کہ دشمن کے آدمیوں کو گرفتار کیا جائے، قتل کیا جائے اور دشمن کی املاک لوٹ لی جائیں۔ مشرکین مکہ اپنی تجارت سے حاصل ہونے والے منافع کو مدینہ کے مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاریوں پر خرچ کر رہے تھے۔ نبیٔ آخر الزماں حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو مشرکین مکہ سے محض یہی مطالبہ کیا تھا کہ وہ اسلامی زون (مسلمانوں کے زیر اثر علاقے) میں آمد و رفت ختم کر دیں۔ ان کے تجارتی قافلوں کا محاصرہ تو صرف ایک سزا تھی اگر مشرکین مکہ اسلامی زون سے نہ گزرتے تو ان کے قافلوں کو کوئی خطرہ نہ ہوتا۔

باب 6

مکہ سے مخالفانہ تعلقات

(150) مکہ ایسا بنجر علاقہ ہے کہ جہاں نہ زراعت ہے اور نہ ہی صنعت۔ چنانچہ مکہ والوں کے روزگار کا واحد ذریعہ تجارت ہے۔ اور یمن و یورپ کی باہمی تجارت شام کے ذریعے مکہ مکرمہ کے راستے ہوتی تھی۔ مکی تجارتی قافلے موسم سرما اور گرما میں خوشحالی اور تحفظ کی خوشخبری لاتے۔

لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ۙ اِلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ۚ

(قریش: 1,2)

"چونکہ ہیں (اہل) قریش اس بات کے خو آشنا
جاڑے گرمی کے سفر سے اُنس ان کو ہے بڑا"

تجارت کی خاطر صرف یمن تک جانا بے فائدہ تھا جب تک کہ شام پہنچ کر یمنی مصنوعات کی خرید و فروخت نہ کی جائے۔ اگر مکی تجارتی قافلوں کا مدنی راستہ بند کر دیا جاتا تو مکہ والوں کے مفادات کو نقصان پہنچتا۔ مکہ والے اس راستہ کو طاقت کے بل بوتے پر کھولنا چاہتے تھے چنانچہ یہ بات مسلمانوں اور مشرکین مکہ کے مابین مسلح ٹکراؤ کا سبب بنی اور یہ ٹکراؤ پہلے بدر میں، پھر مدینہ منورہ میں ہی (جنگ اُحد اور خندق) ہوا اور آخر کار مکہ مکرمہ میں ہوا جس کا پُر مسرت اختتام (فتح مکہ) ہوا۔

(151) مشرکین مکہ کے قافلوں کی اسلامی سرزمین سے گزرنے کی پابندی کافی نہیں تھی چنانچہ مدینہ منورہ کے اردگرد کے قبائل کے ساتھ دفاعی معاہدوں کی تکمیل کے بعد سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلم فوجی دستے مشرکین مکہ کے قافلوں کو روکنے کے لئے ان علاقوں میں روانہ کرنا شروع کئے جہاں مشرکین مکہ مسلمانوں کی اس پابندی اور علاقائی حدود کی خلاف ورزی کر رہے تھے۔ کھلے صحرا میں چونکہ آبادی کم ہوتی ہے اس لئے مداخلت آسان ہوتی ہے اور خاص طور پر رات کو سفر کرنے والے مکی قافلوں کے لئے یہ کام اور بھی آسان تھا جبکہ علاقہ میں چھوٹے چھوٹے پہاڑی سلسلوں کے باعث تجارتی راستوں کی نگرانی اور بھی مشکل تھی۔ چنانچہ دس 10 میں سے ایک مسلم گشتی دستہ مشرکینِ مکہ کے کسی ایک تجارتی قافلے کو روکنے میں کامیابی حاصل کر پاتا۔ قافلوں پر چھاپہ مارنے کیلئے ان کی نقل و حرکت کی قطعی اور صحیح اطلاع

بہت ضروری ہوتی ہے۔ آغاز میں مسلمانوں کو مکمل اطلاعات فراہم نہیں ہو رہی تھیں۔ تاہم جب اسلامی علاقہ وسیع ہوا اور مسلمانوں کا کنٹرول بڑھا تو دشمن کے قافلوں کا اسلامی سرزمین سے ایک ہی رات میں گزرنا ناممکن ہو گیا۔ نتیجتاً تجارتی راستوں پر مسلمانوں کا کنٹرول زیادہ مؤثر ہو گیا تاہم اس سب کچھ کے لئے صبر و تحمل اور مسلسل نگرانی و باخبری کی ضرورت تھی۔ (اور اسی وجہ سے ایسا ممکن ہوا)

(152) یہ ایک فطری امر تھا کہ مشرکین مکہ آسانی سے شکست تسلیم کرنا نہیں چاہتے تھے۔ جب انہیں خبر ملی کہ ان کے ایک بڑے تجارتی قافلے کا بدر کی گھاٹی میں پیچھا کیا جا رہا ہے تو انہوں نے مسلمانوں کو سبق سکھانے کیلئے ایک بڑی فوج اکٹھی کی مگر بُری طرح شکست کھائی۔ سپہ سالار اعظم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سربراہی میں مسلمانوں نے اپنے سے تین گنا سے بھی زائد دشمن کو کچل دیا۔ 70 مشرکین موت کے گھاٹ اُترے اور تقریباً اتنے ہی زندہ پکڑ لئے گئے جنہیں بعد میں فدیہ لے کر رہا کیا گیا مگر رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس نرم رویہ کا (دشمنوں نے) کوئی بہتر اور فائدہ مند اثر قبول نہ کیا۔ مشرکین مکہ کے دل صاف نہ ہوئے بلکہ انہوں نے مسلمانوں سے انتقام لینے کی خاطر بڑی مہنگی جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔ انہوں نے اپنے دوستوں اور ساتھیوں سے عسکری امداد حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اجرت پر سپاہی بھی بھرتی کئے۔ انہوں نے (حبشہ میں) بادشاہ نجاشی کے پاس ایک اور وفد بھیجا جس کا کام یہ تھا کہ بادشاہ نجاشی کو مہاجر مسلمانوں کے خلاف بھڑکا کر ان کو حبشہ سے نکلوایا جائے۔ اپنے وفادار ایجنٹوں کے ذریعے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی شاید اس کی خبر ہو گئی چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا ایک خصوصی سفیر قبیلہ بنو ضمر کا سردار عمرو بن امیہ الضمری بادشاہ حبشہ کے پاس بھیجا اور یوں مشرکین مکہ کی سازش کو ناکام کر دیا۔ تاریخ دانوں کا بیان ہے کہ حبشہ کے بادشاہ نجاشی کو ایک دفعہ اپنے ملک میں بغاوت اور خانہ جنگی کی وجہ سے وطن چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا تھا اور اس نے اپنی یہ جلاوطنی بنو ضمر کے ہاں گزاری (السہیلی) ہو سکتا ہے کہ اُسی وقت سے عمرو بن امیہ الضمری کے دوستانہ مراسم شاہ نجاشی سے قائم ہوں۔

(153) اس دوران مشرکین مکہ نے مدینہ منورہ پر حملہ کر دیا۔ یوں مسلمانوں اور مشرکین میں احد پہاڑ کی وادی میں جنگ برپا ہوئی۔ مشرکین کی فوج کی تعداد مسلمانوں کی فوج سے چار گنا تھی۔ انہوں نے مسلمانوں کا کچھ نقصان بھی کیا تاہم جنگ کسی قسم کے حتمی نتیجہ و فیصلہ کے بغیر ختم

ہوگئی۔ایک ہی جھڑپ ہوئی جس کے بعد مشرکین پسپا ہو کر مکہ مکرمہ واپس چلے گئے تاہم مشرکین مکہ کے تجارتی راستے اسی طرح بند رہے۔مکی تاجروں نے راستہ بدل کر صحرائے نجد سے گزرتے ہوئے عراق پہنچنے کی کوشش و کاوش کی مگر مسلمان فوج کے ایک (متحرک) دستے کے دلیرانہ و بہادرانہ حملے نے مشرکین مکہ کو بھاگنے پر مجبور کر دیا نتیجتاً مکی تاجروں نے دوبارہ اس راستے سے گزرنے کی جسارت و جرأت نہ کی۔اس طرح دشمنانِ اسلام کی تجارت ختم ہوگئی۔ان کا مستقبل مخدوش ہوگیا۔وہ روز بروز مایوسیوں میں گھرتے چلے گئے کہ یکا یک انہیں ایک توقع، ایک امید پیدا ہوئی اور انہوں نے مسلمانوں کے خلاف ایک اور کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا۔مدینہ منورہ کے یہودی قبیلہ بنونضیر کو شہر سے نکل جانے کا حکم سنایا گیا کیونکہ انہوں نے ایک مسلمان خاتون کی بے عزتی و بے حرمتی کی تھی اور جب ایک مسلمان نے اس خاتون کی مدد کی کوشش کی تو یہودی قبیلہ بنونضیر والوں نے اسے شہید کر دیا۔مسلم حکومت نے جب مجرموں کے خلاف کارروائی کرنے کا ارادہ کیا تو یہودی قبیلہ بنونضیر نے مسلح ہو کر مزاحمت کی۔اور پھر مدینہ منورہ سے جانے کے بعد بنونضیر نے خیبر میں رہائش اختیار کر لی۔وہاں وہ مسلمانوں کے خلاف ایک بھاری سازش کی منصوبہ بندی کرنے لگے۔انہوں نے مشرکین مکہ سے دفاعی معاہدہ کیا جبکہ قبائل بنو غطفان اور بنوسلیم سے اجرتی فوجیوں کی خدمات حاصل کیں تاکہ مسلمانوں پر اکٹھے ہو کر ایک ہی وقت میں (بھرپور) حملہ کیا جائے۔مشرکین مکہ نے بھی اپنے ساتھیوں اور دوستوں سے فوجی امداد مانگی۔یوں (تمام تر تیاریوں کے بعد) کافروں کی فوج مدینہ منورہ کا محاصرہ کرنے کیلئے پہنچی۔اس فوج کی تعداد مسلمانوں کی تعداد سے آٹھ گنا سے بھی زیادہ تھی۔اب کفار صرف ایک ہی جھڑپ نہیں کرنا چاہتے تھے۔سپہ سالارِ اعظم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو مشرکین کی جنگی و عسکری تیاریوں کی عرصہ پہلے خبر مل چکی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مدینہ منورہ کے دفاع کے لئے مؤثر و معتبر انتظامات فرما چکے تھے۔محبوب خدا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مدینہ منورہ کے گرد خندق کھدوائی۔مدینہ منورہ میں کافی تعداد میں موجود قلعوں میں خواتین اور بچوں کو منتقل کر دیا۔یہ قلعے اس قدر وسیع و عریض تھے کہ ان میں بھیڑوں کے ریوڑ رکھنے کی بھی گنجائش تھی۔جنگ کا آغاز ہوا۔دشمن نے مدینہ منورہ کو محاصرہ میں لے لیا مگر کئی ہفتوں کے محاصرے کے باوجود بھی کوئی حتمی نتیجہ و فیصلہ نہ ہو سکا۔مشرکین کی فوج اور گھوڑوں کی خوراک ختم ہوگئی۔ایسے میں حج کا موسم آگیا جس کے بعد عاشورہ محرم تھا جس میں جنگ ممنوع تھی۔مکہ والے بھی ان ایام میں لڑائی و خونریزی سے اجتناب کرتے تھے۔مزید یہ کہ

وہ حج کعبہ کے لئے مکہ مکرمہ آنے والوں سے ہونے والی آمدنی سے بھی محروم نہیں ہونا چاہتے تھے۔ علاوہ ازیں یہ ماہ جنوری کے سردی کے دن تھے۔ ان تمام عوامل نے مکہ والوں کو مجبور کر دیا کہ وہ مدینہ منورہ کا محاصرہ ختم کر کے گھروں کو لوٹ جائیں۔

(154) مشرکین مکہ اس مایوس کن صورت حال سے پریشان تھے اور انہیں (آئندہ کے) حالات کی نشانیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ انہی ایام میں بارش نہ ہونے کے باعث مکہ مکرمہ میں قحط پھیل گیا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قحط زدگان کی امداد و اعانت کے لئے 500 اشرفیاں مکہ مکرمہ بھجوائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ معظمہ کے سردار ابوسفیان کو بہت زیادہ مقدار میں کھجوریں روانہ کیں اور اُسے کہا کہ وہ ان کے بدلے (جانوروں کی) کھالیں روانہ کرے مگر تجارتی راستوں کی بندش کی وجہ سے وہ ایسا نہ کر سکا۔ اس امر کی کافی وجوہ موجود ہیں کہ پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوسفیان کو یہ یقین دہانی کرا دی تھی کہ اس کے تجارتی قافلوں کو کسی رکاوٹ کے بغیر اسلامی ریاست میں شامل راستوں سے گزرنے کی اجازت دے دی جائے گی۔ دراصل جب سرور کائنات حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چند ہفتوں بعد مکہ مکرمہ کے نواح میں واقع حدیبیہ کی مہم پر تشریف لے گئے تو ابو سفیان رومی بادشاہ ہرقل کی ایرانیوں پر فتح کے بعد شکریہ کے اظہار کے لئے بیت المقدس (شام) میں پہنچنے پر اس سے ملاقات کے لئے جانے کی بناء پر مکہ مکرمہ میں موجود نہیں تھا۔ مزید یہ کہ سرور کونین حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہی ایام میں ابوسفیان کی بیٹی حضرت اُم حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نکاح بھی کیا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اسلام قبول کرنے کے بعد حبشہ میں پناہ لئے ہوئے تھیں۔ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنے شوہر کے ہمہ قسم کے دباؤ کے باوجود عیسائیت قبول کرنے سے یکسر انکار کر دیا اور مستقل مزاجی کے ساتھ اسلام پر قائم و دائم رہیں۔ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا شوہر نشہ کی زیادتی کی وجہ سے مر گیا۔ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی اسلام سے بے پایاں محبت اور رب ذوالجلال کی راہ میں ثابت قدمی سے متاثر ہو کر سرور کائنات حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے شادی کا عندیہ ظاہر کیا۔ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے سرور کائنات حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ جیسے شرف کو اپنے لئے اعزاز و افتخار سمجھتے ہوئے اسے خوشی و مسرت کے ساتھ قبول کر لیا۔ اس طرح آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اہل اسلام کی ماں (ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا) ہونے کا رتبہ حاصل کیا۔ اب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم اجنبی ہونے کی بجائے دامادِ ابوسفیان تھے۔ اس طرح ابوسفیان کے دل میں اسلام سے نفرت وکدورت اور دشمنی وضرر رسانی کے جذبات میں کمی ہوئی۔ مفسرین کے مطابق قرآن الحکیم کی اس آیت میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ۭ وَاللّٰهُ قَدِيْرٌ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

(الممتحنہ:7)

"کیا تعجب ہے، خدا تم میں اور اُن (کفار) میں (آج جو کہ مذہبا) دشمن سمجھتے ہیں تمہیں دوستی پیدا کرے، قادر ہے وہ ہر بات پر بخشنے والا ہے وہ، اور مہربان (و دادگر)"

(155) ان تمام چھوٹے چھوٹے واقعات کا مجموعی اثر مثبت اور اسلام کے حق میں مرتب ہوا۔ رسولِ رحمت حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صورتِ حال کو اس طرح بہتر کرنے کے بعد سرِ عام یہ اعلان کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انتہائی احترام وعقیدت کے ساتھ اللہ جل جلالہٗ کے گھر (کعبۃ اللہ) حج کی نیت سے جا رہے ہیں (سوال پیدا ہوتا ہے کہ) کیا مشرکین مکہ کے لئے یہ فخر واعزاز کی بات نہیں تھی اور کیا اس سے مشرکین مکہ کے دلوں میں دین اسلام کیلئے نرمی پیدا نہیں ہوئی ہوگی (جب انہیں علم ہوا کہ) کہ اُن کی عبادت گاہ نبیٔ آخر الزماں حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے بھی مقدس ومتبرک ہے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن کے بتوں کے اولین دشمن تھے؟ شافعِ محشر حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ مکرمہ کے نواح میں واقع حدیبیہ پہنچے اور اپنا ایک قاصد بھیج کر قریش مکہ سے چند دنوں کے لئے مکہ مکرمہ میں پُر امن طور پر داخلہ کی اجازت چاہی تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حج ادا کر سکیں۔ اس پر اہل مکہ نے بات چیت کی خاطر ایک وفد سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں روانہ کیا۔ امن کا معاہدہ مشکل مرحلہ نہیں تھا کیونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے ہی قریش مکہ کی تسکین کی خاطر ان کے تمام مطالبات تسلیم کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے جبکہ اس کے بدلے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دو مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ (۱) امن وسکون کا قیام (۲) مسلمانوں کی کسی تیسری طاقت سے جنگ کی صورت میں

قریش مکہ سے غیر جانبدار رہنے کے وعدہ کا حصول۔ اگرچہ مکہ والے اس بات سے باخبر تھے کہ قریش مکہ کے غیر جانبداری کا تعلق خیبر کے یہودیوں سے ہے مگر امن وسکون کا قیام اور (اسلامی ریاست والے راستوں سے گزرنے کی اجازت سے) تجارت کی بحالی کا لالچ اتنا بڑا تھا کہ قریش مکہ کسی قسم کا اصرار کیے بغیر معاہدہ پر راضی ہو گئے۔ معاہدہ میں کہا گیا کہ

(1) سرور کونین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سال حج کرنے کی بجائے آئندہ برس حج کریں گے مگر مکہ مکرمہ میں محض تین روز ہی قیام کریں گے۔

(2) افراد کی واپسی کا نظام یک طرفہ ہوگا یعنی اگر کوئی مکی مدینہ منورہ جا کر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس پناہ حاصل کرے گا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُسے واپس مکہ مکرمہ بھیج دیں گے لیکن اگر کوئی مسلمان مکہ مکرمہ میں پناہ چاہے گا تو اُسے واپس نہیں کیا جائے گا۔

(3) دس سال کے لئے (فریقین میں) جنگ پر پابندی ہوگی مگر مسلمان مکہ اور طائف جاسکیں گے۔ اسی طرح مکہ والے اسلامی سلطنت کے علاقوں سے گزر کر شام جاسکیں گے۔

(4) ہر فریق کسی تیسری طاقت کے ساتھ جنگ کی صورت میں غیر جانبدار رہے گا۔

(5) دوسرے قبائل بھی اس معاہدہ میں جس فریق کے ساتھ چاہیں شامل ہو سکتے ہیں (چنانچہ قبیلہ بنوخزاعہ نے رسول مکرم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اور احابیش نے مکہ والوں کے ساتھ اس معاہدہ میں شرکت کر لی)۔

(156) اس معاہدہ کے نتائج تمام اندازوں سے بڑھ کر برآمد ہوئے۔

(1) مسلمانوں اور قریش مکہ کے مابین منقطع رابطے بحال ہوئے (دونوں فریقوں کے درمیان مذاکرات اور بات چیت میں بہت زیادہ اضافہ ہوا) لوگوں کی کثیر تعداد نے مذہب تبدیل کیا (یعنی مشرف بہ اسلام ہوئے) اس حوالے سے حضرت خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن ولید اور حضرت عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ ابن العاص جیسے عظیم ناموں کی مثال ہی کافی ہے جنہوں نے اسی زمانے میں (اس معاہدہ کے بعد) اسلام قبول کیا۔

(2) مکہ مکرمہ کے بیسیوں مسلمان جنہیں اُن کے والدین اور سرپرستوں نے (جبراً) روک رکھا تھا۔ معاہدہ حدیبیہ کی "یکطرفہ واپسی" کی دفعہ (دفعہ 2) کے باوجود بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے (یعنی بھاگ کر مدینہ منورہ پہنچ گئے) اس دفعہ پر عمل درآمد کی بعض تفصیلات کا بیان بے محل نہ ہوگا۔ اسی دوران ہی مقام حدیبیہ پر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کیمپ میں ایک مکی

مسلمان حضرت ابو جندل رضی اللہ تعالیٰ عنہ ابن سہیل بن عمرو آئے اور سیاسی پناہ طلب کی لیکن اس کے والد کے مطالبہ پر اُسے مکہ مکرمہ واپس بھیج دیا گیا۔ تاہم رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس ضمن میں حضرت ابو جندل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے والد (سہیل بن عمرو) سے یہ عہد لیا کہ وہ اپنے بیٹے پر اس لئے تشدد نہیں کرے گا کہ اس نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ سرور کونین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب مدینہ منورہ واپس تشریف لے جا رہے تھے تو ایک اور مکی مسلمان حضرت ابو بصیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو راستے میں ملے۔ وہ مکہ مکرمہ سے بھاگ کر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پناہ حاصل کرنے آئے تھے۔ حضرت ابو بصیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خاندان کے دو افراد نے تھوڑی ہی دیر بعد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر حضرت ابو بصیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ ہادئ برحق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابو بصیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان کے حوالے کر دیا۔ راستے میں حضرت ابو بصیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ایک محافظ کو موت کے گھاٹ اُتار دیا اور واپس اسلامی فوج میں پہنچا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دوسرے مکی محافظ نے واپس وہاں پہنچ کر سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تمام واقعہ سے آگاہ کیا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رجحان دیکھتے ہوئے حضرت ابو بصیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسلامی فوج سے غائب ہو گئے یوں محافظ خالی ہاتھ مکہ مکرمہ لوٹا۔ صلح حدیبیہ کے بعد مکی تجارتی قافلوں کی آمدورفت شام کی جانب شروع ہو گئی۔ حضرت ابو بصیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسلامی فوج سے نکل کر (عیص کے مقام پر) بدر کی ایک گھاٹی میں (خفیہ) جا ٹھہرے (اس کے قریب ہی شام کی طرف جاتی ہوئی مکی تجارتی قافلوں کی شاہراہ تھی) حضرت ابو بصیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب بھی کسی مکی مشرک کو ادھر سے گزرتا ہوا پاتے تو اس پر تیروں سے حملہ کر کے اُسے موت کے گھاٹ اُتار دیتے۔ حضرت ابو بصیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ان کامیاب کارروائیوں کی اطلاع پا کر کافی تعداد میں مکی بھاگ کر بدر کی گھاٹیوں میں جمع ہو گئے۔ یوں حضرت ابو بصیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ایک مضبوط و مستحکم فوجی دستہ تشکیل پا گیا۔ (یہ دستہ 170 افراد پر مشتمل تھا) جس نے مشرکین مکہ کے تجارتی قافلوں کا شام کی جانب سفر ناممکن بنا دیا۔ تاہم اس میں رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی مشورہ یا رائے شامل نہیں تھی۔ نتیجتاً مشرکین مکہ نے "یکطرفہ واپسی" کی دفعہ کی منسوخی کا خود ہی مطالبہ کرتے ہوئے حضرت ابو بصیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

کے ساتھیوں کو مدینہ منورہ واپس جانے کی اجازت دینے کا کہا۔ چنانچہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام متاثرہ مسلمانوں کی خوشنودی وخوشی کی خاطر اس دفعہ کی منسوخی کی منظوری دے دی۔ سردار الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں اس دفعہ کی تنسیخ سے پہلے مکہ مکرمہ سے دو خواتین حاضر ہوئیں۔ دین اسلام کی کشش قابل ذکر ہے کہ ان خواتین میں ایک عقبہ ابن ابو معیط کی بیٹی تھی جو مکہ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانی دشمنوں میں سے تھا اور وہ جنگ بدر میں قتل کیا جا چکا تھا۔ اس کی نوجوان غیر شادی شدہ بیٹی نے خفیہ طور پر راز داری کے ساتھ اسلام قبول کیا اور مدینہ منورہ پہنچ گئی۔ اس کے دو بھائیوں نے مدینہ منورہ آ کر اس کی واپسی کا مطالبہ کیا مگر سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا کہ "اس دفعہ کا تعلق محض مردوں سے ہے خواتین سے نہیں۔" چنانچہ مکہ والوں نے اصرار نہ کیا۔ ایک اور مدنی خاتون جس کی شادی مکہ مکرمہ میں ہوئی تھی وہ اپنے خاندان کو چھوڑ کر مدینہ منورہ آ گئی۔ اس معاملے میں محبوب خدا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے حق مہر کی رقم اس کے شوہر کو ادا کر دی۔ درحقیقت اسلام میں کسی مسلمان خاتون کی شادی کسی غیر مسلم مرد سے نہیں کی جا سکتی اور نہ وہ اس سے اپنے ازدواجی تعلقات کو جاری رکھ سکتی ہے۔ مسلمان مردوں کے لئے بھی کسی غیر مسلم عورت سے شادی ممنوع ہے (اہل کتاب اس سے مستثنیٰ ہیں)

(3) معاہدہ حدیبیہ کے بعد خیبر کے یہودی اپنے مکی ساتھیوں کی امداد سے محروم ہو گئے چنانچہ جلد ہی انہوں نے مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی۔ جس کے بعد تیما، وادئ القرا اور فدک وغیرہ کے علاقے بھی امن وسکون کے ساتھ اسلامی سلطنت میں شامل کر لئے گئے۔

(4) سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غیر ملکی حکمرانوں کو خطوط لکھ کر انہیں دائرہ اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دی۔ یہ خطوط ہرقل، کسریٰ، نجاشی اور کئی دوسرے حکمرانوں کو لکھے گئے۔ اسلام کو صرف جزیرہ نما عرب کا دین تو نہیں رہنا تھا! یہ ایک افسوسناک بات ہے کہ ایک مسلمان سفیر (حضرت حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن عمیر) کو بازنطینی سلطنت کے علاقہ میں شہید کر دیا گیا اور بازنطینی شہنشاہ ہرقل نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطالبہ کے باوجود اس جرم کی تلافی سے انکار کر دیا۔ یوں بازنطینی سلطنت رب ذوالجلال کی سزا کی مستحق بن چکی تھی لیکن افسوسناک امر یہ تھا کہ عیسائی اس سے پہلے اسلام کے اتنے سخت مخالف نہ تھے۔ اپنی تمام تر عقل مندی اور سائنسی ترقی کے باوجود ابھی تک اسلام کے خلاف عام طور پر غلط اور

انتہائی بے بنیاد تصورات رکھتے تھے۔

(5) سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عسکری ساتھیوں اور اہل مکہ کے جنگی ساتھیوں کے مابین ایک خونریز جنگ ہوئی۔ یہ دونوں قبائل معاہدہ حدیبیہ میں (بعد از معاہدہ) شامل ہونے والوں میں سے تھے۔ بعض ناسمجھ مکیوں نے مسلمانوں کے ساتھی قبیلہ کو مارنے کے لئے خفیہ طور پر اپنے ساتھی قبیلہ کو افرادی اور ہتھیاری امداد فراہم کی مسلمانوں کے دوست قبیلہ میں سے کئی مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے۔ معاہدہ کی خلاف ورزی خاموشی کے ساتھ نظر انداز نہیں کی جا سکتی تھی۔ (چنانچہ اس کے بعد) مکہ مکرمہ پر خونریزی کے بغیر قبضہ اور مکی ذہنوں (سوچ وفکر) میں نفسیاتی تبدیلی غور وفکر کے لئے کافی مواد فراہم کرتی ہے۔

(157) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب مسلمانوں کے عسکری ساتھی قبیلہ پر مشرکین کے جنگی ساتھی قبیلہ کے حملہ کی اطلاع ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ کی سرحدیں بند کر دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ کوئی شخص بھی مدینہ منورہ سے باہر نہ جائے۔ نتیجتاً مدینہ منورہ کے اندر وقوع پذیر ہونے والے حالات ومعاملات کی کوئی بھی خبر مدینہ منورہ کی حدود سے باہر نہ جا سکی۔ اس کے بعد سپہ سالار اعظم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک بہت بڑی عسکری مہم کی تیاری کا حکم دیا تاہم یہ نہ بتایا کہ اسلامی فوج کا مقصد ومحور کیا ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ کے اردگرد کے مسلمان قبائل کو اسلامی فوج کے ساتھ شامل ہونے کی خاطر ہمہ قسم کی تیاری رکھنے کا حکم دیا تاہم انہیں بھی ہدف اور مقصد ومنزل کے بارے کچھ نہ بتایا گیا۔ تین ہزار کے قریب اسلامی فوج سپہ سالار اعظم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سربراہی میں مدینہ منورہ سے نکلی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اِدھر اُدھر سے ہوتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے تاکہ مختلف قبائل کے تیار فوجی دستوں کو بھی اسلامی فوج میں شامل فرماتے جائیں۔ پوری فوج میں سے کوئی شخص بھی یہ نہیں جانتا تھا کہ ان کے سفر کی سمت شمال ہے یا جنوب ہے یا مشرق ہے۔ مختلف قبائل کے فوجی دستوں کی شمولیت سے اسلامی فوج کی تعداد دس ہزار ہو گئی۔ جاری سفر کے دوران یکا یک آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ مکرمہ کے نواح میں پڑاؤ کا حکم صادر فرمایا۔ عسکری روایت وقانون کے مطابق بہت سے سپاہی اکٹھے مل کر تمام فوج کے لئے کھانا تیار کرتے ہیں مگر سپہ سالار اعظم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ حکم دیا کہ اُس رات ہر سپاہی اپنے کھانے کے لئے اپنی آگ خود

جلائے اور اس آگ پر اپنا کھانا خود تیار کرے۔ مکہ مکرمہ کی پہاڑیوں پر مقیم خاندانوں نے دیکھا کہ پہاڑ کے دامن میں دس ہزار کے قریب مقامات پر آگ جل رہی ہے۔ اس پر انہوں نے اندازہ لگایا کہ مسلمانوں نے 50 ہزار سپاہیوں پر مشتمل فوج کے ذریعے مکہ مکرمہ پر حملہ کر دیا ہے۔ مکہ کا سردار ابوسفیان خود جاسوسی کرنے کے لئے پہاڑ کے دامن میں پہنچا مگر مسلمانوں کے ایک گشتی دستہ نے اُسے گرفتار کر لیا جس کے بعد شہر (مکہ مکرمہ) میں دفاعی اقدامات میں رابطہ پیدا کرنے کے لئے کوئی نہ رہا۔ اگلی صبح سردار الانبیاء حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلامی فوج کو کئی یونٹوں (گروپوں) میں تقسیم کیا اور حکم دیا کہ ہر یونٹ (گروپ یا دستہ) الگ راستے سے مکہ مکرمہ میں داخل ہو۔ اس طرح مکہ والوں کے لئے بھاگنے کے تمام راستے روک دیئے گئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام کمانڈروں کو سختی سے حکم دیا کہ وہ صرف (مخالفین کی طرف سے) حملہ ہی کی صورت میں اپنے دفاع کے لئے ہتھیار استعمال کریں۔ جب اسلامی فوج آگے بڑھنا شروع ہوگئی تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوسفیان کو رہا کر دیا۔ ان لمحاتِ میں ابوسفیان از حد حیران و پریشان تھا اور یہ صورت حال اس کی سمجھ سے بالاتر تھی اسلامی فوج کے نقیب شہر مکہ مکرمہ میں منادی کر رہے تھے کہ جو شخص اپنے گھر میں بیٹھا رہے اسے امان حاصل ہے۔ جو شخص کعبہ کے صحن میں داخل ہو جائے گا اُسے بھی امان حاصل ہے۔ جو شخص اپنے ہتھیار اسلامی فوج کے حوالے کر دے گا یا ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے لے گا اُس کے لئے بھی امان ہے۔ (اس آخری امان سے ابوسفیان اور مشرکین بہت ہی حیران ہوئے) اسلامی فوج پورے شہر مکہ میں پھیل گئی اور (بغیر کسی خونریزی کے) شہر پر پورے امن و امان کے ساتھ قبضہ ہو گیا۔ یہ فطری بات ہے کہ مکہ کے مکینوں پر اُداسی اور افسردگی کا غلبہ تھا۔ جلد ہی رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے شہر مکہ میں اعلان کیا گیا کہ لوگ کعبہ کے صحن میں جمع ہو جائیں جہاں پر نبیٔ آخر الزماں حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خطاب فرمائیں گے۔ لوگوں میں خوف اور تجسس کے ملے جلے جذبات و احساسات تھے۔ سید العرب والعجم حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسلامی فوج کے حلقے میں عاجزی و انکساری کے ساتھ اپنی اونٹنی کی پیٹھ پر رب العزت کے حضور سجدہ میں سر جھکائے تشریف لائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی آمد کے فوراً بعد کعبۃ اللہ کو بتوں سے پاک صاف کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کعبۃ اللہ کی عمارت میں تشریف لے گئے۔ آپ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیواروں پر بنی ہوئی تصاویر کو مٹانے کا حکم دیا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "سوائے اس کے" اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (ایک معروف روایت کے مطابق) اپنے ہاتھ ایک چھوٹی سی تصویر پر رکھ دیئے۔ اس تصویر میں حضرت مریم علیہ السلام نے اپنے بچے مسیح علیہ السلام کو اپنے بازوؤں میں اُٹھایا تھا۔ ان تصاویر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی تصویریں بھی تھیں اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق یہ اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ ظہور اسلام سے پہلے بھی مکہ والوں کے لئے یہ دونوں شخصیات اُن کے آباء واجداد کے طور پر تسلیم کی جاتی تھیں۔ کعبہ سے باہر آ کر آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت بلال حبشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ وہ کعبہ کی چھت پر چڑھ کر نماز کے لئے اذان دیں۔ اس موقع پر موجود مشرکین مکہ کے ایک سردار عتاب ابن اُسید نے قریب کھڑے اپنے ایک ساتھی سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا "خدا کا شکر ہے کہ میرا والد پہلے ہی فوت ہو چکا ہے ورنہ وہ اس کالے گدھے (یعنی حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ، نعوذ باللہ) کو خدا کے گھر کی چھت پر کھڑے ہو کر آوازیں نکالتے کبھی برداشت نہ کرتا" رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی امامت میں مسلمانوں کی نماز کی ادائیگی کے بعد مشرکین مکہ کی طرف متوجہ ہوئے اور انہیں ان کا وہ احمقانہ سلوک ورویہ یاد دلایا جو انہوں نے پچھلے اکیس 21 برس سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ روا رکھا تھا۔ پھر رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے پوچھا "اب تم مجھ سے کیسی توقع رکھتے ہو؟" فطری بات ہے کہ ان کے سر شرم سے جھک گئے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مشرکین مکہ کے قتل عام، انہیں غلام بنانے یا کم از کم ان کی املاک ضبط کرنے کا حکم دے سکتے تھے تاہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس قسم کی کوئی بات نہیں کی بلکہ انتہائی دھیمے لہجے میں فرمایا "آج کے دن تم پر کوئی جبر نہیں۔ جاؤ تم آزاد ہو۔" اس بات کا اتنا زبردست نفسیاتی اثر ہوا کہ عتاب ابن اسید اس اثر سے اتنا مغلوب ہوا کہ آگے بڑھے بغیر نہ رہ سکا۔ اُس نے کہا "اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! میں عتاب ہوں اُسید کا بیٹا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ رب تعالیٰ (جل شانہٗ) کے سوا کوئی خدا نہیں اور تصدیق کرتا ہوں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ (جل شانہٗ) کے رسول ہیں۔" سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی ایک لمحے کا وقفہ کئے بغیر فرمایا "جہاں تک میرا تعلق ہے میں تمہیں مکہ مکرمہ کا گورنر مقرر کرتا ہوں۔" نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جلد ہی واپس

مدینہ روانہ ہو گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ مکرمہ کی نگرانی اور حفاظت کے لئے اپنا ایک بھی مدنی سپاہی وہاں نہ چھوڑا اور (اس فیصلے پر) کبھی پریشان نہ ہوئے۔

(158) رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس رویہ پر غور کرنے کے لئے وقفہ لینا ضروری ہے۔ مکہ والوں کی سزا میں مکہ کی تمام آبادی کا قصور نہیں تھا۔ کم از کم اخلاقی طور پر مکہ مکرمہ اس امر کا حقدار نہیں تھا کہ اُسے فتح کیا جائے۔ رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو محض یہ چاہتے تھے کہ مکہ مکرمہ کے نظام میں تبدیلی لائی جائے اور ایسے افراد کو حکومت دی جائے جو غیر جانبداری اور سنجیدگی کے ساتھ اسے چلا سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مکہ مکرمہ کا گورنر مقرر کرنے کے بعد مدینہ منورہ واپس تشریف لے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ والوں میں ذہنی تبدیلی لانے کے لئے حتی الوسع سب کچھ کیا۔ ایک فاتح کے طور پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رویہ اس قدر فیاضانہ اور فراخدلانہ تھا کہ مکہ والوں کا تعصب اس کے آگے نہ ٹھہر سکا۔ مکہ دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا اور اس نے از خود اپنے آپ کو اسلامی سلطنت سے منسلک کر لیا۔ مکہ کو کسی مفتوحہ شہر کی طرح جبراً غیر ملکی فاتح مملکت میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔

(159) (ختم المرسلین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رحملانہ رویہ کی) صرف حضرت عتاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن اسید ہی واحد مثال نہیں تھے۔ صفوان نامی ایک اور سردار سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا۔ اس نے کہا "میں (فی الحال) اسلام قبول کرنا نہیں چاہتا۔ مجھے غور و فکر اور فیصلہ کے لئے دو ماہ کی مہلت چاہیئے۔" محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "میں تمہیں چار ماہ دیتا ہوں" بہت سے دوسرے مکی مثلاً ابو جہل کا بیٹا عکرمہ مکہ مکرمہ سے بھاگ گیا۔ اُسے واضح طور پر اپنے بُرے اعمال کی سزا کا خطرہ تھا۔ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے لئے عام معافی کا اعلان کیا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض لوگوں کو قیمتی تحفے دیئے۔ ایسے (عمدہ ترین) سلوک کے سامنے اسلام کے لئے ان کے دلوں میں موجود اندھی نفرت نہ ٹھہر سکی۔

(160) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مختصر خطاب کا بے پایاں اور بے کراں نفسیاتی اثر ہوا۔ صرف ایک ہی رات میں پورا شہر (مکہ مکرمہ) دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ مکہ والے اسلام سے اس قدر مخلص اور وفادار ثابت ہوئے کہ دو سال بعد جب ہادیٔ کون و مکاں حضرت

محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے موقع پر جب کئی قبائل اور علاقے اسلام سے منحرف ہو گئے تو مکہ کا شمار اسلام کے مضبوط قلعوں میں ہوتا تھا اور اس نے دل و جان سے پورے عرب کو امن واطمینان مہیا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

(161) مکہ مکرمہ کو اسلامی سلطنت میں شامل ہوئے صرف ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مکہ مکرمہ کے مشرق میں واقع طائف سے بغاوت کی خبر ملی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے روانہ ہوئے اور مکہ مکرمہ سے دو دن کی مسافت پر جنگ حنین لڑی گئی۔ دشمن کے کئی ہزار سپاہیوں نے گھات لگا کر صبح کے انتہائی ابتدائی لمحات کے اندھیرے میں اچانک مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ جس سے مسلمان غلبہ میں آ کر تمام سمتوں میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس سنگین صورت حال کو سپہ سالار اعظم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتی جرأت اور پُر سکون حاضر دماغی کے باعث بحال کیا جا سکا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک درجن سے زائد جانثاروں نے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ جن میں ایک بہادر خاتون حضرت ام عمارہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی شامل تھیں جو اس وقت اُمید سے تھیں۔ (صورت حال کے سنبھلنے پر) مسلمان بتدریج (اپنی جگہوں پر) واپس آ گئے اور پھر دشمن کو شکست سے دوچار ہونا پڑا تاہم ان کا کیمپ، اہل خانہ اور بچے، مویشیوں کے ریوڑ اور تمام دوسری املاک جنہیں وہ بے وقوفی سے اپنے ہمراہ لائے تھے مسلمانوں کے ہاتھ لگیں۔ فتح کے بعد حضرت ام عمارہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بڑے فخر کے ساتھ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں پہنچیں اور کہا ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! یہ مرد طبقہ تو بڑا ناپسندیدہ نکلا۔ یہ لوگ اللہ تبارک وتعالیٰ کی راہ میں لڑی جانے والی جنگ کے میدان سے بھاگ نکلے۔ ان سب کو موت کی سزا دی جانی چاہیے!'' نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسکرائے اور حضرت ام عمارہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی بہادری کی تعریف کے ساتھ ساتھ اس کے لئے دعا کی جس سے حضرت ام عمارہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا غصہ جاتا رہا۔ (لڑائی کے شروع میں حضرت ام عمارہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس صرف ایک خنجر تھا۔ اس نے اس خنجر سے دشمن کے ایک سپاہی کو قتل کر کے اس سے تلوار چھین لی اور پھر اسی تلوار سے لڑنا شروع کر دیا)۔

(162) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ کے بعد شکست خوردہ (باغی) بنی ہوازن کا طائف تک تعاقب کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چند یوم طائف میں قیام بھی کیا

تاہم پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فیصلہ کیا کہ محاصرہ کی بجائے امن کی حکمت عملی استعمال کی جائے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فیصلہ مفید و موثر ثابت ہوا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ مکرمہ سے ہوتے ہوئے مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔

(163) بعدازاں کوئی دو ماہ بعد ایام حج میں یہ تجسس آمیز بات دیکھنے میں آئی کہ مسلمان تو کعبۃ اللہ کو دین اسلام کے مرکز کے طور پر استعمال کر رہے ہیں جبکہ عرب کے تمام مقامات سے آنے والے مشرکین اسی کعبۃ اللہ میں بت پرستی کی رسوم ادا کر رہے ہیں۔ اس سے بھی ہماری بات صحیح ثابت ہوتی ہے کہ مکہ مکرمہ (زبردستی) اسلامی مملکت میں شامل نہیں کیا گیا تھا بلکہ اس کی صرف حکومت تبدیل کی گئی تھی۔ حضرت عتاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے آپ کو مثالی گورنر ثابت کیا۔ مسلمان اور مشرکین دونوں کے لئے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قابل قبول تھے۔ تاہم جلد ہی جب مکہ مکرمہ میں تمام لوگ مشرف بہ اسلام ہو گئے تو صورت حال مذہبی اور سیاسی دونوں طرح سے تبدیل ہو گئی۔

(164) ایک سال بعد رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایام حج میں اپنے نائب کے طور پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مکہ مکرمہ روانہ کیا۔ اس موقع پر یہ اعلان کیا گیا کہ آئندہ کسی مشرک کو بت پرستی کے لئے کعبۃ اللہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ مکہ مکرمہ والوں کے لئے حاجی اُن کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ تھے۔ جیسا کہ آج کل سیاح (مختلف ممالک کے لئے آمدنی کا ذریعہ) ہیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟
إِنَّمَا ٱلْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا۟ ٱلْمَسْجِدَ ٱلْحَرَامَ بَعْدَ
عَامِهِمْ هَٰذَا ۚ وَإِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيكُمُ ٱللَّهُ مِن
فَضْلِهِۦٓ إِن شَآءَ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ

(التوبہ:28)

"مومنو! گندے ہیں مشرک اور نجس ہیں اس لئے
خانہ کعبہ کے پاس آئیں نہ بعد اس سال کے
خوف اگر ہو مفلسی کا (بربنائے کاروبار)
فضل سے اپنے غنی کر دے گا تم کو کردگار
اُس نے گر چاہا - وہ ذی حکمت ہے اور آگاہ کار"

یوں مکہ والوں کو یقین دلایا گیا کہ وہ حاجیوں کی تعداد میں متوقع کمی کے متعلق بے چینی و پریشانی میں مبتلا نہ ہوں اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس کے بعد مسلمان حاجیوں کی تعداد میں تمام توقعات سے بڑھ کر نمایاں اضافہ ہوا اور اس کے بعد کے سال میں تو تمام عرب سے لوگ گروہ در گروہ مشرف بہ اسلام ہوئے۔ قرآن پاک کے الفاظ میں:

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا ۝

(النصر: 1 تا 3)

"(اے پیغمبرؐ) جب کہ آ پہنچی مدد اللہ کی
اور (مکہ ہو گیا ہے) فتح (ٹوٹا کفر بھی)
اور تم نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ (دیر آشنا)
جوق جوق (اب) ہو رہے ہیں داخلِ دینِ خدا
پس کرو تسبیح اپنے رب کی اور حمد (و ثنا)
اور گناہوں کی معافی اُس سے مانگو (برملا)
(یاد رکھو) وہ معافی دینے والا ہے بڑا"

مالیاتی اصلاحات:

(165) اُسی سال 9 ہجری ہی میں معلم کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلامی سلطنت کے مالیاتی نظام میں انقلابی اصلاحات کیں۔ اس وقت اسلامی سلطنت کوئی ٹیکس وصول نہیں کرتی تھی بلکہ عوام کو تلقین و ترغیب دی جاتی تھی کہ وہ فیاضی و سخاوت سے کام لیں اور اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کے راستے میں خرچ کریں۔ قدرتی بات ہے کہ لوگ اپنے مال میں سے رب تعالیٰ جل شانہٗ کی راہ میں خرچ کے لئے مخصوص کی گئی رقم سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیتے تھے تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس طرح مناسب فرمائیں خرچ کریں۔ کچھ غیر مسلم علاقے خراج ادا کرتے تھے لیکن اس قسم کے انتظامات کسی بحران کی صورت میں اُمت کی ضروریات پوری نہیں کر سکتے تھے۔ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ مسلمانوں کے ایک سفیر کو بازنطینی سلطنت کے علاقہ میں قتل کر دیا گیا تھا۔ اس پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو سزا دینے کے لئے 3000 سپاہیوں پر مشتمل ایک مہم روانہ کی۔ دشمن کی فوج کی تعداد اسلامی فوج کی تعداد سے 33 گنا زائد تھی۔ دشمن سے موتہ کے مقام پر جنگ ہوئی۔ اسلامی فوج کا خاصا نقصان ہوا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلامی فوج کی واپسی

کے بعد تبوک کی مہم کی تیاری کی اسلامی فوج میں 30 ہزار سپاہی شامل تھے۔ اتنی بڑی مہم کے لئے بہت بھاری اخراجات کی ضرورت تھی۔ صرف رضا کارانہ امداد سے کام نہیں چل سکتا تھا۔ ان حالات میں مسلمانوں کی طرف سے سابقہ ایام میں دیئے جانے والے عطیات کو باقاعدہ قانونی شکل دی گئی۔ چنانچہ مختلف اشیاء یعنی فصلوں، تجارتی سرمایوں، درآمد و برآمد، مویشیوں کے ریوڑوں اور (معدنی) کانوں پر کم از کم ٹیکس عائد کیا گیا۔ (ٹیکس کی) سالانہ ادائیگی کے لئے وقت کا بھی تعین کر دیا گیا۔ اور منکرین و نادہندگان سے بذریعہ طاقت وصولی کے احکامات جاری کئے گئے۔ یہ ایک نیک عمل تھا اور دین کا حصہ بھی تاہم اسے سرکاری ٹیکس کی حیثیت حاصل تھی۔ (اس ٹیکس کے لئے) پرانا اور قدیم نام زکوٰۃ (صدقہ بھی) برقرار رکھا گیا۔ لیکن حیثیت و استطاعت والے افراد کے لئے یہ ایک رضا کارانہ عمل کی بجائے ایک فریضہ بن گیا۔

(166) یہ ایک دلچسپ امر ہے کہ قرآن پاک اخراجات کے بجٹ کے اصول و ضوابط اور سلطنت کی آمدنی سے فائدہ اٹھانے والوں کے بارے میں بہت زیادہ تفصیل بیان کرتا ہے۔ شاید اس سے مراد یہی ہے کہ ٹیکس عائد کرنے کا اختیار عوامی نمائندوں کو دیا جائے تاکہ وہ اپنے زمانے اور ضروریات کے مطابق ٹیکس لگانے کا فیصلہ کر سکیں۔ سرکاری آمدنی کی تقسیم کے حوالے سے ارشاد ربانی ہے۔

إِنَّمَا الصَّدَقَٰتُ لِلْفُقَرَآءِ
وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ
وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ
اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ

(التوبہ: 60)

"مفلسوں کا اور محتاجوں کا ہے خیرات حق
اور جو ہیں خیرات کے کارندے وہ ہیں مستحق
جن کا دل پرچانا ہو (خیرات ہے ان کو روا)
اور غلاموں کے چھڑانے اور اہل قرض کا
ہیں مجاہد اور مسافر (مستحق خیرات کے)
یہ حقوق اللہ (برتر) کے ہیں ٹھہرائے ہوئے"

اور خدا آگاہ ہے ہر حکمت و تدبیر سے

(167) (صرف صدقات کی تقسیم کے لئے افراد کی) یہ آٹھ اقسام نہایت جامع ہیں اور ایک فلاحی ریاست قائم کرتی ہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا تھا کہ "فقراء" سے مراد مسلمانوں میں غریب لوگ اور "مساکین" سے مراد غیر مسلم باشندوں میں غریب لوگ ہیں۔

(168) "خیرات کے کارندے" میں ٹیکس اکٹھا کرنے والے، آڈٹ کرنے والے، اسے مقررہ انداز میں تقسیم کرنے والے اور اس تمام کام کی نگرانی کرنے والے شامل ہیں۔ دراصل اس سے مراد سلطنت کی سول اور فوجی پوری مشینری ہے۔

(169) "دل پر چانا" یعنی دلجوئی کرنا میں مسلم اور غیر مسلم دونوں کا حوالہ ہے۔ اور اصل میں اس کا اشارہ اسلامی سیاسی مقاصد (اسلام کی طرف مائل وقائل اور پختہ کرنا) کے حصول کی خاطر سلطنت کی خفیہ سروس اور نومسلموں (پر خرچ کرنے) کی طرف ہے۔

(170) فدیہ دے کر دشمن کی قید سے مسلم یا غیر مسلم شہریوں کو آزاد کرانا اس دور میں نہایت ہی اہم تھا۔ حکومت کے خرچہ پر غلاموں کو آزاد کرانا بھی مملکت کا دلچسپ ترین فرض بیان کیا گیا ہے۔ یہ کام عام لوگوں کی طرف سے اللہ تبارک و تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کر کے غلاموں کو آزاد کرانے کے علاوہ ہے۔

(171) "اہل قرض" سے مراد وہ غریب لوگ نہیں جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے بلکہ ایسے افراد جو اچانک کسی وجہ سے قرض میں پھنس گئے ہوں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے بلا منافع قرضوں کا انتظام کیا تھا۔

(172) "مجاہد" سے مراد مملکت کے دفاعی اخراجات ہیں (یہ اخراجات پہلے پورے کئے جائیں) اس کے بعد تمام رفاہی کام جیسا کہ مساجد کی تعمیر اور سکولوں وغیرہ کا قیام ہے۔

(173) "مسافر" یا سیاح کو سڑکوں، پلوں، پولیس، صحت و صفائی کے نظام اور میزبانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ (خیرات و صدقات کو ان چیزوں کی تعمیر و قیام کے لئے خرچ کیا جائے)۔

مشن کی تکمیل:

(174) 10 ہجری کے اختتام تک پورے (جزیرہ نمائے) عرب نے عملی طور پر اسلام کو بطور مذہب اختیار کر لیا تھا۔ یہودیوں، عیسائیوں اور آتش پرستوں کی مختصر آبادیاں کسی کسی جگہ اپنے اپنے مذہب پر قائم تھیں تاہم وہ اسلامی سلطنت کی بالادستی تسلیم کرتے تھے جو کہ تحمل و رواداری کے ساتھ ان کو اندرونی معاملات میں آزادی دیتی تھی۔ وہ اسلامی حکومت کا خیر مقدم کرتے تھے

کیونکہ ان کے ضمیر کی آواز میں کوئی مداخلت نہیں رہی تھی مگر اس سے پہلے انہیں ملک کے حکمرانوں کے دین پر چلنا پڑتا تھا چاہے وہ ایران میں ہوں یا بازنطینی سلطنت میں ہوں۔ تاہم اب ہر فرقہ اسلامی سلطنت کے تحفظ میں اپنے پسندیدہ اعتقادات پر عمل کر سکتا تھا۔ مزید یہ کہ وسیع اسلامی سلطنت ان کی زرعی پیداوار یا تجارتی مصنوعات کے لئے ایک کھلی مارکیٹ کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس وقت یمن سے لے کر عراق کے جنوبی اضلاع تک اور فلسطین پر اسلام کی حکومت تھی۔

(175) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہی حالات میں صحت کی خرابی کے باوجود حج پر جانے کا فیصلہ کیا۔ پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حج پر روانگی کی خبر نے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کو (حج پر جانے کی) ترغیب دی اور کشش پیدا کی۔ اس طرح اہل مکہ کا یہ خدشہ غلط ثابت ہوا کہ کعبہ میں غیر مسلموں کے داخلہ پر پابندی کی وجہ سے حاجیوں کی تعداد میں کمی واقع ہو گی (جس کی وجہ سے ان کی آمدنی بھی کم ہو گی) معلم کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حج کے اس موقع پر میدان عرفات میں ایک لاکھ چالیس ہزار مرد و خواتین (حاجیوں) سے خطاب (خطبہ) کیا۔ (اگر ان مسلمانوں کو بھی شامل کر لیا جائے جو اس سال حج کے لئے مکہ مکرمہ نہ پہنچ سکے تو مسلمانوں کی تعداد کا 5 سے 10 لاکھ کے درمیان اندازہ لگایا جا سکتا ہے) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس حج کے موقع پر جو طریقہ وسلیقہ (حج کے ارکان) اختیار کیا وہ قوانین بن گئے اور اس وقت سے آج تک ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ لوگ (میدان) عرفات میں جمع ہوئے جہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رحمت کے پہاڑ (جبل الرحمہ) کی چوٹی سے مشہور و معروف خطبہ ارشاد فرمایا۔ پھر آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مزدلفہ میں رات گزارنے کے بعد واپس منیٰ پہنچے۔ وہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قربانی دی اور شیطان کے ستونوں (جمرات) کو کنکر مارے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تیزی کے ساتھ مکہ مکرمہ پہنچے اور رب ذوالجلال کے گھر کا طواف کیا اور صفا و مروہ کی پہاڑیوں کے درمیان اِدھر سے اُدھر دوڑے (سعی کی) پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس منیٰ پہنچے۔ تین یوم کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رب تعالیٰ جل شانہٗ کے گھر کا الوداعی طواف کرنے کیلئے دوبارہ مکہ پہنچے اور پھر مدینہ واپس آ گئے جہاں تین ماہ بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عالم بقا کی طرف کوچ کر گئے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)

خطبہ حجۃ الوداع:

بَعْدَ الْحَمْدِ لِلّٰهِ وَالثَّنَاءِ عَلَيْهِ

اَيُّهَا النَّاسُ! اِنَّ دِمَاءَكُمْ وَ

اَمْوَالَكُمْ عَلَيْكُمْ حَرَامٌ اِلٰى أَنْ

تَلْقَوْا رَبَّكُمْ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ

هٰذَا فِيْ شَهْرِكُمْ هٰذَا فِيْ

بَلَدِكُمْ هٰذَا۔

وَاِنَّكُمْ سَتَلْقَوْنَ رَبَّكُمْ فَيَسْئَلُكُمْ

عَنْ اَعْمَالِكُمْ وَقَدْ بَلَّغْتُ وَ

مَنْ كَانَتْ عِنْدَهٗ أَمَانَةٌ

فَلْيُؤَدِّهَا لِمَنِ ائْتَمَنَهٗ عَلَيْهَا

وَاِنَّ كُلَّ رِبًا مَوْضُوْعٌ وَلٰكِنْ

لَكُمْ رُءُوْسُ أَمْوَالِكُمْ وَلَا تَظْلِمُوْنَ

وَلَا تُظْلَمُوْنَ۔

قَضَى اللّٰهُ اَنَّهٗ لَا رِبًا۔
وَاِنَّ اَوَّلَ رِبًا اَضَعُ رِبَا عَبَّاسِ
بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ فَاِنَّهٗ مَوْضُوْعٌ
كُلُّهٗ اَلَا اِنَّ كُلَّ شَیْءٍ مِنْ اَمْرِ
الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوْعٌ وَاِنَّ
اَوَّلَ دَمٍ اَضَعُ مِنْ دِمَاءِ نَا
دَمُ رَبِيْعَةَ بْنِ الْحَارِثِ بْنِ
عَبْدِ الْمُطَّلِبِ كَانَ مُسْتَرْضِعًا
فِىْ بَنِىْ سَعْدِ بْنِ بَكْرٍ وَقَتَلَهٗ
هُذَيْلُ۔

اَيُّهَا النَّاسُ، اَلشَّيْطَانُ قَدْ
يَئِسَ اَنْ يُّعْبَدَ بِاَرْضِكُمْ هٰذِهٖ
اَبَدًا وَّلٰكِنَّهٗ اِنْ يُّطَعْ فِيْمَا
سِوٰى ذٰلِكَ فَقَدْ رَضِىَ بِمَا
تَحْقِرُوْنَ مِنْ اَعْمَالِكُمْ۔
فَاحْذَرُوْهُ عَلٰى دِيْنِكُمْ۔

أَيُّهَا النَّاسُ اِتَّقُوا اللهَ وَ
اسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا
فَإِنَّهُنَّ عِنْدَكُمْ عَوَانٍ لَا
يَمْلِكْنَ لِأَنْفُسِهِنَّ شَيْئًا۔
وَإِنَّكُمْ إِنَّمَا أَخَذْتُمُوْهُنَّ
بِأَمَانَةِ اللهِ وَاسْتَحْلَلْتُمْ
فُرُوْجَهُنَّ بِكَلِمَةِ اللهِ وَ
لَكُمْ عَلَيْهِنَّ حَقٌّ۔ وَلَهُنَّ
عَلَيْكُمْ حَقٌّ وَلَكُمْ عَلَيْهِنَّ
اَنْ لَا يُوْطِئْنَ فُرُشَكُمْ أَحَدًا
تَكْرَهُوْنَهُ وَعَلَيْهِنَّ اَنْ
لَّا يَأْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ۔
وَإِنْ فَعَلْنَ فَإِنَّ اللهَ قَدْ
أَذِنَ لَكُمْ أَنْ تُهَاجِرُوْهُنَّ
فِي الْمَضَاجِعِ وَتَضْرِبُوْهُنَّ

ضَرْبًا غَيْرَ مُبَرِّحٍ فَإِنِ انْتَهَيْنَ

فَلَهُنَّ عَلَيْكُمْ رِزْقُهُنَّ وَ

كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاعْقِلُوْا

اَيُّهَا النَّاسُ قَوْلِيْ فَاِنِّيْ قَدْ

بَلَّغْتُ۔

وَقَدْ تَرَكْتُ فِيْكُمْ مَا لَنْ

تَضِلُّوْا بَعْدِيْ أَبَدًا اِنِ

اعْتَصَمْتُمْ بِهٖ۔ أَمْرَيْنِ

كِتَابَ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ وَسُنَّةَ

نَبِيِّهٖ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

أَيُّهَا النَّاسُ! اِسْمَعُوْا قَوْلِيْ

وَاعْقِلُوْهُ تَعْلَمُنَّ أَنَّ كُلَّ

مُسْلِمٍ اَخٌ لِمُسْلِمٍ وَأَنَّ

الْمُسْلِمِيْنَ اِخْوَةٌ۔

فَلَا يَحِلُّ لِامْرِئٍ مِنْ أَخِيهِ
إِلَّا مَا أَعْطَاهُ عَنْ طِيبِ
نَفْسٍ وَلَا تَظْلِمُنَّ أَنْفُسَكُمْ۔
وَاعْلَمُوْا اَنَّ الْقُلُوْبَ لَا تَغُلُّ
عَلٰى ثَلَاثٍ۔

إِخْلَاصُ الْعَمَلِ لِلّٰهِ عَزَّوَجَلَّ
مُنَاصَحَةُ أُولِي الْأَمْرِ وَعَلٰى
لُزُوْمِ جَمَاعَةِ الْمُسْلِمِيْنَ۔

فَإِنَّ دَعْوَتَهُمْ تُحِيْطُ مِنْ
وَرَآءِ هِمْ وَمَنْ تَكُنِ الدُّنْيَا
نِيَّتُهٗ يَجْعَلِ اللّٰهُ فَقْرَهٗ بَيْنَ
عَيْنَيْهِ وَيُشَتِّتُ عَلَيْهِ ضَيْعَتَهٗ
وَلَا يَأْتِيْهِ مِنْهَا إِلَّا مَا كُتِبَ لَهٗ

وَمَنْ تَكُنِ الْاٰخِرَةُ نِيَّتَهٗ
يَجْعَلِ اللّٰهُ غِنَاهُ فِيْ قَلْبِهٖ

وَيَكْفِيهِ ضَيْعَتَهُ وَنَاتِيَهِ
الدُّنْيَا وَهِيَ رَاغِمَةٌ۔

فَرَحِمَ اللّٰهُ امْرَأً سَمِعَ مَقَالَتِيْ
حَتّٰى يُبَلِّغَهُ غَيْرَهُ۔
فَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ وَلَيْسَ
بِفَقِيْهٍ وَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ
إِلٰى مَنْ هُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ۔
أَرِقَّاءَكُمْ أَرِقَّاءَكُمْ أَطْعِمُوْهُمْ
مِمَّا تَأْكُلُوْنَ وَاكْسُوْهُمْ مِمَّا
تَلْبَسُوْنَ فَإِنْ جَاءَ بِذَنْبٍ
لَا تُرِيْدُوْنَ أَنْ تَغْفِرُوْهُ،
فَبِيْعُوْا عِبَادَ اللّٰهِ وَلَا
تُعَذِّبُوْهُمْ۔ أُوْصِيْكُمْ بِالْجَارِ
حَتّٰى أَكْثَرَ فَقُلْنَا إِنَّهُ سَيُوَرِّثُهُ
أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّ اللّٰهَ قَدْ

أَدَّى لِكُلِّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ
وَإِنَّهُ لَا يَجُوزُ وَصِيَّةٌ لِوَارِثٍ
وَالْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ وَلِلْعَاهِرِ
الْحَجَرُ۔ وَمَنِ ادَّعَى إِلَى
غَيْرِ أَبِيهِ أَوْ تَوَلَّى غَيْرَ مَوَالِيهِ
فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللهِ وَالْمَلٰئِكَةِ
وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ لَا يَقْبَلُ
اللهُ مِنْهُ صَرْفًا وَّلَا عَدْلًا۔
اَلْعَارِيَةُ مُؤَدَّاةٌ وَالنِّحْلَةُ
مَرْدُودَةٌ وَالدَّيْنُ مَقْضِيٌّ
وَالزَّعِيمُ غَارِمٌ۔

وَأَنْتُمْ تُسْئَلُونَ عَنِّي وَمَا
أَنْتُمْ قَائِلُونَ قَالُوا نَشْهَدُ
أَنَّكَ بَلَّغْتَ وَأَدَّيْتَ وَنَصَحْتَ

(176) رسولِ رحمت حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جبل رحمت سے جو خطبہ ارشاد فرمایا وہ دراصل تمام اسلامی تعلیمات کا نچوڑ وخلاصہ اور انسانیت کے لئے ایک منشور و دستور ہے۔ وہ یہاں من وعن بیان کئے جانے کا حق رکھتا ہے۔

''تمام تعریفیں رب رحمٰن ورحیم کے لئے ہیں۔ ہم اُسی کی تعریف وتوصیف کرتے ہیں۔ اسی سے مدد مانگتے ہیں۔ اسی سے معافی چاہتے ہیں اور اسی سے مغفرت وبخشش طلب کرتے ہیں۔ ہم اپنی روح واعمال کی برائیوں سے رب تعالیٰ جل شانہٗ کی پناہ مانگتے ہیں۔ جسے اللہ تبارک وتعالیٰ ہدایت عطا فرمائیں اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا اور جسے راستے سے بھٹکا دیا جائے اسے کوئی سیدھا راستہ نہیں دکھا سکتا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ وہ واحد ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ تبارک وتعالیٰ کے بندے اور اُس کے پیغمبر ہیں۔

اے اللہ تبارک وتعالیٰ کے بندو! میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ رب ذوالجلال سے ڈرو اور میں تمہیں تلقین کرتا ہوں کہ اسی کی عبادت واطاعت کرو اور میں خود بھلائی سے آغاز کرتا ہوں۔

امابعد! لوگو میری بات سنو تاکہ میں معاملات تم پر واضح کرسکوں کیونکہ مجھے اس بات کا علم نہیں کہ شاید میں تمہیں اس سال کے بعد دوبارہ یہاں نہ مل سکوں۔

لوگو! اُس وقت تک جبکہ تم اپنے رب تعالیٰ جل شانہٗ سے نہیں ملتے تمہارا خون، تمہاری املاک اور تمہاری عزتیں ایک دوسرے پر اسی طرح حرمت والی ہیں جس طرح تمہارے لئے آج کا یہ مہینہ اور یہ جگہ حرمت والی ہے۔ کیا میں نے تم تک (اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکامات کو) پہنچا دیا ہے؟ اے رب رحمٰن ورحیم! گواہ رہنا۔

جس کسی کے پاس کسی کی امانت ہے وہ اسے اُس کے پاس پہنچا دے جس نے اُسے جمع کرائی تھی۔

اسلام سے پہلے دورِ جاہلیت کا سود (قرضوں پر) ختم کیا جاتا ہے لیکن تمہیں اپنے سرمایہ پر پورا پورا حق حاصل ہے۔ نہ تم کسی پر ظلم کرو گے اور نہ کسی کا ظلم برداشت کرو گے۔ رب تعالیٰ جل شانہٗ نے حکم دیا ہے کہ کوئی سود نہیں ہوگا۔ اور پہلا سود جس کے خاتمے سے میں آغاز کرتا ہوں وہ سود میرے چچا (حضرت) عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ابن عبدالمطلب کے ذمہ ہے۔ دورِ جاہلیت کے قتل وخونریزی کے تمام جھگڑے ختم کئے جاتے ہیں اور پہلا خون جس سے

میں معاف کرنے کا آغاز کرتا ہوں وہ میرے بھتیجے عامر بن ربیعہ ابن الحارث ابن عبدالمطلب کا ہے۔ دور جاہلیت (کی تقریبات) کی تمام رسومات ختم کی جاتی ہیں سوائے تولیتِ (حفاظت و نگرانی) کعبہ اور (حجاج کو) پینے کا پانی مہیا کرنے کے۔

جان بوجھ کر کیے گئے (بالارادہ) قتل کا قصاص لیا جائے گا نیم غیر ارادی قتل وہ ہے جو لاٹھی یا پتھر لگنے سے ہو۔ اس ضمن میں قصاص ایک سو اونٹ ہے۔ اس سے زیادہ طلب کرنے والا دور جاہلیت کے لوگوں میں شمار ہوگا۔ لوگو! سنتے ہو! کیا میں نے تم تک (اللہ تبارک و تعالیٰ کے احکامات کو) پہنچا دیا ہے؟ یا باری تعالیٰ! گواہ رہنا

اما بعد! لوگو! شیطان اس بات سے مایوس ہو گیا ہے کہ تمہاری سرزمین پر اس کی پرستش کی جائے گی مگر وہ اس پر مطمئن ہوگا اگر یہاں کے بغیر دوسرے مقامات پر اس کی پرستش کی جائے اور ایسے امور میں اس کی اطاعت کی جائے جن سے تم نفرت کرتے ہو۔ پس دین کے معاملات میں شیطان سے خبردار رہو۔

لوگو! ماہِ کبیسہ (چوتھے قمری سال کا زائد مہینہ) کفر میں محض اضافہ ہے۔ جو کفر کرتے ہیں گمراہ کر دیئے جاتے ہیں۔ وہ ایک سال تو (ایک مہینہ کو) غیر متبرک تسلیم کرتے ہیں مگر ایک سال اُسے متبرک قرار دیتے ہیں۔ تا کہ وہ (مہینوں کی) تعداد پوری کر لیں اور اسے متبرک قرار دیں جسے اللہ تبارک و تعالیٰ نے غیر متبرک قرار دیا ہے اور اسے غیر متبرک قرار دیں جسے رب تعالیٰ جل شانہٗ نے متبرک قرار دیا ہے۔ (اصل وقت (کی گردش اور تعین) اس صورت حال پر ہے جو اس روز تھی جب رب تعالیٰ جل شانہٗ نے آسمانوں اور زمین کو تخلیق کیا تھا۔ رب تعالیٰ جل شانہٗ کے نزدیک اس تجویز کے مطابق صرف بارہ مہینے ہیں جس روز اُس نے آسمانوں اور زمین کو تخلیق کیا تھا۔ ان میں سے چار مہینے متبرک و مقدس ہیں۔ ان میں سے تین مسلسل آتے ہیں جبکہ ایک علیحدہ ہے مثلاً ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم جبکہ قبیلہ مضر کا مہینہ رجب ہے جو جمادی الثانی اور شعبان کے درمیان آتا ہے۔ (لوگو) سنتے ہو! کیا میں نے (تم تک اللہ تبارک و تعالیٰ کے احکامات کو) پہنچا دیا ہے؟

اے اللہ جل شانہٗ! گواہ رہنا۔

اما بعد، لوگو! تمہاری بیویوں کا تم پر حق ہے اور ان پر تمہارا حق ہے۔ بیویوں پر تمہارا حق اتنا ہے کہ وہ تمہارے بستر کو کسی غیر مرد سے ناپاک نہ کریں (ناجائز جنسی تعلقات کو نرم الفاظ میں بیان کیا گیا ہے) اور ایسے افراد کو تمہارے گھروں میں داخل نہ ہونے دیں جنہیں تم ناپسند

کرتے ہو سوائے اس کے کہ تمہاری اجازت ہو۔ انہیں کوئی معیوب کام نہیں کرنا چاہیے اور اگر وہ ایسا کریں تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہیں یہ اختیار دیا ہے کہ تم ان کی سرزنش کرو اور بستر میں اُن سے علیحدگی اختیار کرو اور انہیں مارو تاہم بہت زیادہ سخت نہیں۔ اگر وہ باز آ جائیں تو پھر تم پر لازم و واجب ہے کہ انہیں کھانا دو اور اچھے رواج کے مطابق لباس دو۔ عورتوں سے کشادہ دلی سے پیش آؤ کیونکہ وہ تمہارے پاس قیدیوں کی طرح ہیں جن کے پاس ان کی اپنی کوئی املاک نہیں اور تم نے انہیں رب رحمٰن ورحیم کی امانت کے طور پر قبول کیا ہے اور تم رب تعالیٰ جل شانہٗ کے حکم سے ہی ان کے وجود سے خوشی حاصل کرتے ہو پس خواتین کے حوالے سے رب ذوالجلال سے ڈرتے رہو اور ان سے نیک و بہتر سلوک کرو۔ (لوگو) سنتے ہو! کیا میں نے (تم تک اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکامات کو) پہنچا دیا ہے؟ یا باری تعالیٰ! گواہ رہنا۔

لوگو! تمام اہل ایمان بھائی بھائی ہیں اور کسی شخص کے لئے دوسرے بھائی کی مکمل مرضی و معاہدہ کے بغیر اس کی املاک پر قبضہ کرنا قانون کے خلاف ہے۔ (لوگو) سنتے ہو! کیا میں نے (تم تک اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکامات کو) پہنچا دیا ہے؟ یا باری تعالیٰ! گواہ رہنا۔

پس میرے بعد کبھی بھی (مذہب بدل کر) غیر مومن نہ ہو جانا (اور ایسا نہ ہو کہ) تم سے کچھ لوگ کچھ دوسرے لوگوں کی گردنیں اُڑانے لگیں۔ میں تم میں وہ چیز چھوڑے جا رہا ہوں کہ اگر اس پر عمل کرو گے تو پھر کبھی گمراہ نہیں ہو گے (یعنی رب علیم وخبیر کی کتاب (قرآن الحکیم) اور اللہ جل شانہٗ کے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اسوہ (سنت)۔ (لوگو) سنتے ہو! کیا میں نے (تم تک اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکامات کو) پہنچا دیا ہے؟ یا باری تعالیٰ! گواہ رہنا۔

لوگو! تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا جد (دادوں کا دادا اور نانوں کا نانا) بھی ایک ہے۔ تم سب حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہو اور حضرت آدم علیہ السلام مٹی سے بنے تھے۔ رب تعالیٰ جل شانہٗ کی نظر میں وہ سب سے زیادہ معزز و محترم ہے جو رب ذوالجلال سے زیادہ ڈرتا ہے۔ کسی عرب کو کسی غیر عرب پر کوئی فضیلت حاصل نہیں (اگر ہے تو وہ صرف اس وجہ سے کہ وہ رب قادر و قدیر سے کتنا ڈرتا ہے!) (لوگو) سنتے ہو! کیا میں نے (تم تک اللہ تبارک و تعالیٰ کے احکامات کو) پہنچا دیا ہے؟ یا باری تعالیٰ! گواہ رہنا''

لوگوں نے جواب دیا'' جی ہاں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)''

اس پر سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خطبہ جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

''حاضر افراد ان تک یہ باتیں پہنچا دیں جو غیر حاضر ہیں۔''

لوگو! رب کریم وعظیم نے ہر وارث کے حصہ وراثت کا تعین فرمایا ہے۔ کسی وارث کے لئے وصیت کرنا قانون کی خلاف ورزی ہے۔ ورثاء کے علاوہ کسی اور کے حق میں املاک کی ایک تہائی سے زیادہ کی (ملکیت کی) وصیت کرنا قانون کے خلاف ہے۔ بچہ کا تعلق (بستر کے) مالک سے ہے (=شوہر) اور زانی کی سزا صرف سنگساری ہے۔ جو کوئی اپنے والد کے علاوہ کسی اور سے تعلق ونسب کا بہانہ کرتا ہے یا اپنے سرپرست کے علاوہ کسی اور سے تعلق ظاہر کرتا ہے اس پر رب ذوالجلال، فرشتوں اور انسانوں سب کی لعنت ہوگی۔ اس سے نہ تو کوئی معاوضہ اور نہ ہی کوئی تلافی قبول کی جائے گی۔

السلام علیکم (تم پر رب رحمٰن ورحیم کی سلامتی ہو)"

(177) (ممتاز سیرت نگار) ابن سعد کے مطابق سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس خطبہ میں یہ دو جملے بھی شامل تھے:

"لوگو! سنو، اگر تمہارا کمانڈر کسی پھٹی ہوئی ناک والے حبشی کو ہی مقرر کر دیا جائے تو جب تک وہ تم پر رب قادر وقدیر کے احکامات نافذ کرے اس وقت تک اس کی اطاعت کرو۔" اور "تمہارے غلام، تمہارے غلام! ان کو وہی کچھ کھلاؤ جو تم خود کھاتے ہو، انہیں وہی لباس پہناؤ جو تم خود پہنتے ہو۔ اگر وہ کوئی ایسی غلطی کریں جسے تم معاف نہ کرنا چاہو تو پھر رب تعالیٰ جل شانہٗ کے ان بندوں کو فروخت کر دو مگر ان پر ظلم وتشدد نہ کرو۔"

(178) جن نکات پر سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے خطبہ میں بات کی ہے ان میں دو نکات، سود اور قمری کیلنڈر کو اکثر غلط سمجھا گیا ہے۔ ان پر چند الفاظ کہنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

(179) دین اسلام اپنے قوانین کی بنیاد اخلاقیات پر رکھتا ہے اور عمل درآمد کے لئے باہمی اشتراک وامداد چاہتا ہے۔ رسول مکرم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے سود کو ممنوع قرار دینے کے 1400 سے زائد سالوں کے بعد اب جدید سائنس اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ سود تمام معاشی واقتصادی برائیوں کی جڑ ہے اور یہ معاشرے کا معاشی توازن درہم برہم کر دیتا ہے۔ کچھ لوگ بہت زیادہ امیر ہو جاتے ہیں اور کچھ بہت زیادہ غریب ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ کمیونزم بھی اس بات کو تسلیم کرتا ہے۔ درحقیقت روس میں بالشویکی انقلاب کے بعد سود پر پابندی لگا دی گئی تھی لیکن جلد ہی اُن (انقلابیوں) کو قرضے جاری کرنے کی ضرورت پڑی لیکن چونکہ سود پر پابندی کی ضرورت سے لوگوں کو مکمل طور پر آگاہ وآشنا نہیں کیا گیا تھا اس لئے کسی

شخص نے قرض نہ دیا۔ اس طرح یہ اصلاح اس بری طرح ناکام ہوئی جس طرح امریکہ میں شراب پر پابندی عائد کی گئی مگر دو سال سے زائد عرصہ تک اس پر عمل درآمد نہ کرایا جا سکا۔ چنانچہ مالیاتی اصلاحات کے تحت بنکوں کو قومی تحویل میں لیا جانا چاہیئے اور کسی بنک کو چاہے وہ ملکی ہو یا غیر ملکی ہو، سودی کاروبار کی اجازت نہیں دی جانی چاہیئے۔ اور یہ قومی (تحویل میں لئے گئے) بنک بلاسود قرضے جاری کریں۔ بنکوں کو منافع بخش اور پیداواری تجارتی اور کمرشل اداروں میں نفع کی بنیاد پر حصہ دار بنایا جائے۔ یہی کچھ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کیا تھا۔ وہ تاجروں کو بھی اسی طرح قرضے جاری کرتے تھے جس طرح عام لوگوں کو غیر پیداواری ضروریات کے لئے جاری کرتے تھے۔

(180) جہاں تک کیلنڈر کا تعلق ہے اہل مکہ قمری اور شمسی دونوں کیلنڈر استعمال کرتے تھے۔ ہر (قمری) مہینہ نئے چاند کے طلوع ہونے سے شروع ہوتا تھا مگر قمری سال میں وقتاً فوقتاً (ضرورت کے مطابق) ایک 13واں مہینہ اضافہ کر کے شمسی سال سے مطابقت پیدا کر لی جاتی تھی۔ رسول رحمت حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قمری سال میں ایک ماہ کا اضافہ بند کر دیا اور خالصتاً قمری کیلنڈر بحال کیا۔ موسم کے مطابق زرعی فصلوں پر ٹیکس کو ویسے ہی رہنے دیا گیا۔ یہ ٹیکس فصل کی کٹائی پر وصول کیا جاتا تھا مگر دوسرے تمام ٹیکس قمری سال کے مطابق وصول کئے جاتے تھے۔ قمری سال دراصل شمسی سال سے گیارہ دن کم کا ہوتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ حکومت 33 شمسی سالوں میں 34 دفعہ سالانہ ٹیکس وصول کرتی تھی (کیونکہ قمری سال 34 بنتے تھے) بھلا کون سا وزیر خزانہ ایسا کرنے سے باز رہے گا؟ اس طرح سرکاری ملازمین کو 33 شمسی سالوں میں 34 بار سالانہ تنخواہ ادا کرنے کے باوجود سرکاری خزانہ کو معقول بچت ایک اہم بات تھی۔ زراعت کے حوالے سے شمسی اور قمری سال کے اعتبار سے ٹیکسوں کا بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مالیاتی سال کے اختتام پر سرکاری خزانہ میں بھی رقم کی کمی نہیں رہتی تھی کیونکہ دونوں اقسام کے ٹیکسوں کی وصولی کا موسم مختلف ہوتا تھا۔

حج کے معانی:

(181) رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کا خطبہ 9 ذوالحجہ، جمعۃ المبارک، 10 ہجری (6 مارچ 632 عیسوی) کو ارشاد فرمایا تھا۔ اسی روز قرآن الحکیم کی یہ عظیم الشان آیت مبارکہ نازل ہوئی۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (المائدہ:3)

"(لو) تمہارا دین ہم نے آج کامل کردیا
آج ہے تم پر ہماری نعمتوں کا تکملا
(تکملا یعنی مکمل ہونا)
کی پسند اسلام کی ملت تمہارے واسطے"

اگر یہ بات "تاریخی" طور پر درست ہے کہ اسلام کے چار ستونوں (ارکان یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج) میں حج سب سے آخر میں آتا ہے تو یہ ظاہر کرنا باقی رہ جاتا ہے کہ حج کا "روحانی" مرتبہ ورتبہ کیسے متعین ہوگا!

(182) مذاہب کی تاریخ میں خدا کے گھر کی زیارت ایک بے مثل و بے مثال عمل ہے۔ دنیا کے تمام بڑے مذاہب میں "حج" عملی طور پر موجود ہے، مگر سوائے اسلام کے ہر مذہب میں یہ فرض نہیں بلکہ نیک عمل قرار دیا جاتا ہے۔ صرف اسلام میں تمام مرد و عورت مسلمانوں پر زندگی میں ایک دفعہ حج فرض ہے (طاقت واستطاعت کی شرط کے ساتھ) تاہم دوسرے مذاہب میں "حج" کی جگہ یا تو کسی لائق تعظیم وتکریم ہستی کا مقبرہ ہے جس کو خراج عقیدت پیش کیا جاتا ہے یا قدرت کا کوئی اعجوبہ جیسے کہ کسی بڑے دریا کا منبع، دریاؤں کا سنگم یا اسی طرح کی کوئی اور چیز جسے دیکھ کر عقیدت وتوصیف بھرے خوف کے جذبات پیدا ہوں اور جو روحانی فرحت وتسکین کی بجائے سیاحوں کے لئے زیادہ کشش کا باعث ہو۔ اسلام میں حج کے لئے خدائے وحدہٗ لاشریک کا مکہ میں واقع گھر زیارت کے لئے وقف ہے۔ (محبوب خدا حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا روضہ مبارک مدینہ منورہ میں ہے جس کا ارکان حج سے براہ راست کوئی تعلق نہیں)۔

(183) لفظ "کعبہ" کے لغوی معنی چوکور اور دائروی کے ہیں اور درحقیقت اس کا زمینی نقشہ دونوں طرح کا ہے۔ [۩] یہ کہا جاتا ہے کہ یہ انسانی دل کی شکل کی نمائندگی کرتا ہے۔ ایک مشہور ومعروف حدیث قدسی (خدا تعالیٰ جل شانہٗ کا ارشاد) میں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "زمین اور آسمان کی وسعتوں میں میرا سمانا ممکن نہیں لیکن میں مومن کے دل میں سما سکتا ہوں۔" چنانچہ خدائے بزرگ و برتر کے گھر کی شکل (مومن کے دل کی شکل سے بہتر نہیں ہوسکتی تھی۔

(184) بہشت سے نکالے جانے کے بعد حضرت آدم علیہ السلام نے محترمہ حوا کو کھو دیا۔ کافی تلاش و جستجو اور رب رحیم و کریم کی رحمت سے ان (دونوں) کی ملاقات عرفات کے میدان میں ہوئی جہاں انہوں نے اپنی غلطی کی معافی مانگی اور (معافی مل جانے پر) رب رحمٰن و رحیم کا شکر ادا کیا۔ حضرت آدم علیہ السلام اور محترمہ حوا کی اولاد ہونے کے حوالے سے فطری طور پر ہمارے لئے عرفات کا میدان برکتوں کا مقام ہے۔ ہم بھی وہاں اپنے گناہوں کو یاد کر کے غفور و رحیم سے معافی طلب کرتے ہیں۔

(185) ہمارے روحانی بزرگوں میں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ آپ علیہ السلام ہر چیز سے زیادہ رب تعالیٰ جل شانہٗ سے محبت کرتے ہیں چنانچہ آپ علیہ السلام کی آزمائش کے لئے رب ذوالجلال نے آپ علیہ السلام کو حکم دیا کہ آپ علیہ السلام اپنے بڑھاپے کی اولاد اکلوتے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو قربان کریں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر ایسا کرنے کا فیصلہ کیا۔ جب آپ علیہ السلام اپنے بیٹے کو لے کر گھر سے دور کسی مناسب (اور قربانی کے لئے) آسان جگہ جا رہے تھے تو شیطان نے بھیس بدل کر آپ علیہ السلام کو (اپنے ارادے سے باز رہنے کی) ترغیب دی لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے شیطان کو پہچان لیا اور اس کا پیچھا کر کے اس پر پتھر برسائے۔ پھر شیطان نے کسی اور بھیس میں آ کر لڑکے (حضرت اسماعیل علیہ السلام) کی والدہ ماجدہ کو بہکانے کی کوشش کی۔ انہوں نے بھی شیطان کو پتھر مارے۔ بالآخر وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے پاس ایک اور بھیس میں آیا اور انہیں ورغلانے کی کوشش کی۔ ان سے بھی اُسے کھانے کو پتھر ہی ملے۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیٹے کی گردن پر چھری چلا دی لیکن یہ کیا! یہ تو ایک دُنبہ تھا جو ذبح ہوا پڑا تھا جبکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام صحیح سلامت پاس ہی کھڑے تھے۔ رب کائنات جل شانہٗ نے جبرئیل علیہ السلام کو یہ معجزہ دکھانے کے لئے بھیجا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل اللہ (اللہ تبارک و تعالیٰ کا دوست) کا خطاب ملا اور آپ علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے بیٹے کے فدیہ کے طور پر بھیڑوں کی قربانی دیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ علیہ السلام کے بعد میں آنے والے اس پر عمل کرتے رہے۔ اور چار ہزار سال گزر جانے کے باوجود اہل اسلام (حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت پر عمل پیرا ہوتے ہوئے) شیطان کے ستونوں کو کنکر مارتے ہیں اور منیٰ میں جانوروں کی قربانی دیتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے رب تعالیٰ جل شانہٗ سے محبت کا ثبوت پیش کرنے پر انہیں

دوسرے بیٹے حضرت اسحٰق علیہ السلام سے نوازا گیا۔

(186) اس سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے رب جل شانہٗ سے محبت کا ایک اور ثبوت پیش کر چکے تھے۔ وہ اپنے پہلونٹھی کے نوزائیدہ بیٹے اور اس کی والدہ حضرت حاجرہ کو فلسطین سے مکہ کے صحرا میں لائے اور انہیں رب تعالیٰ کے سپرد کر کے وہاں چھوڑ دیا۔ جلد ہی جب کھانے پینے کا سامان ختم ہو گیا تو بچے نے پیاس کے مارے چلانا شروع کر دیا۔ والدہ اِدھر اُدھر دوڑیں اور پانی کی تلاش میں اردگرد دیکھا اور شفقتِ مادری سے مایوس نہیں ہوئیں۔ رب قادر و قدیر نے زم زم کا چشمہ جاری کر دیا اور صحرا میں زندگی کو بچالیا۔ چنانچہ صفا اور مروہ کی پہاڑیوں کے درمیان سعی (ادھر سے اُدھر بھاگتے ہوئے آنا جانا) حضرت حاجرہ کی یاد میں کی جاتی ہے اور اس طرح ایک ماں کی اپنے بیٹے کے لئے محبت کو خراج عقیدت پیش کیا جاتا ہے جو رب رحمٰن ورحیم کی اپنی مخلوق کے لئے محبت کی علامت ہے۔

(187) طوافِ کعبہ اور حج کے دوسرے ارکان اس فرد کے لئے حقیقی طور پر بہت بڑی روحانی پاکیزگی کے حامل ہیں جو ان پر غور کرتا ہے۔ بندہ اپنے رب تعالیٰ جل شانہٗ کو جن ناموں سے پکارتا ہے ان تمام ناموں میں ''بادشاہ'' سے بہتر کوئی نام ایسا نہیں جو رب تعالیٰ جل شانہٗ اور بندے کے تعلق کی بہتر طور پر وضاحت کر سکے۔ یعنی رب تعالیٰ جل شانہٗ ''بادشاہ'' ہیں تو آدمی اس کا ''غلام'' ہے (انسانی زبان و بیان اور تصور و خیال میں اس سے بہتر لفظ نہیں) اگر رب تعالیٰ ہمارے ''بادشاہ'' ہے تو پھر اُن کے پاس نہ صرف خزانے ہوں گے بلکہ ان کا تخت بھی ہوگا اور فوج بھی ہوگی اور وسیع مملکت بھی ہوگی۔

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝

(الجمعہ: 1)

''آسمانوں اور زمین میں ہے جو کچھ (پنہاں، عیاں)
(رات دن) تسبیح خواں اللہ کا ہے (بے گماں
وہ شہنشاہِ (دو عالم وہ خدائے کائنات)
حکمتوں والا، زبردست (اور غالب) پاک ذات''

وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝
(المنٰفقون: 7)

"ہیں خزانے آسمانوں اور زمیں کے (جس قدر)
سب خدا کے ہیں، مگر ہیں یہ منافق بے خبر"

وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا
(الفتح:4)

"لشکرِ ارض و سما، سب ہیں اُسی اللہ کے
وہ خبردار اور ذی حکمت ہے (باور کیجئے) "

عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ
(التوبہ:129)

"میں بھروسہ اُس پہ کرتا ہوں (وہ خالق ہے مرا)
مالکِ عرش عظیم (اور خالقِ ارض و سما)"

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
(البقرہ:107)

"کیا نہیں معلوم تم کو، ہے خدا ہی کے لئے
یہ زمین و آسماں کی سلطنت (آغاز سے)"

اور رب کریم وعظیم کی اس وسیع سلطنت میں ایک بین الاقوامی شہر بھی ضرور ہوگا۔ اور ایک شہر جس کا نام مکہ ہے قرآن الحکیم نے اُسے اُمّ القریٰ (شہروں کی ماں) قرار دیا ہے اور اس سلطنت میں ایک شاہی محل بھی ہوگا (الکعبۃ البیت الحرم)

وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى (الانعام:92)

"اور ڈراؤ ان کو جو مکہ میں ہیں مسکن گزیں"

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ (المائدہ:97)

"ہم نے کعبے کو بنایا، عظمتوں کا جو ہے گھر
امن گاہِ اہل عالم، (عافیت) کا مستقر"

(مستقر یعنی ٹھکانا)

اب انسانی معاشرے نے اس ضرورت کو جان لیا ہے کہ فرمانروا کو خراج عقیدت پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اس سے ذاتی طور پر اظہار وفاداری و اطاعت کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر اہل ایمان رب تعالیٰ جل شانہٗ کے حضور اطاعت اور وفاداری کے اظہار کے لئے کعبۃ اللہ جاتا ہے۔ سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''حجر اسود زمین پر رب تعالیٰ جل شانہٗ کا دایاں ہاتھ ہے۔'' مومن اپنے (دونوں) ہاتھ ''رب تعالیٰ جل شانہٗ کے دائیں ہاتھ'' کے سامنے پیش کرتا ہے اور پھر رب تعالیٰ جل شانہٗ کے گھر کی حفاظت اور ہر دشمن کے خلاف اس کے دفاع کے عزم کے اظہار کے طور پر کعبۃ اللہ کا طواف کرتا ہے۔ وہ سات چکر لگاتا ہے۔ سات کا عدد لامحدود وقت کی علامت ہے (وقت کو ہفتہ کے سات دنوں کے ذریعے شمار کیا جاتا ہے جو ازل سے بار بار خود کو دہرا رہے ہیں)

(188) یہ کوئی تعجب و حیرانی کی بات نہیں کہ اگر نماز رب کائنات کے دربار اقدس میں مومن کی حاضری ہے تو رب قادر و قدیر کے گھر کا حج اطاعت و فرمانبرداری کی معراج ہے۔

باب 7

دوسرے عربی قبائل سے تعلقات

(189) مشرکین مکہ اسلام کے اولین اور بدترین دشمن تھے۔ چنانچہ دفاع کی خاطر سپہ سالار اعظم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بفر (فاصل) ریاستوں (Buffer States) کا ایک سلسلہ قائم کیا یعنی ہر قبیلہ ایک آزاد ریاست کی مانند تھا۔[بفر (Buffer) یا فاصل ریاست اُسے کہتے ہیں جو دو مخالف طاقتوں کے درمیان چھوٹی اور عام طور پر غیر جانبدار ہو] یوں سپہ سالار اعظم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتدریج مکہ مکرمہ کے گرد گھیرا ڈال لیا اور شرافت کے ساتھ اہل مکہ کو مجبور کر دیا کہ وہ مسلم حکومت کی رضا کارانہ اطاعت کریں۔ مدینہ منورہ کے اردگرد بھی (فاصل ریاستوں کا) سلسلہ قائم کیا گیا مگر یہ ہر طرح سے مکمل نہیں تھا کیونکہ تھوڑے ہی فاصلے پر آبادی ختم ہو جاتی تھی۔ عرب میں کئی قبائل آباد تھے جو قریش مکہ سے طاقت میں کسی طرح کم نہیں تھے لیکن یہ سب قبائل بت پرست تھے اور یہ امر نا قابل وضاحت ہے کہ ان قبائل نے عملی طور پر (مسلمانوں کی) مزاحمت کیوں نہیں کی!! اگرچہ مکہ مکرمہ کو فتح کرنے کیلئے 21 سال کی کوشش وکاوش اور دس ہزار سپاہیوں پر مشتمل فوج کی ضرورت پڑی مگر دوسرے قبائل کے خلاف جو بھی مہم روانہ کی گئی وہ تھوڑے سے سپاہیوں یا زیادہ سے زیادہ چند سو سپاہیوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ ان میں سے اکثر قبائل نے فوری اطاعت قبول کر لی حتیٰ کہ انتہائی ترقی یافتہ علاقے جیسا کہ یمن، بحرین (یہ سعودی عرب ہی کا ایک علاقہ تھا۔ اس کا موجودہ بحرین سے کوئی تعلق نہیں)، عمان اور دومتہ الجندل نے جتنی تیزی اور آسانی کے ساتھ اسلام کی اطاعت قبول کی اس صورت حال سے تاریخ دان بھی حیران و پریشان ہیں۔ جہاں تک ساحلی علاقوں کا تعلق ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ علاقے نوآبادیاتی نظام اور غیر ملکی قبضے کے شکنجے میں جکڑے ہوئے تھے اور اسلام انہیں آزاد کرانے کے لیے آیا تھا۔ اسلام نے انہیں حکمرانی وخود مختاری دی اور ان سے کوئی مطالبہ نہیں کیا سوائے اس کے کہ وہ انسانوں کے بنائے ہوئے بے حس و بے جان بتوں کی پرستش ترک کر دیں۔ دوسرے (علاقوں کے) قبائل میں شاید اندرونی اتحاد تک بھی موجود نہیں تھا اور وہ کبھی بھی اپنی تمام قوتوں کو یکجا نہ کر سکے۔ مسلمانوں نے ان کے علاقائی بت خانے تباہ و برباد کر دیے یوں اُن کے بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا مگر

(بت پرستوں کے عقیدہ کے مطابق) بت شکن مسلمانوں پر "خدا کا عذاب" نازل نہ ہوا جس سے فوری طور پر اُن کی (بے بنیاد) توہم پرستی اور اُن کے بتوں کی بے بسی و بے چارگی ثابت ہوگئی۔

(190) اگر کوئی شخص اعداد و شمار کا بغور جائزہ لے تو اسے علم ہو جائے گا کہ (دین اسلام کی سربلندی کیلئے لڑی گئی جنگوں میں) اسلحہ کا استعمال اور خونریزی عملی طور پر نہ ہونے کے برابر تھی۔ سپہ سالار اعظم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ میں آنے کے بعد ہی (مشرکین کے خلاف) جنگ شروع کی تھی اور دس سال بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دار فانی سے تشریف لے گئے۔ اس دہائی میں تین لاکھ مربع کلومیٹر سے زائد علاقہ فتح ہوا یعنی دس سالوں میں اوسطاً 900 کلومیٹر علاقہ روزانہ فتح ہوا۔ اور ان جنگوں کے دوران ہر ماہ دشمن کے دو افراد بھی ہلاک نہیں ہوئے۔ مسلمانوں کا جانی نقصان حتیٰ کہ اس سے بھی کم تھا۔ لاکھوں مربع کلومیٹر علاقے کی فتح کے دوران دو سے تین سو افراد کا میدان جنگ میں مارا جانا دُنیا کی تاریخ میں غیر معمولی اور بے مثل واقعہ ہے۔ انسانی خون کی حرمت (مذہب کی رُو سے حرام) کا تصور بعدازاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحیح ہدایت یافتہ خلفاء کو بھی ورثہ میں ملا۔

(191) یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کس طرح مشرکین مکہ کے حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیے مدینہ منورہ کے اردگرد فاصل ریاستوں کا سلسلہ قائم کیا تھا۔ مسلمانوں کے ان اتحادی قبیلوں کی فاصل ریاستوں سے دُور بے شمار دوسرے قبیلے آباد تھے۔ ان میں سے کچھ اسلام سے بلاوجہ دشمنی رکھتے تھے۔ ان کے ساتھ جنگوں میں زیادہ خونریزی نہیں ہوئی۔ اب ہم ان کے بارے میں مختصراً بیان کریں گے۔

(192) (مدینہ منورہ کے) شمال مشرق میں غطفان۔ فزارا، مشرق میں سُلیم اور جنوب مشرق میں ہوازن نامی قبائل آباد تھے۔ یہ سب آپس میں عم زاد تھے اور ان کے خاندان کے بڑے کا نام قیس تھا جس کی یہ سب اولاد تھے۔
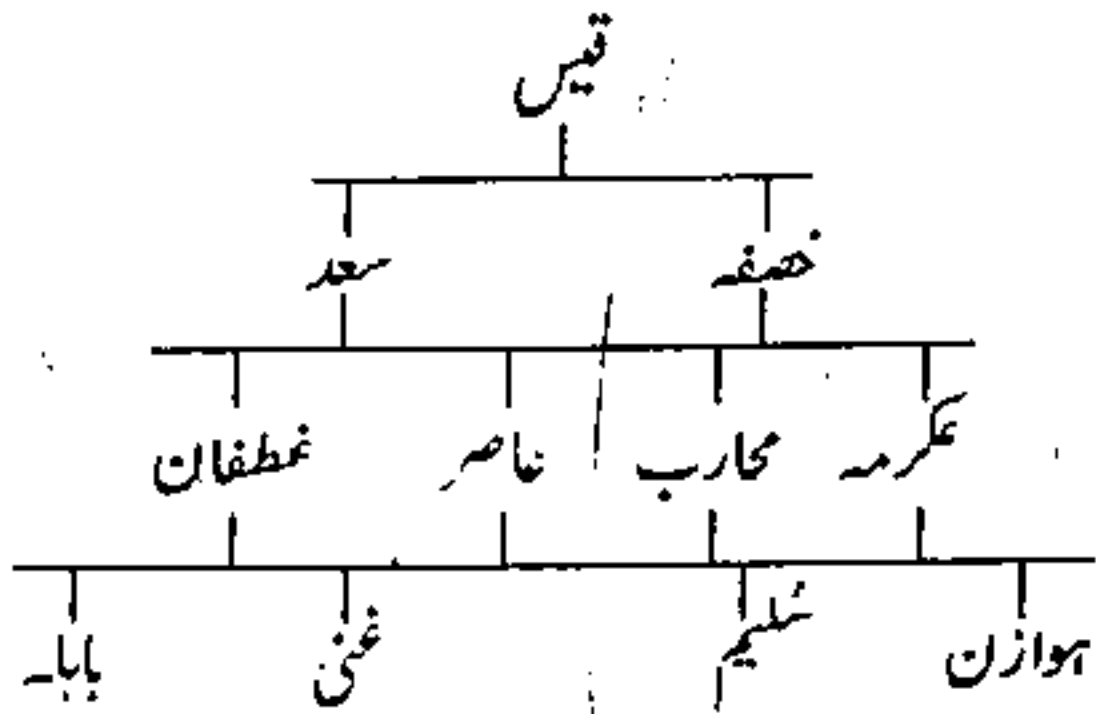
ابن حبیب جیسے قدیم تاریخ دانوں کے نزدیک تین قبائل (1) سلیم-ہوازن (2) غطفان (3) عاصر-محارب کو ایک ہی نام اثافی (وہ پتھر جن کے درمیان میں آگ جلا کر اُن کے اوپر برتن رکھ کر کھانا پکایا جاتا ہے) سے پکارا جاتا تھا۔ ان کا یہ نام (اپنے معنی اور خوبی کے حوالے سے) بالکل صحیح تھا۔ یہ قبائل مدنی مسلم سلطنت کے قریب ترین پڑوسی تھے۔ جو قبائل جزیرہ نمائے عرب کے انتہائی شمال، انتہائی مشرق اور انتہائی جنوب میں آباد تھے ان سے مسلم مملکت کا رابطہ محض دوسرے مرحلہ میں ہی ہو سکتا تھا اور اس رابطہ کا تعلق عرب کی بیرونی ریاستوں یعنی بازنطین اور ایران سے بھی تھا کیونکہ عرب میں ان کی نوآبادیاں قائم تھیں۔ آیئے ہم پہلے گروپ سے آغاز کرتے ہیں۔

سُلیم:

(193) قبیلہ سُلیم کے مکہ سے قریبی اور قدیمی تعلقات تھے۔ چوتھی سے چھٹی پشت تک رسول مکرم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تین دادیاں جن کا ایک جیسا نام "عاتکہ" تھا قبیلہ سُلیم سے تعلق رکھتی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا جناب ابو طالب نے قبیلہ سُلیم کی ایک شاخ کے ساتھ اتحاد کیا ہوا تھا مگر یہ سب کچھ بے فائدہ رہا۔ ہو سکتا ہے کہ رسول رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قبیلہ سُلیم سے تعلقات ظہور اسلام سے پہلے ہی خراب ہو چکے ہوں کیونکہ اہل مکہ اور بنوقیس کے قبائل کے مابین مشہور "الفجار" نامی جنگیں ہوئی تھیں جن میں سے ایک یا دو جنگوں میں سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نوجوانی کے زمانے میں (اہل مکہ کی طرف سے) حصہ لیا تھا۔ "الاماکن" میں الحازمی روایت کرتے ہیں کہ قبیلہ سُلیم نے مالک ابن خالد ابن صخر ابن الشارد کو تاج پہنا کر اُسے اپنا بادشاہ بنایا۔ اسی وجہ سے اس کا عرف "ذوالتاج" تھا تاہم وہ ایک قبائلی جنگ "یوم برزا" میں قتل ہوا۔ جب مکی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نبوت و رسالت کا اعلان کیا تو شاید بنوقیس والوں نے یہ خطرہ محسوس کیا کہ مستقبل میں (مکہ والے اسی نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وجہ سے) ان کی بالادستی ختم کر دیں گے اور یوں عرب میں ان کی حکومت کا امکان نہیں رہے گا چنانچہ اسی حسد نے انہیں اسلام کے خلاف جنگ کی طرف دھکیلا۔ کشیدگی کی ابتداء (آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی) ہجرت سے پہلے کی روایت کی گئی ہے۔ مشہور بت العزیٰ قبیلہ سُلیم کا بت تھا اور قبیلہ غطفان والے بھی اس کی تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ یہ نخلہ کے بت خانہ میں تھا۔ اس بت خانہ کا متولی و محافظ افلح السلمی بستر مرگ پر تھا کہ ابولہب اس کی بیمار پرسی کو گیا تو اُس نے (ابولہب کو) اپنی فکر و تشویش سے آگاہ

کرتے ہوئے کہا ''ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میری موت کے بعد العزّٰی کو نقصان پہنچے گا'' ابولہب نے اسے یہ کہہ کر تسلی دی کہ وہ اسلام کے خلاف اس (العزّٰی) کا دفاع کرے گا۔

(194) رسول رحمت حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت کے بعد حضرت عبداللہ ابن جحش رضی اللہ عنہ کی سربراہی میں ایک فوجی گشتی دستہ روانہ کیا جس نے ''نخلہ کے مقدس علاقہ'' میں اہل مکہ کے واپس جاتے ہوئے ایک تجارتی قافلے کو لوٹ لیا اور قافلہ والوں کو قیدی بنالیا۔ اس سے قبیلہ سُلیم کے مفادات پر زد پڑی جس سے وہ مسلمانوں سے ناراض ہو گئے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلم فوجی دستے کے سربراہ کی اس کارروائی پر پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا مگر قبیلہ سُلیم کی خوشنودی کے لیے بھی کچھ نہ کیا گیا۔ دو ماہ بعد جب جنگ بدر ہوئی تو نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قبیلہ سُلیم کی دشمنی کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ ایک ہفتہ بعد رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرقرۃ الکدر تشریف لے گئے تاکہ قبیلہ سُلیم کے ایک ذیلی قبیلہ کو سزا دیں۔ اسلامی فوج نے ان کے 500 اونٹ مال غنیمت کے طور پر قبضہ میں لے لیئے جس سے قبیلہ سُلیم اور مسلمانوں کے تعلقات مزید خراب ہو گئے۔ چنانچہ قبیلہ سُلیم اور قبیلہ غطفان دونوں نے مدینہ منورہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ان کے خلاف دفاعی اقدام کے طور پر ''ذوامر'' اور ''بحران'' (اسے بحرین بھی کہا جاتا تھا) کی جانب بالترتیب 450 اور 300 مسلم رضا کاروں پر مشتمل دو مہم روانہ کی گئیں۔ دشمن بھاگ گیا اور (مسلمانوں کے) تعاقب سے بچ نکلا۔ بحران (بحرین) کی مہم کے دوران سپہ سالار اعظم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بذات خود دو ماہ تک موقع پر موجود رہے اور صلح کی کوشش جاری رکھی۔ دشمن کے عمر رسیدہ اور عقل مند افراد صلح کی حمایت میں تھے جبکہ نوجوان ڈٹے رہے چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس آ گئے تاہم نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صلح کی کوششیں جاری وساری رکھیں اور قبیلہ سُلیم کے عم زاد قبیلہ کلاب سے بہتر تعلقات کے قیام میں کامیاب ہو گئے جس کے سردار نے مسلمان مبلغین کو 4 ہجری میں اپنی ذاتی حفاظت میں اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔ 40 سے 70 افراد پر مشتمل مسلمان مبلغین کے پُر امن وفد کو وہاں پر بئر معونہ کے قریب دھوکے سے حملہ کر کے شہید کر دیا گیا جس سے رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بہت رنج ہوا مگر ان دنوں ہادیٔ کون ومکاں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام تر توجہ مکہ اور خیبر کی خراب صورت حال پر تھی چنانچہ مسلمان مبلغین کا خون بہانے والوں کو سزا نہ دی جا سکی۔ قبیلہ سُلیم کے سرداروں کی ضد اور ہٹ دھرمی کے باوجود قبیلہ

کے افراد نے دائرہ اسلام میں داخل ہونا شروع کر دیا اور آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے اعزازات وتحائف بھی حاصل کرتے رہے جن میں زمینیں بھی شامل تھیں۔ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قبیلہ سُلیم ہی کے ایک فرد حضرت ابوالعوجاء کو 7 ہجری میں مسلم مبلغین کے وفد کے ساتھ تبلیغی مشن پر بھیجا گیا مگر یہ گروپ بھی شہید کر دیا گیا۔ تاہم ایک سال بعد مکہ مکرمہ فتح کرنے والی مسلمان فوج میں قبیلہ سُلیم کے بہادر فوجی دستہ خاص طور پر گھڑسوار دستہ نے سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ (اس مہم میں) حصہ لیا۔ تاریخ دانوں نے یہ بات ریکارڈ نہیں کی ہے کہ قبیلہ سُلیم کے افراد کا اتنی بڑی تعداد میں دائرہ اسلام میں داخل ہونے کی وجہ کیا تھی! ہوسکتا ہے کہ مادی مفادات وفوائد کی کشش اس کی وجہ ہو چنانچہ وہ شروع شروع میں اسلام میں اتنے زیادہ مخلص اور وفادار نہیں تھے۔ درحقیقت فتح مکہ کے بعد جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبیلہ ہوازن (قبیلہ سُلیم کا عم زاد) سے جنگ کے لیے روانہ ہوئے تو قبیلہ سُلیم کے افراد اسلامی فوج سے فرار ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے نہ صرف بھاگتے ہوئے قبیلہ ہوازن کے افراد کا پیچھا کرنے سے انکار کر دیا بلکہ دوسرے مسلمانوں کو بھی ایسا کرنے سے روکا۔ اس کے باوجود رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مایوس نہ ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مال غنیمت سے قبیلہ سُلیم کے فوجی دستوں کو وافر اور کثیر مقدار میں حصہ دیا۔ بتدریج پُرانی دشمنیاں اور عداوتیں بھلا دی گئیں۔

ہوازن:

(195) نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رضائی والدہ محترمہ حلیمہ بی بی کا تعلق قبیلہ ہوازن سے تھا۔ فتح مکہ کے بعد قبیلہ ہوازن کے افراد مسلمانوں سے خوفزدہ ہو گئے۔ انہیں خطرہ تھا کہ ان کا عظیم شہر طائف بھی بت شکن اسلام کے قبضہ میں چلا جائے گا اور طائف میں اُن کے بت "لات" والے بت خانہ کی قسمت بھی وہی ہوگی جو کعبہ میں رکھے گئے بتوں کی ہوئی ہے لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی اور اسلام کی پیش قدمی کو روکنا ناممکن تھا۔ جنگ حنین میں شکست کے بعد ہوازن نے طائف کے فوجی محاصرے میں (مسلمانوں کی) مزاحمت کی تھی لیکن طائف والے مکہ کی مارکیٹ اور اپنے دوستوں سے جدا ہو چکے تھے۔ ایک سال بعد طائف والوں نے اسلام قبول کر لیا۔ تاہم انہوں نے دینی معاملات میں کچھ مراعات حاصل کیں۔ تبلیغ اسلام کے طریق کار کے نقطۂ نظر سے یہ حقیقت بڑی اہمیت کی حامل ہے چنانچہ اس کی کچھ تفصیلات کو بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

(196) (ہوازن کا) ایک وفد مدینہ منورہ پہنچا اور اپنے بت ''لات'' کو نہ چھیڑنے کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ ایک خدا پر ایمان لانے، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رب تعالیٰ جل شانہٗ کا پیغمبر ماننے کے لیے تیار ہیں لیکن انہیں نماز پڑھنے، زکوٰۃ دینے اور جہاد کرنے کی چھوٹ دی جائے۔ مزید یہ کہ انہیں شراب پینے، زنا کرنے اور قرض دی ہوئی رقم پر سود لینے سے نہ روکا جائے۔ اس کے علاوہ طائف کے شہر کو ایسا متبرک علاقہ قرار دیا جائے کہ جہاں جنگلی جانوروں کا شکار اور جنگلی درختوں کی کٹائی ممنوع ہو۔

(197) زکوٰۃ، جہاد کے لیے جنگی رضا کاروں کی فراہمی اور طائف کو متبرک شہر قرار دینے کے حوالے سے ہوازن کے مطالبات پر رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی مرضی ظاہر کر دی۔ نماز کے بارے میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''وہ تو مذہب کہلانے کا حقدار نہیں جس میں خالق کی پرستش وعبادت کا تصور نہ ہو۔'' زنا کی اجازت بارے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن سے سوال کیا ''کیا تم میں سے کوئی اس بات کی اجازت دے گا کہ اُس کی بیوی، اس کی بہن یا اُس کی بیٹی کی عزت کوئی اجنبی شخص پامال کرے؟ اگر اس کا جواب منفی (یعنی ''نہیں'') میں ہے تو جس عورت کے ساتھ تم ناجائز تعلقات رکھنا چاہو گے وہ بھی تو کسی کی بیوی، بہن یا بیٹی ہوگی اور وہ شخص اس بے عزتی کو کس طرح نظر انداز کرے گا؟'' وفد کے اراکین نے یہ بات تسلیم کر لی (یعنی اپنا مطالبہ واپس لے لیا)۔ سود کے حوالے سے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں چند ماہ کی مہلت دے دی تا کہ وہ اپنے پرانے قرضوں کا لین دین ختم کر سکیں لیکن نئے قرضوں پر سود کسی صورت برداشت نہیں کیا جائے گا۔ ''لات'' والے بت خانے کے حوالے سے نبی رحمت حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بڑے اطمینان وسکون سے فرمایا ''تمہیں اس کو خود گرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم یہاں سے اپنے آدمی بھیجیں گے جو ''لات'' کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے اور یوں ''لات'' کا غضب ان لوگوں پر ہی نازل ہو گا۔'' آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شراب کے حوالے سے کوئی رعایت دینے سے بھی انکار کر دیا۔ اس حوالے سے نبی رحمت حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جواب کی تفصیل کی عدم دستیابی کی وجہ سے یہی سوچا جا سکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا ہو گا کہ شراب کا نشہ انسانوں کو درندوں سے بھی بدتر بنا دیتا ہے۔

(198) اس پر (ہوازن کے) وفد نے ذاتی صلاح مشورہ کے لیے کچھ دیر وقفہ کیا۔ انہوں نے (رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے) جوابات کو ازحد مناسب قرار دیتے ہوئے اسلام قبول کر لیا۔

(199) جب (ہوازن کا) وفد چلا گیا تو مدنی مسلمانوں نے جو اس طرح ''مراعات'' دینے پر حیران و پریشان تھے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہمارے ماں باپ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قربان! یہ فرمایئے کہ کیا زکوٰۃ اور جہاد جیسے فرائض منسوخ ہو چکے ہیں؟'' رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''نہیں۔ بالکل نہیں مگر جب ان لوگوں میں اسلام سرایت کر جائے گا تو یہ خود ہی ان مراعات کو واپس کر دیں گے۔'' درحقیقت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بالکل درست فرما رہے تھے۔ دوسرے لوگ (ان مراعات کی وجہ سے) طائف والوں کو دوسرے درجہ کا مسلمان کہہ کر طنز کرتے تھے۔ یوں دو سال بعد معلم کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال سے پہلے ہی طائف والوں نے دوسرے مسلمانوں کی طرح اسلامی حکومت کو زکوٰۃ کی ادائیگی کا آغاز کر دیا اور آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے موقع پر انہوں نے مسلح رضا کار دستے بعض علاقوں کے باغیوں کی شورش و بغاوت کو کچلنے کے لیے مدینہ منورہ بھیجے۔

(200) ''لات'' کی تباہی و بربادی کا منظر قابل دید تھا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک بہت پہلے اسلام قبول کرنے والے طائف کے ایک مسلمان حضرت المغیرہ رضی اللہ عنہ ابن شعبہ کی سربراہی میں ایک دستہ طائف بھیجا جس میں حضرت ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی شامل تھے۔ حضرت المغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بت کی تباہی و بربادی کا منظر دیکھنے کے لیے طائف والوں کو اکٹھا کیا۔ اور بت پر پہلی ضرب لگاتے ہی آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے (ظاہرا) ایک زوردار چیخ ماری اور گر گئے جیسے کہ وہ بے ہوش ہو گئے ہوں۔ جب ناپختہ ایمان افراد نے یہ دیکھا تو وہ بڑے خوش ہوئے (کیونکہ انہوں نے سمجھا کہ یہ ''لات'' کی سزا ہے) پھر حضرت المغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہنستے ہوئے طنزیہ انداز میں اُٹھ کھڑے ہوئے اور چند اور ضربیں لگا کر بت کو ملیا میٹ کر دیا۔ اس سے ان لوگوں کے ایمان میں پختگی آ گئی جو ابھی یقین اور بے یقینی کی درمیانی کیفیت میں تھے۔

غطفان:

(201) یہ لوگ اپنی اقتصادی ضروریات کیلئے کسی اور علاقہ کی بجائے خیبر شہر پر انحصار کرتے تھے۔ یہ مکمل طور پر خانہ بدوش تھے چنانچہ ان کی کسی شہر میں کوئی مستقل رہائش نہیں تھی۔ ان کے عم زاد قبیلہ سُلیم کے ساتھ مسلمانوں کی کشیدگی نے ان کو مسلمانوں کے خلاف اُبھارا اور انہوں نے اپنی ناراضی کا اظہار قزاقی، لوٹ مار اور چھاپہ مار کارروائیوں جیسے حربوں سے کیا۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کشادہ دلی اور ذہنی وسعت کا مظاہرہ کیا جس نے سادہ مزاج

بدوؤں کو دین اسلام کی کسی فلسفیانہ اور عالمانہ تشریح سے زیادہ متاثر کیا۔ مثلاً ذوامر کی جانب روانہ کی گئی اسلامی فوج کی ایک تعزیری و تادیبی مہم میں جب دشمن بھاگ گیا تو مسلمانوں سے لڑنے والا کوئی نہ رہا۔ (اس دوران بارش ہوئی) بارش کے بعد پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنا (گیلا) لباس بدل کر ایک درخت پر خشک ہونے کیلئے لٹکا دیا اور خود آرام فرمانے لگے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھیوں (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) نے بھی لازماً ایسا ہی کیا ہوگا اور صحرا میں اِدھر اُدھر پھیل گئے ہوں گے۔ رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو تنہا دیکھ کر ایک قریبی پہاڑی کی چوٹی پر پناہ لیئے ہوئے دشمن کے ایک سردار نے خاموشی سے نیچے اُتر کر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تلوار اپنے قبضے میں لے لی اور چلایا ''اب آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کو مجھ سے کون بچا سکتا ہے؟'' سردار الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کسی پریشانی کے بغیر جواب دیا ''میرا اللہ!'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اس اعتماد و یقین نے سادہ دل بدوی سردار کو ہلا دیا۔ وہ کانپنے لگا اور تلوار اُس کے ہاتھ سے گر گئی۔ اب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے تلوار اٹھالی اور (بدوی سردار سے) پوچھا ''اب تمہیں مجھ سے کون بچائے گا؟'' ذوالثور نامی بدوی سردار نے جواب دیا ''کوئی بھی نہیں'' آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُسے معاف فرما دیا اور جانے کی اجازت دے دی۔ وہ رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رحمدلی سے اتنا متاثر ہوا کہ وہ نہ صرف فوری طور پر مشرف بہ اسلام ہوا بلکہ اپنے قبیلہ میں اسلام کا سرگرم مبلغ بھی بن گیا۔

(202) قبیلہ غطفان کی کچھ شاخیں ''اشجاع'' اور ''عامر ابن عکرمہ'' مدینہ منورہ کے نواح میں آباد تھیں۔ ان کے روزگار کا انحصار علاقہ سے گزرنے والے قافلوں پر تھا۔ وہ ہجرت (مدینہ) کے ابتدائی سالوں میں ہی آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دست مبارک پر ایمان لے آئے اور فائدہ مند اتحادی ثابت ہوئے۔

(203) جب تک مکہ اور خیبر والے مسلمانوں کے دشمن رہے قبیلہ غطفان کا سب سے بڑا سردار عیینہ ابن حسن الفزاری نے مسلمانوں کو تنگ کرنا جاری رکھا مگر بعدازاں اسے سمجھ آ گئی اور اس نے مسلمانوں سے صلح کر لی۔ نتیجتاً اُس کے علاقہ میں اسلام تیزی کے ساتھ پھیلا۔ نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وصال پر عیینہ مرتد ہو گیا مگر جلد ہی اُسے گرفتار کر لیا گیا۔ وہ (اپنی اس حرکت پر) پچھتایا تو خلیفہ (اوّل) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اُسے معاف کر دیا۔ اس غیر متوقع رہائی کی وجہ سے ایک اکھڑ مزاج بدو ایک مخلص مسلمان میں تبدیل ہو گیا۔

باب 8

یہودیوں سے تعلقات

(204) اگرچہ یہودیوں کی آبادیاں شام سے یمن اور عمان تک وسیع تھیں تاہم ان دنوں خیبر کا علاقہ ہی ان کا مرکز تھا۔ وہ مجبوری کے تحت مدینہ منورہ میں رہائش پذیر تھے کیونکہ رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے مملکت اسلامیہ مدینہ منورہ کے لیے جو دستور و آئین نافذ کیا تھا اس میں یہودیوں کو جدا قبیلوں کی حیثیت دے کر نیم وفاقی متحدہ ریاستوں میں ایک خودمختار اکائی کے طور پر تسلیم نہیں کیا گیا تھا بلکہ انہیں دو عرب قبائل اوس یا خزرج کے اتحادیوں کے طور پر مانا گیا تھا۔ یہودیوں کا تعلق قبائل کے تین بڑے گروپوں بنوقینقاع، بنونضیر اور بنوقریظہ سے تھا۔ ان تینوں میں باہمی چپقلش رہتی تھی اس لیے ان کے اتحادی بھی علیحدہ علیحدہ تھے۔ بعض نے بنواوس کے ساتھ جبکہ بعض نے بنواوس کے دشمنوں کے ساتھ اتحاد و اتفاق کر رکھا تھا۔

(205) بنوقینقاع کے زرگر انتہائی پست اخلاق کا مظاہرہ کرتے تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے شرارتاً ایک مسلمان خاتون کو برہنہ کر دیا۔ نتیجتاً مسلمانوں اور یہودیوں میں جھگڑا ہوا۔ چنانچہ سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنوقینقاع کے تمام خاندانوں کی بجائے صرف ان خاندانوں کو مدینہ منورہ سے نکل جانے کا حکم دیا جو قصوروار تھے اور وہ مدینہ سے نقل مکانی کر کے شام چلے گئے۔

(206) جب رسول رحمت حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انتظامی امور کے سلسلہ میں یہودی گروپ بنونضیر کی بستی کا دورہ کرنے گئے تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کرنے کی سازش کی (نعوذ باللہ) اس پر مسلمانوں نے ان کا محاصرہ کر کے انہیں مدینہ منورہ سے نکل جانے کا حکم دیا تاہم انہیں اس بات کی اجازت دے دی گئی کہ وہ اپنی تمام املاک ساتھ لے جا سکتے ہیں اور مدینہ منورہ میں موجود اپنے قرض داروں سے قرض وصول کر سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنی بے دلی کے اس حکم پر بدنیتی کے ساتھ عمل کیا اور آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نرمی (اور بُردباری) کو کمزوری خیال کیا۔ وہ خیبر میں مقیم ہو گئے اور وہاں سے انہوں نے اہل مکہ، سُلیم، غطفان اور کئی دوسرے (قبائل کے) اجرتی فوجیوں کی مدد سے مدینہ منورہ پر حملہ کیلئے

اپنے آپ کو منظم کیا۔ نتیجتاً جنگ خندق ہوئی۔ بنو قریظہ کے یہودی ابھی تک مدینہ منورہ ہی میں رہائش پذیر تھے۔ رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان پر کافی احسانات کیے تھے اور ان کے حالات بہتر بنانے میں بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ مدینہ منورہ کے دوسرے یہودی بنو قریظہ والوں کو اپنے سے حقیر اور کمتر خیال کرتے تھے حتیٰ کہ اگر بنو قریظہ کے کسی فرد کو قتل کر دیا جاتا تو اس کا خون بہا دوسرے یہودیوں کی نسبت آدھا ادا کیا جاتا تھا مگر رسول رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنو قریظہ کی انسانی عزت و مساوات کو بحال کیا لیکن ان تمام عنایات کے باوجود وہ بنو نضیر کے نمائندوں کے بہکانے پر بغاوت کر کے حملہ آوروں کے ساتھی بن گئے اور اہل اسلام کے دفاعی منصوبوں کو ناکام کرنے کی کوشش کی مگر رب قادر و قدیر نے مسلمانوں کو بچا لیا۔ جنگ خندق کے اختتام پر مسلمانوں نے بنو قریظہ کا محاصرہ کر لیا۔ جب ان پر قابو پا لیا گیا تو رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نرمی برتتے ہوئے ان سے کہا کہ وہ اپنے جرم کی سزا کا فیصلہ کرنے کے لیے خود ہی کسی حکم (جج، منصف) کو منتخب کر لیں (بنو قریظہ نے ایک یہودی سعد بن معوذ کو منصف مقرر کیا۔ اُس کے فیصلہ کے مطابق تین چار سو یہودیوں کو قتل کر دیا گیا۔ ان کی عورتوں اور بچوں کو نیلام کیا گیا اور ان کی املاک پر مسلم فوج نے قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد بنو قریظہ والے شام کی طرف نکل گئے) ایک سال بعد اہل مکہ کی مسلمانوں سے صلح حدیبیہ کی وجہ سے انہوں نے یہودیوں کے حوالے سے غیر جانبداری کا مظاہرہ کیا۔ بعد ازاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے 1500 مجاہدین کے ساتھ خیبر کی طرف پیش قدمی کی۔ یہودیوں نے 20 ہزار سپاہیوں پر مشتمل فوج سے مقابلہ کیا۔ انہوں نے منجنیق اور دوسرے جنگی ہتھیار بھی استعمال کیے لیکن چند ہفتوں ہی میں اسلامی فوج نے خیبر کے قلعہ بند علاقے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ صلح حدیبیہ کے وقت محبوب خدا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے اہل مکہ کی تمام شرائط پر متفق ہونے پر بعض شرائط میں بظاہر مسلمانوں کی کمزوری دکھائی دینے کے حوالے سے عظیم المرتبت حضرت امام السرخسی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ ''خیبر اور مکہ کے مابین فوجی معاہدہ تھا (ایک مدینہ کے شمال میں ہے جبکہ دوسرا مدینہ کے جنوب میں ہے) اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان میں سے کسی ایک کے خلاف بھی کارروائی کرتے تو دوسرا مدینہ منورہ پر حملہ کر دیتا۔'' (بحوالہ ''مبسوط'' 86/X، ''شرح السیر الکبیر'' 201/1) سپہ سالار اعظم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دو دشمنوں کے درمیان گھرے ہونے کی وجہ سے اتنی فوجی قوت نہیں رکھتے تھے کہ دونوں محاذوں (خیبر اور مکہ) پر بیک وقت لڑائی جاری رکھ

سکیں۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہر قیمت پر کوشش یہی تھی کہ ان دونوں میں سے ایک کے ساتھ صلح کا معاہدہ کیا جائے تاکہ دوسرے سے آسانی کے ساتھ نمٹا جا سکے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل مکہ سے صلح کا معاہدہ کرنے کا فیصلہ کیا اور ایک حاجی کے طور پر یعنی حج کرنے کے ارادہ سے وہاں تشریف لے گئے۔ قرآن الحکیم نے یہ کہہ کر کوئی مبالغہ نہیں کیا کہ صلح حدیبیہ مسلمانوں کی کمزوری کا اظہار یا توہین کی بجائے فتح مبین (واضح فتح) اور نصر عزیز (طاقتور امداد) تھی۔

﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۙ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۙ وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ۝

(الفتح: 1 تا 3)

"(اے پیغمبر) ہم نے تم کو فتح دی، فتح مبیں
تاکہ (کوشش کچھ زیادہ تم کرو از بہر دیں)
اگلی پچھلی سب خطائیں رب تمہاری بخش دے
اور تم پر اپنے احسانات بھی پورے کرے
اور چلائے تم کو سیدھے راستے پر دین کے
اور خدا تم کو زبردست (اور بڑی) امداد دے"﴾

(207) جب خیبر والوں کو شکست ہو گئی تو رسول مکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے ساتھ انتہائی نرمی برتی۔ اسلامی فوج کو بھی ان سے نرم سلوک کرنے کی ترغیب دی گئی۔ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شرفاء یہود میں سے ایک ایسی خاتون جس نے خفیہ طور پر اسلام قبول کیا ہوا تھا شادی کی۔ [دراصل اس خاتون (حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا) نے خواب میں دیکھا تھا کہ چاند آسمان سے اُتر کر اس کی گود میں آ گیا ہے اور یہودی کاہنوں نے اُسے بتایا تھا کہ اُس کی شادی عرب کے حکمران حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ہو گی] اب چونکہ خیبر کے یہودی پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رشتہ دار بن گئے تھے تو فطری طور پر اسلامی فوج کے سپاہیوں کے دلوں میں ان کے لیے نرمی پیدا ہو گئی۔ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہودیوں کو سرکاری زمینوں کے مزارعوں کی حیثیت سے خیبر میں رہنے کی اجازت دے دی۔ بنو عریض کے جو یہودی مدینہ منورہ میں رہ گئے تھے ان کے

ساتھ بھی بڑا رحمدلانہ اور فیاضانہ سلوک کیا گیا اور انہیں سالانہ وظائف جاری کیے گئے۔ جب تک یہ لوگ خود امن پسند رہے کسی نے ان کے ساتھ جھگڑا نہیں کیا۔ انہیں مذہبی، قانونی و عدالتی اور اقتصادی معاملات میں مکمل آزادی و خودمختاری دی گئی جس سے وہ بہت خوشحال ہوئے۔ اہل کتاب ہونے کی وجہ سے ''اللہ جل شانہٗ کے بندوں'' کے ساتھ (یعنی یہودیوں کے ساتھ) خالص بت پرستوں کی نسبت ترجیحی سلوک کیا جاتا تھا۔ لیکن اللہ جل شانہٗ کے بندوں کو یہ علم ضرور ہونا چاہیے کہ حقوق یکطرفہ طور پر نہیں ملا کرتے۔ اگر وہ رب ذوالجلال کے احکام و فرائض کا احترام نہیں کریں گے تو اللہ تبارک وتعالیٰ انہیں اتنی ہی سخت سزا دیں گے اور مرضی تو محض رب قادر و قدیر ہی کی چلتی ہے۔

(208) جب 9 ہجری میں محبوب خدا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض مالیاتی اصلاحات لاگو کیں تو اُن میں ٹیکسوں کی ادائیگی کے حوالے سے مسلمانوں اور یہودیوں و عیسائیوں کے مابین فرق رکھا گیا۔ مسلمان دوسری چیزوں کے ساتھ اپنی بچت پر ٹیکس ادا کرتے تھے جبکہ روپیہ جمع کرنا ان کے لیے قابل سزا جرم تھا تاکہ روپیہ گردش میں رہ کر فائدہ مند ثابت ہو۔ غیر مسلموں پر یہ ٹیکس نہیں لگایا گیا تھا۔ اس کے بجائے وہ لوگ جزیہ دیتے تھے مگر بچوں، عورتوں، غریبوں اور کئی دوسروں کو جزیہ سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔ مسلمانوں کے لیے قرضوں پر سود لینا حرام تھا جبکہ غیر مسلموں کو سودی کاروبار کی اجازت دی گئی، لیکن غیر مسلموں کو درآمد پر کسٹم ڈیوٹی (اس دور میں اس ڈیوٹی کو عربی میں جمروک کہا جاتا تھا) دوگنا ادا کرنا ہوتی تھی۔ زرعی زمین پر مسلمان فصل کا دسواں حصہ بطور ٹیکس ادا کرتے تھے جبکہ غیر مسلم معاہدہ کے مطابق یا نقد ادائیگی کرتے تھے۔ تاہم مسلم اور غیر مسلم دونوں میں زرعی ٹیکس کے حوالے سے کوئی نمایاں فرق نہیں تھا۔

باب 9

غیر ملکی تعلقات

بازنطین:

(209) سپہ سالارِ اعظم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہچکچاہٹ کے ساتھ محض دفاع کے لیے جنگیں لڑی تھیں اور جب اسلام کے پرانے دشمنوں نے اپنی بے وقوفانہ دشمنی ختم کر دی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا صرف اور صرف ایک ہی مقصد و مطلب رہ گیا کہ عرب کے ساتھ غیر ملکی ممالک میں بھی پُر امن طریقے سے دین اسلام کی تبلیغ و تشہیر کی جائے۔

(210) سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیبیہ کے مقام سے واپسی پر کہ جہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اہل مکہ کے ساتھ پُر امن بقائے باہمی پر مفاہمت میں کامیاب و کامران رہے تھے اور فتح مکہ کا تو ذکر ہی کیا! خیبر پر قبضے کا انتظار کیے بغیر فوراً ہی بیرونی ممالک میں اپنے قاصد روانہ کرنا شروع کر دیے۔ 7 ہجری میں رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بازنطین، مصر، حبشہ اور ایران کے حکمرانوں کے نام اسلام قبول کرنے کی دعوت پر مشتمل خطوط روانہ فرمائے۔ نبی مکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان ممالک کی جانب خطوط بھیجنے کے لیے ایسے افراد منتخب کیے جو پہلے ہی ان ممالک میں جا چکے تھے اور کسی حد تک وہاں کی زبان سے واقف تھے۔

(210 الف) رسولِ مکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جن حکمرانوں کو خطوط بھیجے ان میں ایک معمولی گھرانے کا فرد ہرقل ایک فوجی انقلاب کے نتیجے میں قسطنطنیہ کا حکمران بنا تھا۔ اس نے انہی دنوں ایرانیوں پر زبردست فتح حاصل کرنے کے بعد انہیں اپنی مملکت پر قابض علاقوں سے مار بھگایا تھا۔ شہنشاہ ہرقل فطرتاً ''حقیر عرب'' کے اجنبی باشندے کے سامنے اپنی ''بے عزتی'' کرانے کے موڈ میں نہیں تھا کیونکہ عرب کا ایک حصہ خود اس کی سلطنت کی ایک نوآبادی تھا (یعنی وہ کسی عربی باشندے سے ملاقات کو اپنی بے عزتی سمجھتا تھا) ہرقل نے اپنے ایک سردار کو صرف اس لیے تختۂ دار پر لٹکا دیا تھا کیونکہ اُس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اُس نے ایک گورنر کو جس نے بین الاقوامی قوانین اور اصول وضوابط کی واضح خلاف ورزی کرتے ہوئے مسلم سفیر کو قتل کر دیا تھا پناہ دی تھی۔ جب پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

مسلم سفیر کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے ایک چھوٹی سی فوجی مہم موتہ بھیجی تو ہرقل نے ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ مسلمانوں کا مقابلہ کیا۔ اس کا رویہ ایک بے اصول اور ظالم و جابر حکمران کا تھا۔ مسلمان تاریخ دانوں کے مطابق ایک بڑے پادری نے جب اسلامی تعلیمات سے رغبت اور دلچسپی کا اظہار کیا تو عوام نے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ ہو سکتا ہے کہ اس واقعہ کی وجہ سے ہرقل نے دین اسلام کے حوالے سے بے توجہی کا مظاہرہ کیا (تاکہ عوام کہیں اُس کے بھی مخالف نہ ہو جائیں) حالانکہ اس توہم پرست بادشاہ نے انہی دنوں بعض ڈراؤنے خواب بھی دیکھے تھے اور اپنے کتب خانہ میں موجود اپنے زیر مطالعہ علم نجوم کی بعض کتب میں اپنی قسمت کا حال بھی پڑھ لیا تھا۔ مزید یہ کہ وہ نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بارے بعض پیش گوئیاں بھی پڑھ چکا تھا۔ نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہرقل کے نام جو خط لکھا تھا اُس کا اصل مسودہ کئی صدیوں تک سپین میں موجود رہا۔ اب یہ خط دوبارہ ظاہر ہوا ہے مگر سائنسی طور پر یہ مطالعہ کرنا باقی ہے کہ کیا موجودہ ملنے والا خط مستند و معتبر اور مصدقہ ہے!

(211) پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خطوط کے جوابات نرم زبان میں کسی حد تک انکار پر ہی مبنی تھے۔ انسانی معاشرہ مذہب اور مابعد الطبیعیات (وہ علوم جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات وصفات سے تعلق رکھتے ہیں) اعتقادات کے بارے میں سب سے زیادہ قدامت پرستی اور تعصب کا شکار رہا ہے۔ لیکن ایسا دعوے دار جو اپنے دعوے میں پُر یقین و پُر اعتماد ہو کبھی مایوسی کا شکار نہیں ہوتا۔ اگر شروع میں اُسے کامیابی و کامرانی نہ بھی حاصل ہو تو وہ بلاواسطہ یا بالواسطہ ذرائع استعمال کرتے ہوئے بار بار کوشش و کاوش کرتا ہے۔ ایرانیوں اور بازنطینیوں دونوں نے عرب کے اندر اور مضافات ونواح میں اپنی نوآبادیاں قائم کر رکھی تھیں۔ وہ عربوں کو غلام بنا کر انہیں دوسرے درجہ کے شہری سمجھنے کے ساتھ ساتھ کمتر نسل خیال کرتے تھے۔ رسول رحمت حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یونانیوں سے براہ راست رابطہ کرنے سے پہلے ان سے رابطے کا فیصلہ کیا۔

(212) پہلے ہی سے سینٹ پال کے دور میں عرب نہ صرف کافی دُور وسیع علاقے تک آباد تھے بلکہ انہوں نے شمال تک دمشق میں بھی ریاستیں قائم کر رکھی تھیں۔ اس وقت اس علاقے کا حکمران حارث نامی ایک شخص تھا۔ سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں اس علاقے میں غسان نامی عرب قبیلہ آباد تھا جس نے عیسائیت قبول کر لی تھی۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس قبیلہ کے مختلف سرداروں کے نام بھی خطوط بھجوائے اور انہیں

مشرف بہ اسلام ہونے کی دعوت دی۔

(213) نبی رحمت حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہلا خط حارث ابن ابی شمیر کو لکھا مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کا اُس نے مثبت جواب نہیں دیا۔ جلد ہی اس کا انتقال ہوگیا۔ یہ 8 ہجری کا واقعہ ہے پھر اُس کے جانشین جبلہ ابن الایہم کو بھی دعوت اسلام کا خط بھیجا گیا۔ اس کے مشرف بہ اسلام ہونے کے بارے میں متضاد روایات ہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بصریٰ کے حکمران کے نام بھی دعوت اسلام پر مبنی خط بھیجا۔ یہ خط حضرت حارث ابن عمیر الازدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ لے کر گئے مگر عیسائی سردار شرحبیل ابن عمرو الغسانی نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قاصد کو گرفتار کر کے شہید کر دیا۔ عیسائی سردار کا یہ عمل تمام بین الاقوامی اصولوں و ضابطوں کی واضح خلاف ورزی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قاصد کے قتل کا تاوان طلب کیا اور مجرموں کو سزا دینے کا مطالبہ کیا لیکن شہنشاہ ہرقل نے مسلمانوں کی چھوٹی سی فوج کے مقابلے میں ایک لاکھ فوجیوں پر مشتمل وہ فوج روانہ کر دی جو اُس نے ایران کی مہم کے لیے بھرتی کی تھی اور ابھی اسے فارغ نہیں کیا گیا تھا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس مہم کے لیے تین ہزار مجاہدین پر مشتمل فوج خشکی کے راستے اور کچھ مدد سمندر کے راستے بھجوائی۔ مسلم فوج کا مقابلہ موتہ کے مقام پر ہرقل کی فوج سے ہوا۔ نڈر مسلمان کسی صورت بھی دشمن کی تعداد سے خوفزدہ نہیں تھے تاہم مسلمانوں کے دو سینئر جرنیل جن میں کمانڈر انچیف حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لے پالک بیٹے) اور ان کے نائب حضرت جعفر الطیار ابن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا زاد) نے جام شہادت نوش فرمایا۔ ان کے بعد اسلامی فوج نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنا سپہ سالار منتخب کیا۔ انہوں نے دشمن کو اس قدر بھاری جانی نقصان پہنچایا کہ دشمن کو مسلم فوج کا پیچھا کرنے کی ہمت نہ ہوئی اور اسلامی فوج بحفاظت مدینہ منورہ پہنچی۔ اس کے بعد سپہ سالار اعظم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک عظیم الشان مہم تبوک کی تیاری شروع کر دی۔ 9 ہجری میں سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سربراہی میں تیس ہزار مجاہدین پر مشتمل اسلامی فوج مہم پر روانہ ہوئی۔ راستے میں اسلامی فوج جس جگہ ٹھہرتی وہاں ایک مسجد تعمیر کر دی جاتی۔ انہوں نے پورے شمالی عرب اور جنوبی فلسطین پر مسلمانوں کی حکومت قائم کر دی۔ اسلامی فوج نے دومتہ الجندل، مقنہ، ایلہ، جرہا اور اذرح جیسے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ یہ تمام شہر بازنطینیوں نے خالی کر

دیئے تھے۔ان میں ایلہ کی بندرگاہ ازحد اہمیت کی حامل تھی۔ علاقہ کی عرب آبادی نے عیسائیت قبول کرنے کے باوجود بازنطینیوں کے ظلم وستم کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ وہ رواداری اور تحمل بردار مسلم حکومت کے تحت زندگی گزارنے پر خوش تھے۔ان علاقوں پر مسلمانوں کا قبضہ مستحکم ہو گیا اور اب رومی شہنشاہ ان میں مداخلت نہیں کر سکتا تھا تاہم ابھی اسلامی سلطنت کی سرحدوں کی صورت حال اتنی زیادہ مستحکم نہیں تھی چنانچہ ڈیڑھ سال بعد ایک اور فوجی مہم روانہ کی گئی۔ یہ مہم عین اس روز روانہ ہوئی جس روز نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عالم بقا کی جانب روانہ ہوئے۔اس مہم کو بھیجنے کا فیصلہ سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا تھا چنانچہ خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیصلہ برقرار رکھا۔ اسلامی فوج کا کمانڈر حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو مقرر کیا گیا۔حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ جنگ موتہ میں اسلامی فوج کی سربراہی کرتے ہوئے شہید ہو چکے تھے۔اس فوج نے اسلامی سلطنت کی حدود کو شمال کی جانب مزید وسعت دی اور یوں جلد ہی فلسطین پر بھی مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گئی۔

(214) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معان کے عرب گورنر کو بھی مشرف بہ اسلام ہونے کی دعوت دی وہ دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا مگر ہرقل نے حکم دے کر اُسے شہید کروا دیا۔

مصر:

(215) مملکت بازنطین کے ایک صوبہ کا نام مصر تھا۔ جب ایرانیوں نے اس پر قبضہ کر لیا تو انہوں نے قبطیوں (مصریوں) سے انتہائی ہمدردانہ اور فیاضانہ برتاؤ کیا جو کہ بازنطینی حکومت کے فرقہ وارانہ مظالم سے تنگ آ چکے تھے۔ایرانیوں نے قبطیوں (مصریوں) میں سے ایک شخص کو ان کا سربراہ بنا دیا جسے مقوقس کا خطاب دیا گیا-مقوقس کے لفظ کا ماخذ ایرانی (فارسی) معلوم ہوتا ہے-ایرانیوں کو جب نینوا کے مقام پر بادشاہ ہرقل کے ہاتھوں شکست کا سامنا ہوا تو انہیں مصر بھی خالی کرنا پڑا۔شاید یہی وہ دور تھا جب سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبطیوں کے سردار کو خط ارسال کیا اور اسے مشرف بہ اسلام ہونے کی دعوت دی۔قبطی سردار نے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نامہ مبارک کا انتہائی مودبانہ اور دوستانہ جواب دیا تاہم مقوقس کے قبول اسلام کا بنیادی مقصد حاصل نہ ہو سکا۔ جو متعدد تحائف مقوقس نے اسلامی سفیر، (حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ) کو دیئے انہیں وہ مدینہ منورہ لے آئے۔

ان میں دو سے چار کنیزیں بھی شامل تھیں۔ ماریہ نامی ایک کنیز کو سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیٹے حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی والدہ ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی بہن کا نام حضرت شیریں رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھا جو خالص ایرانی نام ہے۔ (حضرت شیریں رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نکاح کر لیا)۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ دونوں بہنیں ایرانی النسل ہوں۔ حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے (اسلام قبول کرنے سے قبل) عیسائیت قبول کر لی تھی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کے والد ایرانی اور والدہ قبطی (مصری) ہوں۔ ہمیں اس سے زیادہ تفصیل معلوم نہیں سوائے اس کے کہ حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بخوشی اور برضا و رغبت اسلام قبول کر لیا تھا جس کی بناء پر نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں اپنی زوجہ ہونے کا اعزاز وافتخار بخشا (اور وہ مومنین کی والدہ ماجدہ قرار پائیں)۔

(216) حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مقوقس کو جو خط لکھا تھا اس کا اصل مسودہ اب تک محفوظ ہے اور ان دنوں استنبول کے ایک مشہور عجائب گھر توپ کاپی (Topkapi) میں موجود ہے۔

حبشہ:

(217) حبشہ کا علاقہ یمن کے قریب تھا مگر باب المندب کی تنگ گھاٹی اسے یمن سے علیحدہ کرتی تھی۔ ظہور اسلام سے کافی پہلے مکہ اور حبشہ کے آپس میں انتہائی قریبی اقتصادی تعلقات تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک یہودی شہزادے "ذونواس" نے عیسائیوں پر (مذہبی مخالفت کی بناء پر) اتنے ظلم و ستم کیے کہ حبشہ کے عیسائیوں نے یمن پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا لیکن فاتح عیسائی جرنیل آپس میں حسد و رقابت کی وجہ سے ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے۔ حبشہ کے بادشاہ نے اس خونریزی کو دیکھتے ہوئے ابرہہ کو یمن کا وائسرائے بنایا۔ یہ وہی ابرہہ تھا جو کعبۃ اللہ کو تباہ کرنا چاہتا تھا (نعوذ باللہ) کیونکہ اس کے خیال میں عرب میں عیسائیت کے فروغ میں کعبہ سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ اس کی فوج میں ایک (محمود نامی) ہاتھی تھا جو اس نے مکہ مکرمہ پر حملے میں استعمال کیا۔ وہ اپنی فوج لے کر طائف سے گزرا مگر اُس نے "لات" کے بت خانہ کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا کیونکہ طائف والوں نے اُسے مکہ مکرمہ کا راستہ بتانے کے لیے (ابورغال نامی) گائیڈ مہیا کیا تھا۔ قرآن الحکیم کی 105 ویں سورۃ "الفیل" اس وقت نازل ہوئی جب ان لوگوں کی اکثریت زندہ تھی جنہوں نے اپنی آنکھوں سے مکہ پر ابرہہ کا حملہ دیکھا تھا۔ اگرچہ یہ لوگ اسلام کے دشمن تھے مگر

انہیں سورۃ الفیل کے متن و مضمون کی تردید کی ہمت و جرأت نہ ہوئی۔ یہ واقعہ اسی سال وقوع پذیر ہوا تھا جس سال محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت ہوئی۔

﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ۝ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝

(الفیل: 1 تا 5)

"(اے پیغمبرؐ) کیا نہ دیکھا تم نے (غور و فکر سے)
ہاتھی والوں سے کیا (برتاؤ) کیا اللہ نے؟
کیا نہیں اُس نے غلط سب داؤ اُن کے کر دیئے
اور پرندے جھنڈ کے جھنڈ اُن پر بھیجے (غیب سے)
پھینکتے تھے اُن پہ جو کنکر کی (چھوٹی) پتھریاں
کر دیا کھائے ہوئے بھس کی طرح ان کو (وہاں)"﴾

(218) بعد ازاں ایرانیوں نے بہت جلد یمن پر فوج کشی کی اور حبشہ کی حکومت کے مخالف یمنیوں کے تعاون سے حکمرانوں کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔

(219) آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جن حکمرانوں کی جانب خطوط بھیجے اُن میں حبشہ کا بادشاہ نجاشی (اس کا اصل نام اصحمہ تھا) بھی شامل تھا۔ اصحمہ نجاشی سے مسلمانوں کے روابط و تعلقات اس خط سے پہلے ہی سے قائم تھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعلان نبوت و رسالت کے تقریباً 5 سال بعد مکہ مکرمہ میں ایک خدا اور نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ماننے والوں پر اس قدر ظلم و ستم کیا گیا کہ انہوں نے اپنے وطن کو چھوڑ کر سمندر پار کے ملک حبشہ میں پناہ کا فیصلہ کیا۔ ہم نے ایک خط کا حوالہ بھی دیا ہے جو شاید رسول رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے چچازاد حضرت جعفر ابن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ شاہِ حبشہ کے نام ایک تعارفی رقعہ کے طور پر بھیجا تھا۔ اگلے سال مکہ والوں نے دو سفارتی وفد حبشہ بھیجے جن کے ذریعے کہا گیا کہ مسلمانوں کو حبشہ سے بے دخل کر کے اُن کے حوالے کیا جائے مگر مکہ والوں کو ناکامی و نامرادی کا منہ دیکھنا پڑا۔ جب اہل مکہ کا دوسرا سفارتی وفد حبشہ گیا تو سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اپنا ایک سفیر حبشہ روانہ کیا تا کہ اہل مکہ کی

سازش کا بھرپور مقابلہ کیا جا سکے۔ اس دور کی حبشہ کی تاریخ کا علم نہیں ہو سکا جس کی وجہ سے یہ قطعی اندازہ لگانا مشکل امر ہے کہ حبشہ کے جس شاہ نجاشی نے مکی مسلمانوں کو پناہ دی تھی اور دس سال بعد جس نجاشی بادشاہ نے مکہ والوں کے دوسرے سفارتی وفد سے ملاقات کی تھی وہ ایک ہی شخصیت تھی یا دو مختلف شخصیتیں تھیں۔ تاہم قیاس یہی ہے کہ یہ ایک ہی شخصیت تھی اور سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس سے دوستانہ مراسم تھے۔ تاریخ گواہ ہے کہ رسول مکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے جو خط لکھا تھا اس میں اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خط کا اصل مسودہ اس وقت دمشق میں موجود ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ شاہ نجاشی مشرف بہ اسلام ہو گیا تھا مگر وہ اپنی رعایا کو قبول اسلام کی ترغیب دینے میں ناکام رہا تھا۔ نجاشی کا قبول اسلام اس حقیقت سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق نجاشی کی وفات کی خبر ملنے پر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی غائبانہ نماز جنازہ کا اہتمام فرمایا تھا۔ اس کے بعد آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے جانشین کو بھی دعوت اسلام پر مبنی خط لکھا مگر اُس نے اسلام قبول نہیں کیا تاہم حبشہ کے شہریوں کی ایک معقول تعداد دائرہ اسلام میں داخل ہو گئی جن میں شاہ نجاشی کا ایک بیٹا بھی شامل تھا جو بعد میں مدینہ منورہ آ گیا تھا اور اس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان کی کفالت میں رہتے ہوئے یہیں رہائش اختیار کر لی۔

(220) یہ امر قابل ذکر ہے کہ حبشہ کو بازنطینی سلطنت کی نوآبادی کے طور پر ظاہر نہیں کیا گیا بلکہ اس کا اتحادی بتایا گیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایسا اس لیے کیا گیا ہو کیونکہ دونوں ملک ایک ہی مذہب عیسائیت پر ایمان وایقان رکھتے تھے۔

(221) عرب میں حبشہ کے کئی باشندے موجود تھے۔ موذن رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس وجہ سے حبشی کہا جاتا تھا کیونکہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حبشہ کے رہنے والے تھے۔ ایک اور یاسر نامی شخص کا تعلق ”نوبیا“ سے تھا۔ رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے آزاد کر دیا تھا جس کے بعد وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خادم بن کر مدینہ منورہ میں رہائش پذیر رہا مگر یہ افراد کس طرح اور کیسے عرب پہنچے اس کا علم نہیں ہو سکا۔ کیا ان کو حبشہ سے اغوا کر کے عرب میں بطور غلام فروخت کیا گیا تھا یا پس منظر میں کوئی اور وجہ تھی؟ اس حوالے سے کچھ کہنا مشکل و ناممکن ہے۔

ایران:

(222) ایران کی بھی بازنطینی سلطنت کی طرح کی کہانی ہے۔ اس نے بھی عرب میں نوآبادیاں قائم کر رکھی تھیں۔ اگرچہ عربوں میں باہمی اختلافات کافی حد تک تھے مگر ان میں اپنی عزت و وقعت کا احساس بھی انتہا کا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ بہترین وفادار اتحادی ثابت ہوئے۔ چنانچہ بازنطینیوں کے بہترین وفادار اتحادی بنو غسان تھے۔ اسی طرح حیرہ (کوفہ) کے لوگ ایران کے اتحادی تھے۔ حیرہ کی متحدہ ریاستوں کے حکمران کو ایرانی شاہی خاندان پر اس قدر اعتماد پیدا ہوا کہ اُس نے ولی عہد شہزادہ ''بہرام گور'' کو بچپن میں مدائن کے شاہی دارالخلافہ میں رکھنے کی بجائے اس کی بہتر پرورش و تربیت کے لیے حیرہ بھیج دیا لیکن آنے والے وقتوں اور نسلوں میں یہ صورت حال تبدیل ہوگئی۔ ایران کے ایک شہنشاہ نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ حیرہ کا حکمران اپنی بیٹی کو شاہی حرم میں بھیجے مگر حیرہ کے حکمران کے انکار پر اُسے مدائن میں بلوا کر قتل کر دیا گیا۔ اس پر حکومت ایران کے خلاف عربوں نے بغاوت کر دی۔ شہنشاہ ایران نے عربوں کو سبق سکھانے کی خاطر حیرہ پر فوج کشی کی تو عربوں نے بہادری سے مقابلہ کرتے ہوئے شاہی فوج کو جنوبی عراق میں ذوقار کے مقام پر زبردست شکست دی۔ یہ واقعہ تقریباً انہی دنوں ہوا جب جنگ بدر لڑی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ ذوقار کی جنگ کے دوران عربوں کا جنگی نعرہ ''یا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)'' تھا۔ جب یہ خبر مدینہ منورہ پہنچی تو رسول مکرم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''یہ پہلا موقع ہے کہ عربوں نے ایرانیوں سے انتقام لیا ہے اور انہیں یہ فتح میری وجہ سے حاصل ہوئی ہے۔'' رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایران کے مرحوم شہنشاہ نوشیروان کی عادلانہ و منصفانہ حکومت کے بارے میں بہت اچھی رائے رکھتے تھے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایرانیوں کی آتش پرستی اور زرتشت کی طرف سے مذہب کو بے توقیر کرنے والی اپنی گھڑی ہوئی نئی نئی باتوں کی تبلیغ کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ اس کا حوالہ قرآن الحکیم میں بھی دیا گیا ہے۔

﴿ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۝ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۝ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ۭ وَيَوْمَىِٕذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ بِنَصْرِ اللّٰهِ ۭ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝

(الروم: 2 تا 5)

"ہو گئے ہیں رومی، مغلوب اک قریبی ملک میں
بعد مغلوبی، وہ پھر آئیں گے غالب (سن رکھیں
چند برسوں میں تھا پہلے بھی خدا کو اختیار
اور اس کے بعد بھی (اللہ ہے مختارِ کار)
ہوں گے اُس دن خوش مسلماں (بھی) بہ امدادِ خدا
وہ مدد کرتا ہے جس کی چاہتا ہے (برملا)
ہے وہ غالب، رحم والا (قدرتوں والا بڑا)"

آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدینہ منورہ کی جانب ہجرت سے پہلے ایرانیوں نے رومی (بازنطینی) سلطنت پر حملہ کر کے شام، فلسطین اور مصر پر قبضہ کر لیا تھا۔ قرآن الحکیم میں کہا گیا ہے کہ رومی (بازنطینی) ہمسایہ ممالک میں شکست کھا چکے ہیں مگر چند سالوں کے اندر وہی فتح مند ہوں گے۔ [روم پر عیسائیوں کی حکومت تھی جبکہ فارس پر آتش پرست حکمران تھے۔ مسلمان چاہتے تھے کہ عیسائیوں کو فتح حاصل ہو کیونکہ وہ اہل کتاب ہیں مگر فارس جیتا اور روم ہار گیا۔ کئی سال بعد دونوں قوتوں میں پھر مقابلہ ہوا تو رومی غالب آ گئے] عیسائیوں کو نسبتاً مسلمانوں کے قریب تصور کیا جاتا تھا جبکہ آتش پرستوں کو مشرکین مکہ کا ہم خیال سمجھا جاتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے اس ردعمل کا اظہار ہوا ہے۔

(223) جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے 7 ہجری میں کسریٰ یا خسرو پرویز (ایران کے بادشاہوں کا لقب جسے عربی میں کسریٰ جبکہ فارسی میں خسرو کہا جاتا تھا) کو پرانا مذہب چھوڑ کر نئے مذہب اسلام قبول کرنے کی دعوت پر مشتمل خط لکھا۔ اگر چہ اس خط کا اصل مسودہ ہم تک پہنچا ہے تاہم یہ کہنا مشکل ہے کہ رسول رحمت حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ خط خسرو پرویز نے خود وصول کیا تھا یا اس کے کسی جانشین نے وصول کیا تھا کیونکہ بالکل انہی دنوں ہی ایرانیوں کو نینوا پر مکمل تباہی و بربادی برداشت کرنا پڑی تھی۔ شہنشاہ ایران خود اپنے بیٹے کے ہاتھوں قتل کر دیا گیا تھا۔ تخت بدنظمی کی صورت حال تھی اور دارالخلافہ میں تخت کے وارثوں کی تبدیلی جلدی جلدی ہو رہی تھی۔ بہرحال یہ بات طے ہے کہ اسلامی سفیر کے ساتھ انتہائی حقارت و توہین کا سلوک کرتے ہوئے شاہی دربار سے نکال دیا گیا۔ حضرت امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی بیان کردہ ایک حدیث پاک کے مطابق ایران کی ایک ملکہ نے مدینہ منورہ میں اپنا سفیر بھیجا جو کہ تحائف لے کر سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت

اقدس میں حاضر ہوا۔ اُس کی آمد کا مقصد سابق شہنشاہ کی طرف سے مسلمانوں کو پہنچائی جانے والی تکلیف واذیت اور بے عزتی کی تلافی تھا۔ ایران کی اس ملکہ کا نام شاید "بوران دوخت" تھا جو تھوڑے سے عرصہ کے لیے ایران کے تخت پر حکمران رہی۔ وہ اس حقیقت سے خوفزدہ اور پریشان تھی کہ عرب میں ایرانی نوآبادیات نے بغاوت کر دی تھی۔

(224) درحقیقت شہنشاہ ایران کے منفی روّیے کی وجہ سے نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی توجہ کا رُخ عرب میں ایرانی نوآبادیات کی طرف موڑ دیا تھا جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بازنطینی سلطنت کے حوالے سے کیا تھا کیونکہ ان ایرانی نوآبادیات کے نہ صرف عوام بلکہ حکمران بھی زیادہ تر عربی تھے۔ یمن، عمان، بحران یا بحرین (یہ موجودہ بحرین نہیں ہے بلکہ وہ علاقہ ہے جو آجکل سعودی عرب کے مشرقی سرحدی صوبہ الحساء پر مشتمل ہے) اور جزیرہ نمائے عرب کے انتہائی شمال مشرقی علاقے ایرانی نوآبادیات (مقبوضات) پر مشتمل تھے۔

(225) خصوصاً یمن میں صورت حال مخدوش اور سنگین تھی۔ ثقافتی حوالے سے یمن انتہائی ترقی یافتہ اور ازحد شاندار ماضی کا حامل تھا۔ یمن میں روم اور ایتھنز سے بھی پہلے مہذب حکومتیں قائم رہی تھیں۔ نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ظہور سے محض ایک نسل پہلے یمن میں عظیم الشان سلطنت قائم تھی اور اس کی حدود میں نہ صرف مکمل جزیرہ نمائے عرب بلکہ وہ وسیع وعریض علاقے بھی شامل تھے جو بعدازاں بازنطینی اور ایرانی سلطنتوں کا حصہ بنے۔ یہی یمن اب ایرانیوں کے خلاف برسرپیکار تھا۔ ایرانیوں کی غلامی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے یمنیوں نے یمن میں سکونت پذیر ایرانیوں کے ساتھ ایرانی نسل کے حاکموں اور فوجیوں کو بھی قتل کرنا شروع کر دیا تھا۔ ایسے حالات میں جب حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یمن والوں کو دائرہ اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دی تو انہوں نے اس کا مثبت جواب دیا جس پر آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو وہاں بھیجا۔ نتیجتاً یمن کے کافی قبیلے مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ وہاں نجران کے عیسائیوں نے مسلمانوں کی اطاعت قبول کر کے امن وامان کے ساتھ زندگی گزارنے کو فوقیت دی۔ یمن کا عقل منداور باشعور ایرانی گورنر "باذان" بھی آگ کی پرستش ترک کر کے خدائے وحدہٗ لاشریک کی پرستش کرنے لگا اور بڑا مخلص مسلمان بن گیا۔ رسول رحمت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اسے گورنر کے عہدہ پر برقرار رکھا اور کچھ مدت بعد جب اس کا

انتقال ہوا تو رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے بیٹے "شہر" کو گورنر بنا دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس عمل سے یمن میں مقیم کافی تعداد میں ایرانیوں میں لازماً تحفظ کا احساس پختہ ہوا ہوگا۔ ہادیٔ کون و مکاں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ سے کافی لوگوں کو یمن کے انتظامی معاملات سنبھالنے کے لیے روانہ فرمایا۔ یہ سب لوگ متقی اور پرہیزگار تھے۔ ان میں بعض مثلاً حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ یمنی النسل تھے۔ ان اصحاب کرام رضوان اللہ اجمعین نے وہاں بحیثیت منصف، اُستاد، ٹیکس وصول کنندہ اور عام انتظامی افسران کی حیثیت سے نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کی مسجد آج بھی قصبہ "جند" میں موجود ہے انسپکٹر جنرل تعلیمات کے عہدہ پر فائز کیے گئے۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یمن کے ہر علاقے کا دورہ کیا اور وہاں دینی تعلیم کا انتظام واہتمام کیا۔ خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چند مسلمان فوجی دستے یمن کے اس بت کدہ کو گرانے کے لیے بھی روانہ فرمائے جسے کعبہ کا ہم رتبہ خیال کیا جاتا تھا۔ جب اس بت کدہ کو مسمار کیا گیا اور بت شکنوں پر (مشرکین کے عقیدہ کے مطابق) بتوں کا کوئی عذاب نازل نہ ہوا تو یمن کے سادہ لوح عوام کے دلوں میں موجود وہم اور بے بنیاد خیالات و خدشات ختم ہو گئے۔ یوں جلد ہی عملاً چند یہودی خاندانوں اور نجران کے ایک عیسائی قبیلہ کے علاوہ پورا یمن دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا۔

(226) نجران کے عیسائی مذہبی معاملات میں از حد منظم تھے۔ ظہورِ اسلام سے پہلے وہاں غیر ملکی عیسائی مبلغ تک آتے تھے۔ ایسا ہی ایک مبلغ اٹلی کا "گریکنٹس" تھا جس نے نجران میں مذہبی تعلیم کو راسخ کیا۔ یہودی بادشاہ "ذونواس" نے مذہبی مخالفت کی بنیاد پر بنو نجران پر جو ظلم و ستم کیے اس وجہ سے اپنے مذہب پر اُن کا اعتقاد و اعتماد اور بھی پختہ ہو گیا۔ قرآن الحکیم میں "اصحاب الاخدود" کا ذکر اسی حوالے سے ہے۔

قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ ۙ النَّارِ ذَاتِ الۡوَقُوۡدِ ۙ اِذۡ هُمۡ عَلَيۡهَا قُعُوۡدٌ ۙ وَّهُمۡ عَلٰى مَا يَفۡعَلُوۡنَ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ شُهُوۡدٌ ؕ وَمَا نَقَمُوۡا مِنۡهُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ يُّؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَمِيۡدِ ۙ

(البروج: 4 تا 8)

"خندقوں والے (خدا کے قہر سے) مارے گئے
آگ (تھی ان میں بھری) ایندھن (بہت سا ڈال کے)
جبکہ وہ ان (خندقوں) پر (خود ہی) تھے بیٹھے ہوئے
کرتے تھے جو مومنوں پر (ظلم) اُسے تھے دیکھتے
وہ مسلمانوں سے لیتے تھے عوض اس بات کا
لائے کیوں ایماں خدا پر جو ہے غالب (کبریا)
(اور) جو (لاریب) ہے شائستہ حمد (وثناء)"

[لغت میں "اخدود" زمین کی لمبی کھائی یا خندق کو کہتے ہیں۔ مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ کچھ مومنین نے اپنے عقیدے سے مرتد ہونے سے انکار کر دیا تو ان کے بادشاہ متعصب یہودی "ذونواس" نے انہیں آگ میں جلا دیا۔ صحیح مسلم حدیث 3005 میں ہے کہ جب بادشاہ نے خندق کھودنے کا حکم دیا اور اس میں ہر طرف آگ جلا دی تو اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ ہر صاحب ایمان مرد و عورت کو باہر لائیں اور انہیں آگ پر کھڑا کر کے پیش کش کریں۔ اگر وہ دین چھوڑ دیں تو اچھی بات ہے ورنہ انہیں آگ میں پھینک دیں۔ ایک عورت اپنے بچے کو گود میں اٹھائے لائی۔ وہ آگ میں چھلانگ لگانے سے قدرے ہچکچائی تو بچہ بول اٹھا "ماں! مضبوط رہ! بلاشبہ تُو حق پر ہے۔"]

نجران والوں نے اپنا ایک وفد بھی اپنے بڑے پادری اور اس کے نائب کی قیادت میں مدینہ منورہ بھیجا۔ یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ نجران میں عیسائی لوگ منظم و مربوط تھے۔ یہ وفد اس امید و آس کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچا کہ وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تثلیث و صلیب کے عقیدہ پر قائل و مائل کر لیں گے چنانچہ انہوں نے مدینہ منورہ پہنچ کر آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بحث و مباحثہ (مذاکرات) بھی کیا۔ یہ مذاکرات مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ہو رہے تھے۔ مذاکرات کے دوران ان کی اجتماعی عبادت کا وقت ہوا تو انہوں نے اپنے کیمپ میں واپس جانے کا ارادہ ظاہر کیا تا کہ وہاں جا کر عبادت کر سکیں مگر رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مہمان نوازی کے اعلیٰ وارفع جذبہ کے تحت اُن سے کہا "اگر آپ لوگ پسند کریں تو اپنی اجتماعی عبادت یہیں اسی مسجد میں ہی کر سکتے ہیں۔" تاریخ دانوں کا کہنا ہے کہ عیسائی وفد کے اراکین نے مشرق کی طرف رُخ کر کے عبادت کی۔ شاید انہوں نے اس عبادت کے لیے اپنی صلیبیں بھی باہر نکال لیں (جو وہ لباس کے اندر گلے میں لٹکائے ہوئے تھے)

مسلمان حیرت و تجسس کے ساتھ انہیں دیکھ رہے تھے اپنی عبادت کے اختتام پر عیسائی وفد نے مذاکرات پھر شروع کر دیئے۔ معلم کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں ایسے (مدلل) جوابات دیئے کہ جن سے وہ خاموش ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے مزید یہ کہا کہ ''آیئے ہم دونوں اللہ تبارک وتعالیٰ سے رجوع کرتے ہیں اگر تمہارا اطمینان نہ ہوا ہو۔ آیئے ہم اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے اور ہم دونوں میں سے جو بھی جھوٹا ہو اُس پر، اُس کے خاندان پر اور اُس کے بچوں پر اپنا عذاب نازل کرے۔''

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۞ فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ۞

(آلِ عمران: 60، 61)

''حق جو کہتا ہے وہی حق ہے، نہ لانا شک کبھی
پھر اگر حجت کرے تم سے کوئی بعدِ وحی
تو یہ کہہ دو ان سے اچھا (اب ذرا میداں میں آؤ
اپنے بیٹے ہم بلائیں، اپنے بیٹے تم بلاؤ
عورتیں اپنی بلائیں ہم، تم اپنی عورتیں
اپنی اپنی ذات سے دونوں شریک اس میں رہیں
گڑگڑائیں مل کے پھر ہم سب خدا کے سامنے
اور بھیجیں اُن پہ لعنت جو ہیں بندے جھوٹ کے''

سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس بات پر عیسائی وفد نے غور کرنے کے لیے وقت مانگا۔ اس دوران انہوں نے اکیلے میں باہمی مشورہ کیا اور انتہائی سمجھ داری و عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سوچا کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) واقعی اللہ تبارک و تعالیٰ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں تو پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بددعا ہمیں دونوں جہانوں میں تباہ و برباد کر کے رکھ دے گی۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے صلح کا معاہدہ کر لیا جائے۔ چنانچہ عیسائیوں نے رضاکارانہ طور پر مسلم سلطنت کی

برتری کو غیر مسلم رعایا کی حیثیت سے تسلیم کرلیا اور خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ایک تحریری معاہدہ کرلیا جس کی رُو سے نجران کے عیسائیوں کو انتظامی و مذہبی معاملات میں مکمل آزادی و خودمختاری دی گئی۔ انہیں یہ بھی اختیار دیا گیا کہ وہ جسے چاہیں اپنا بڑا پادری منتخب کریں تاہم اس کے انتخاب کی توثیق مملکت اسلامیہ سے کرانا لازمی ہوگا۔ سرورِ کونین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حکم دیا کہ وہ اپنے قرض خواہوں کو سود ادا کرنا بند کردیں۔ فطری بات ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ بھی کہا ہوگا کہ وہ سود لینا بھی بند کردیں۔ یہ سب کچھ تحریر کیا گیا اور یہ دستاویز ہم تک پہنچی ہے۔

(227) یمن کے بے شمار دوسرے قبیلوں نے بھی اپنے اپنے وفد مدینہ منورہ بھیجے اور دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ یوں کسی جنگ کے بغیر یمن کا وسیع و عریض علاقہ تین سال کے اندر اندر اسلامی حکومت میں شامل ہوگیا۔

عمان:

(228) عرب کے جنوب مشرق میں ایک ریاست کا نام عمان تھا۔ وہاں پر ''جلندیٰ'' کے دو بیٹوں ''جیفر'' اور ''عبد'' کی مشترکہ حکومت تھی۔ رسول رحمت حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے انہیں دعوت اسلام دی جو انہوں نے قبول کرلی چنانچہ رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنا وعدہ وفا کرتے ہوئے دونوں کو عمان کی حکمرانی پر برقرار رکھا۔ اس طرح حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ اشارہ بھی دے دیا کہ اسلام میں مشترکہ حکومت جائز ہے تاہم ہادیٔ کون و مکاں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے عمان میں اپنے ایک مستقل مقیم نمائندے کا تقرر فرما دیا تاکہ وہاں مسلمانوں کے معاملات اور تعلیم وغیرہ کی نگرانی کی جاسکے۔

(229) عمان کا علاقہ معاشی و اقتصادی لحاظ سے انتہائی اہمیت کا حامل تھا۔ اس کی بیشمار بندرگاہوں اور سالانہ بین الاقوامی تجارتی میلوں نے اسلامی سلطنت کے وقار اور قوت میں اضافہ کیا۔

(230) عبدالقیس کا قبیلہ جیفر کی حکومت کے زیر اثر نہیں تھا بلکہ آزاد تھا کیونکہ انہوں نے اپنا ایک وفد علیحدہ سے ختم المرسلین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت اقدس میں روانہ کیا جس نے مدینہ منورہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے براہ راست مذاکرات کئے۔ وفد کے ارکان کو جب یہ علم ہوا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم عمان کا طویل اور وسیع دورہ کرچکے ہیں تو وہ بہت حیران ہوئے۔ (قدرتی طور پر ظہور اسلام سے پہلے) آپ صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم کافی عرصہ عمان میں گزار چکے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عمان کے بہت سے لوگوں کو ذاتی طور پر جانتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وفد کے اراکین سے عمان کی تازہ خبریں بھی حاصل کیں۔ بات چیت انتہائی خوش گوار ماحول میں ختم ہوئی۔ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق مسجد نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد عبدالقیس کے علاقہ کی مسجد ''جواثا'' میں پہلی بار جمعۃ المبارک کی نماز ادا کی گئی۔

(231) معاشی واقتصادی لحاظ سے یہ علاقہ از حد اہمیت کا حامل تھا۔ دبا اور مشقر کے مقامات پر سالانہ تجارتی میلے بین الاقوامی کشش رکھتے تھے۔ ''دبا'' عرب کی دو بڑی بندرگاہوں میں سے ایک تھی۔ اس کے تجارتی میلہ میں محض عرب کے کونے کونے سے ہی نہیں بلکہ ''چین، ہند، سندھ اور مشرق ومغرب سے اپنا مال تجارت لے کر تاجر شرکت کرتے تھے۔'' بڑی بڑی کشتیوں میں چینی تاجر اپنے ملک سے سیدھے دبا پہنچتے تھے۔ انہوں نے اپنی اعلیٰ وارفع مصنوعات کی بدولت ایسا تاثر قائم کیا کہ نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مشہور فرمان ہے کہ ''علم حاصل کرو چاہے اس کے لیے چین جانا پڑے''۔ جب یہ علاقہ غیر ملکی قبضے سے آزاد ہو گیا تو قدرتی طور پر رسول مکرم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دبا کی بندرگاہ، شہر اور منڈی کی دیکھ بھال کی ذمہ داری دے کر وہاں کے ایک مقامی مسلمان کو دبا کا گورنر مقرر کر دیا۔

بحرین:

(232) جدید جزیرہ بحرین جو کہ خلیج عرب وفارس میں جزیرہ نما عرب کے مشرق میں واقع ہے ان دنوں اُوَل کہلاتا تھا۔ بحرین کا لغوی مطلب ''دو سمندر'' ہے۔ یہ سعودی عرب کا موجودہ ضلع الحساء ہے۔ شاید اس وقت اس علاقے میں موجودہ قطر بھی شامل تھا۔ قطر خاص طور پر خلیج کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے اور دو سمندر وجود میں آتے ہیں۔ بہرحال اس علاقے (بحرین) کے عرب گورنر المنذر ابن ساوہ نے اسلام قبول کیا اور اسلامی حکومت کا انتہائی پُرجوش منتظم ثابت ہوا۔ تاریخ میں رسول رحمت حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام اُس کے نصف درجن سے زیادہ خطوط کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں ایک خط کا اصل ہم تک پہنچا ہے یہ خط پہلی دفعہ برلن کے ایک پبلشرز یڈ ڈی ایم جی نے شائع کیا۔

سماوہ:

(233) شمال مشرقی عرب کا قبیلہ بنو تمیم انتہائی آسانی کے ساتھ مشرف بہ اسلام ہو گیا۔ اس کے مزید شمال میں جنوبی عراق کا علاقہ بھی عربوں کا مسکن تھا۔ اس علاقے میں حیرہ (موجودہ کوفہ) کی ریاست سمیت عرب قبائل رہائش پذیر تھے۔ جنوبی اور مشرقی عرب میں ایرانی

مقبوضات پر دارالخلافہ مدائن کی نواحی آبادیوں کی نسبت حکومت کی گرفت کمزور تھی تاہم حیرہ کے حکمران قبیلہ "لخم" کی کئی شاخیں دائرہ اسلام میں داخل ہوگئیں۔ ہادیٔ کون و مکاں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے اُن کو فراہم کردہ اسناد کا ذکر تاریخ میں موجود ہے۔

(234) سماوہ کا علاقہ حیرہ (کوفہ) کے جنوب مشرق میں ہے۔ امام کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک خط سماوہ کے حکمران ثفاثہ الدیالی کے نام بھی لکھا تھا۔ اس خط کا ذکر تو ملتا ہے مگر اس کی تفصیل نہیں ملتی۔ یہ بادشاہ عربی النسل تھا اور اس بات کے ٹھوس امکانات ہیں کہ اس نے ایرانیوں کی گرفت سے آزادی حاصل کرنے کی خاطر اسلام قبول کیا ہو۔ تاہم کوئی یقینی بات نہیں کہی جا سکتی۔

(235) کیا نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہندوستان سے رابطے اور تعلقات تھے؟ اس حوالے سے کامل یقین کے ساتھ تو کچھ نہیں کہا جا سکتا تاہم یہ ناممکن بھی نہیں۔ عرب تاجروں کی اسلام سے پہلے ہی سندھ اور مالابار کی بندرگاہوں پر کثرت کے ساتھ آمد و رفت رہتی تھی۔ ہندوستانی تاجر بھی جنوب مشرقی عرب کی بین الاقوامی بندرگاہ "دبا" کے سالانہ تجارتی میلے میں شریک ہوتے تھے (بحوالہ "المحبر" از ابن حبیب صفحہ 265) اس بات کا بھی ٹھوس امکان ہے کہ ہندوستانی تاجر یمن بھی جاتے تھے (ابن ہشام صفحہ 42) کیونکہ یمن کے حکمران سیف ابن ذی یزن نے ایک دفعہ ایرانی شہنشاہ کو اطلاع بھجوائی کہ اس کے ملک پر "کووں" نے قبضہ کر لیا ہے۔ چنانچہ اس کی امداد کی جائے۔ کسریٰ نے پوچھا "کون سے کوے؟ یہ ہندوستانی کوے ہیں یا حبشی کوے؟" اگر یمن اور ہندوستان کے مابین مضبوط و مستحکم روابط اور تعلقات نہ ہوتے تو شہنشاہ ایران کے ذہن میں یہ سوال آ ہی نہیں سکتا تھا البتہ جہاں تک "دبا" کا تعلق ہے تو سرورِ کونین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بذات خود وہاں جا چکے تھے (ابن حنبل رحمۃ اللہ علیہ جلد چہارم صفحہ 206 "میں نے تمہارے ملک کا وسیع دورہ کیا ہے" مؤلف نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دو احادیث کا ذکر کیا ہے جن کے مطابق ہادیٔ کون و مکاں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مشقر اور بعض دوسرے علاقوں میں جا چکے تھے) چنانچہ یہ کوئی حیرت و تعجب والی بات نہیں کہ جب یمن کے قبیلہ بل حارث کا وفد مدینہ منورہ پہنچا تو سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا "یہ کون لوگ ہیں جو ہندوستانی دکھائی دیتے ہیں۔" (ابن ہشام صفحہ 960، ابن سعد جلد اوّل صفحہ 72، نسائی 25/41) اسی طرح ابن حنبل رحمۃ اللہ علیہ (جلد دوم صفحہ 229) کے مطابق یمنی النسل حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اکثر کہا کرتے تھے کہ "آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ ہندوستان کی طرف ایک مہم روانہ کی جائے گی۔ اگر میں وہاں شہید ہو جاؤں تو

بہترین شہیدوں میں سے ہوں گا اور اگر میں غازی ہو کر واپس آؤں تو میں وہی آزاد کردہ غلام ابو ہریرہ رہوں گا۔" پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ایک اور حدیث بھی روایت کی جاتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: "مجھے ہندوستان کی طرف سے تازہ ہوا آتی ہے۔"

(236) سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حیات مبارکہ میں صرف ہندوستان کے باشندوں کا ہی نہیں بلکہ اُن کے مذاہب کا بھی ذکر آیا تھا۔ قدیم مسلم مؤرخ عبدالکریم الجلی اور موجودہ دور کے پروفیسر مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم و مغفور نے بھی اس کا حوالہ دیا ہے۔

(237) چنانچہ پیغمبر حضرت ذوالکفل علیہ السلام (لغوی معنی ہیں "کفل" سے آیا ہوا) کے متعلق کہا جاتا ہے کہ "کفل" دراصل گوتم بدھ کی پیدائشی ریاست "کپل وستو" کی عربی شکل ہے۔ ایک اور وضاحت اس طرح ہے کہ "کفل" کے لفظی معنی "خوراک" ہے جبکہ گوتم بدھ کے والد کے نام "سدھودن" کے معنی بھی "خوراک" ہے۔ قرآن الحکیم کی سورۃ 95 میں ہے:

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۙ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۙ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۙ
(التین: 1 تا 3)

"ہے قسم انجیر کی اور ہے قسم زیتون کی
طور سینا کی بھی، اور پُر امن اس بلدہ کی بھی"
(بلدہ یعنی شہر)

مفسرین قرآن کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ان آیات میں شہر سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔ کوہ سینا سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سینائی پہاڑ ہے۔ زیتون حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف اشارہ کرتا ہے جبکہ انجیر کا اشارہ "بڑ" کے اس درخت کی طرف ہے جو جنگلی انجیر کہلاتا ہے۔ گوتم بدھ کو "بڑ" کے درخت کے نیچے ہی روشنی ملی تھی۔ کسی بھی پیغمبر کی زندگی میں "بڑ" کے درخت کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔

(238) جہاں تک برہمیت کا تعلق ہے قرآن الحکیم کی سورۃ 20 (طٰہٰ، آیات 85 تا 97) میں ایک زرگر سامری کا قصہ بیان کیا گیا ہے جس میں چھوت (لامساس) کی طرف واضح اشارہ ہے [اس کتاب کے پیراگراف نمبر 63 میں اس کا تفصیلی ذکر آچکا ہے] راجہ سامری (یورپ والے اسے زمورین ZAMORIN کہتے ہیں) آج بھی "کالی کٹ" اور "مالابار" کے علاقوں میں مشہور و معروف ہے جہاں اس کا خاندان برطانوی دور حکومت کے دوران حکمران تھا۔ اس

سامری کا ''انجیل'' کے سامری سے کوئی تعلق نہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد کے دور میں گزرا ہے جبکہ زرگر سامری یہودیوں کا اتحادی تھا اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کے عہد میں موجود تھا۔

(239) میں اس تعارفی کوشش کو نامور عالم حضرت غلام علی آزاد بلگرامی کی دو تحریروں جن میں پہلی اُن کی سوانحی لغت ''سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان'' کا مقدمہ اور دوسری یک موضوعی تحقیقاتی مقالہ ''شمامۃ العنبر فی ماورد عن الھند عن سیّد البشر'' کے ذکر پر ختم کرتا ہوں۔

(240) ہندوستان کے جنوب مغربی ساحلی علاقہ ''مالا بار'' میں یہ ایک بڑی قدیم روایت مشہور ہے کہ اس علاقہ کے ایک بادشاہ ''چکرورتی فرماس'' نے چاند کو دو ٹکڑے ہوتے دیکھا تھا۔ یہ سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ معجزہ تھا جو مکہ معظمہ میں واقع ہوا۔ اس بادشاہ نے جب اس حوالے سے تحقیقات کیں تو اسے پتہ چلا کہ عرب میں ایک پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ظہور کی پیش گوئیاں موجود ہیں اور چاند کے دو ٹکڑے ہونے کا واضح مفہوم یہی ہے کہ اس پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ظہور ہو چکا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے بیٹے کو اپنا جانشین مقرر کر کے خود آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کے لیے عرب چلا گیا۔ اُس نے ہادیٔ کون و مکاں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھوں پر اسلام قبول کیا اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر واپس ہندوستان روانہ ہو گیا۔ راستے میں یمن کی بندرگاہ ظفار میں اس کا انتقال ہوا۔ یہاں آج بھی اُس ''ہندوستانی بادشاہ'' کے مزار پر لوگ فاتحہ کے لیے آتے ہیں۔ انڈیا آفس لندن میں ایک پرانے مسودہ (نمبر عربی 2807 صفحہ 152 تا 173) میں اس کی تفصیل درج ہے۔ زین الدین المعبری کی تصنیف ''تحفۃ المجاہدین فی بعد اخبار البرتگالین'' میں بھی اس کا تذکرہ ہے۔

(241) ہم ''رتن ہندی'' (''الاصابہ'' از ابن حجر نمبر 2759) اور ''سرباتک ہندی'' (''الاصابہ'' از ابن حجر نمبر 3739) کا جو کہ بالترتیب چوتھی صدی ہجری اور آٹھویں صدی ہجری میں گزرے ہیں، زیادہ ذکر نہیں کریں گے۔ ان دونوں نے پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابی ہونے کا دعویٰ کیا اور کئی سو سال عمر پائی مگر ان کے ہم عصر اُن کے اس دعوے کو جھوٹ اور فراڈ قرار دیتے ہیں۔

ترکستان:

(242) ترکی کے باشندوں کے بارے میں انتہائی کم مواد دستیاب ہے۔ علامہ بلاذری اپنی

کتاب ''الانساب الاشراف'' جلد اوّل صفحہ 485 میں روایت کرتے ہیں کہ ابوجہل کے ہاتھوں شہید ہونے والی اسلام کی پہلی شہید خاتون حضرت سمیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا عمار ابن یاسر کی والدہ ماجدہ تھیں۔ ان کا اصل نام حضرت پاخ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھا اور ان کا تعلق ایران کے علاقہ کسکر سے تھا۔ پاخ کو جدید ترکی میں ''پاموک'' کہا جاتا ہے جس کے لغوی معنی کپاس کے ہیں۔ اور یہ کسی ترک خاتون کا نام ہی ہوسکتا ہے۔ رب تعالیٰ جل شانہٗ اس خاتون کے درجات بلند فرمائیں۔ ہندوستان کی طرح ترکی میں بھی ایک شخص مقلاب ابن ملکان الخوارزمی (وفات 311 ہجری) گزرا ہے جس نے سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے صحابی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ (''الاصابہ'' از ابن حجر نمبر 8126)۔

چین:

(243) چین کے حوالے سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ایک مشہور و معروف حدیث ہے کہ ''علم حاصل کرو چاہے تمہیں اس کے لیے چین ہی کیوں نہ جانا پڑے''۔ یہ یقین کرنے کے لیے کافی وجوہات ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی چین والوں سے ملاقات ہوئی تھی اور انہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اپنی ثابت قدمی سے متاثر کیا تھا کیونکہ وہ کئی ماہ کا سمندری سفر کرکے آئے تھے مزید یہ کہ انہوں نے اپنی مصنوعات سے بھی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو متاثر کیا تھا۔ مسعودی اپنی کتاب ''مروج الذہب'' جلد اوّل صفحہ 308 پر لکھتے ہیں کہ ظہور اسلام سے پہلے چینی لوگ بڑی بڑی کشتیوں میں بحرین اور عمان آتے تھے۔ اسی طرح ''ابن حبیب'' نے ''دبا'' کے سالانہ تجارتی میلے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''دبا'' عرب کی دو بڑی بندرگاہوں میں سے ایک تھی اور اس کے سالانہ تجارتی میلے میں ہندوستان، سندھ، چین اور مشرق و مغرب سے تاجر شرکت کرتے تھے..........''

(244) چین والے اس بات کی تصدیق و توثیق کرتے ہیں کہ سرور کونین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے چین کے بادشاہ کے دربار میں دعوت اسلام دینے کی خاطر اپنا سفیر بھیجا تھا۔ اس سفیر کا نام حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بعد میں دوبارہ چین تشریف لے گئے اور وہیں انتقال ہوا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مقبرہ ''سنگان فو'' میں ہے۔ (آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مقبرہ کی تحریروں کے حوالے سے مطالعہ کیجیے ''وین لینگ ڈو'' کی کتاب ''مذہبی کتبات'' پیکنگ 1957 اور بروم ہال مارشل کی کتاب ''چین میں اسلام'' صفحات 66، 83 تا 90)۔

باب 10
معاشرتی تنظیم

(245) نبیٔ آخرالزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقام ولادت مکہ مکرمہ اسلام کے ظہور سے پہلے ہر طرح سے منظم ومربوط شہری ریاست تھی۔ جس میں دس ''وزراء'' پر مشتمل ایک حکومتی تنظیم تھی۔ یہ وزراء ریاست کے دس بااثر اور طاقتور قبائل سے وراثتی بنیادوں پر لیے جاتے تھے۔ یہ وزراء شہر کے اندرونی نظم ونسق کو سنبھالتے تھے۔ چند معاون وزراء نامزد کیے جاتے تھے جن کی ذمہ داری میں بین الاقوامی اتحاد واتفاق اور خاص طور پر حج کے انتظامات ہوتے تھے اور یہ خصوصاً مقامی مسئلہ نہیں تھا۔

(246) اسلام سے پہلے مکہ مکرمہ شہر کی مقامی انتظامیہ کا ڈھانچہ اس طرح تھا کہ:

(i) بنو ہاشم کے العباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) جو کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا تھے چاہ زمزم کے انچارج تھے اور حج کے دنوں میں لوگوں کو پانی کی سہولت بہم پہنچانا ان کی ذمہ داری تھی۔ وہ حرم کعبہ میں نظم وضبط کے بھی نگران تھے تاکہ کعبۃ اللہ کے احاطہ میں اللہ تبارک و تعالیٰ کے گھر کی عزت وحرمت اور تعظیم وتکریم قائم ودائم رہے۔

(ii) بنو تیم کے ابوبکر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) اشناق کے سربراہ تھے۔ ان کا کام دیوانی اور فوجداری معاملات میں اس جرمانہ وہرجانہ کا تعین تھا جو مظلوم کو ادا کیا جاتا تھا۔

(iii) بنو عدی کے عمر بن خطاب (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سفارہ منافرہ (سفارت اور مذاکرات) کے سربراہ تھے اور وزیر خارجہ تھے۔ اس سفارتی عہدہ کی ذمہ داری میں امور خارجہ میں سلطنت کی نمائندگی اور دوسرے ممالک کے ساتھ متنازعہ واختلافی معاملات میں مذاکرات شامل تھے۔ مکی جب بھی کسی ملک میں اپنا سفیر بھیجنے کا فیصلہ کرتے تو عمر بن خطاب (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو ہی بھیجتے۔ اسی طرح جب کسی بیرونی حوالے سے مکہ والوں کی اولیت وافضلیت کو چیلنج درپیش ہوتا تو تب بھی عمر بن خطاب (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ہی کو منتخب کیا جاتا کہ وہ مذاکرات کریں۔

(iv) بنو امیہ کے ابوسفیان (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سلطنت کے فوجی پرچم عقاب کے

انچارج تھے۔ جنگ کے موقع پر وہ اس وقت تک سلطنت کے پرچم کو تھامے رکھتے جب تک کسی فرد کو متفقہ طور پر سپہ سالار منتخب نہ کرلیا جاتا۔ عام طور پر یہ اس موقع پر ہوتا تھا جب مکہ والوں کی فوج کسی اتحادی کے ساتھ مل کر کسی جنگ میں شرکت کررہی ہوتی تھی۔

(v) بنوعبدالدار کے عثمان ابن طلحہ قبائلی پرچم لواء کے نگران وانچارج تھے۔ عقاب اور لواء کے درمیان فرق زیادہ واضح نہیں ہے۔ شاید عقاب بڑی جنگوں کے موقع پر اور لواء عام جنگی مواقع پر لہرایا جاتا ہو۔ عثمان ابن طلحہ ''دارالندوہ'' (پارلیمنٹ ہاؤس) کے بھی انچارج تھے جہاں سلطنت کے تمام عمر رسیدہ اور تجربہ کار افراد کو کسی اہم معاملے پر مشاورت کے لیے دعوت دی جاتی تھی۔ اس مجلس مشاورت میں 40 سال یا اس سے زیادہ عمر کے افراد شرکت کرتے تھے تاہم بعض اوقات خصوصی طور پر کسی نوجوان کو بھی بلا لیا جاتا تھا۔ یہ مجلس مشاورت ایک قسم کا پارلیمنٹ کا ایوانِ زیریں تھا۔

(vi) بنواسد کے یزید ابن زمعہ (جو کہ ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے والدِ محترم تھے) ''مَشُورَہ'' (مشاورت) کے نگران تھے۔ یہ پارلیمنٹ کا گویا ایوانِ بالا تھا کیونکہ جب بھی کوئی قرارداد منظور ہوتی تھی تو وہ اس عہدہ دار کو توثیق وتصدیق کے لیے پیش کی جاتی تھی۔

(vii) بنومخزوم کے خالد ابن ولید (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) قُبّہ کے نگران وانچارج تھے۔ یہ ایک قسم کا سائبان تھا جو بت پر تانا جاتا تھا۔ وہ عِنہ (گھوڑے کی لگام) کے بھی انچارج تھے اور یوں جلوس کے موقع پر اس گھوڑے کی لگام تھامتے تھے جس پر بت رکھا ہوتا تھا۔ وہ دورانِ جنگ گھڑسوار دستوں کی سربراہی بھی کرتے تھے ان کا ایک نائب بھی ہوتا تھا جو اس سربراہی میں ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ تاہم ان میں سے ایک میمنہ میں اور دوسرا میسرہ میں ذمہ داری سنبھالتا تھا۔

(viii) بنونوفل کے الحارث ابن عامر ''رفادہ'' (عطیات اور ٹیکس) کے انچارج تھے۔ یعنی ایک طرح سے خزانچی اور وزیرِ خزانہ تھے جو لوگوں سے عطیات جمع کرتے تھے اور ان عطیات کو حج کے دوران کسی مشکل میں مبتلا ضرورت مند حاجیوں پر خرچ کرتے تھے۔

(ix) بنوجمح کے صفوان ابن امیہ کے ذمہ ''ازلام'' (فال کے طور پر استعمال ہونے والے تیر) کی نگرانی تھی جب کسی شخص کو کسی معاملہ میں خود فیصلہ کرنے میں دشواری پیش آتی تو وہ اپنا

معاملہ رب تعالیٰ جل شانہٗ کے حوالے کر دیتا۔ اس کے بعد تیروں سے فال نکالی جاتی۔ چنانچہ ہاں یا نہیں کے تیر نکلنے کے مطابق ہی فیصلہ کیا جاتا۔ فال نکلوانے کے لیے ایک مخصوص فیس ادا کی جاتی تھی۔

(x) بنو سہم کے الحارث ابن قیس کے ذمہ منصفی اور کعبۃ اللہ میں پیش کیے جانے والے نذرانوں کی انچارج شپ تھی۔ وہ دیوانی مقدمات میں منصف ہوتے تھے۔ یہ مقدمات ان فوجداری وغیرہ مقدمات کے علاوہ اور مختلف ہوتے تھے جن کا ذکر نمبر (ii) میں کیا جا چکا ہے۔

(247) حمالہ ابن عوف ابن عامر کی اولاد میں سے ایک انجینئر اور ماہر تعمیرات نامزد وزراء میں سے تھا۔ اگرچہ اس کا تعلق جنوبی عرب کے قبیلہ ازدشنوعہ سے تھا مگر یہ شخص مکہ میں رہائش پذیر تھا۔

(248) کیلنڈر کے انچارج کے طور پر بھی ایک وزیر کا تقرر کیا گیا جو کہ اس بات کا فیصلہ کرتا تھا کہ کون سے قمری سال میں 13 واں مہینہ زائد کیا جائے جس سے شمسی سال کے ساتھ مطابقت پیدا ہو جائے اور یہ کہ مختلف موسم ایک ہی قمری مہینے میں آئیں۔ اس کا سب سے اہم مقصد یہ تھا کہ حج کے ایام ایک ہی موسم میں آئیں (ظاہراً موسم بہار کے آغاز میں)۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دور میں یہ کام مالک ابن کنانہ کو سونپا گیا تھا اور اس عہدیدار کو "قلمس" کہا جاتا تھا۔

(249) عرفات میں لوگوں کی رہنمائی کے لیے بھی ایک وزیر مقرر تھا۔ یہ عہدہ بھی وراثتی تھا اور اس پر ہمیشہ "بنو غوث ابن مُر" کا فرد ہی نامزد ہوتا تھا۔

(250) مزدلفہ میں حاجیوں کے نظم و ضبط اور وہاں سے منیٰ تک رہنمائی کی ذمہ داری بھی ایک شخص کے ذمہ تھی جس کا تعلق بنو عدوان ابن جدیلہ سے ہوتا تھا۔

(251) بنو مرہ ابن عوف کا ایک فرد بھی وزیر نامزد ہوتا تھا مگر اس کی ذمہ داری کیا تھی اس بارے میں مؤرخین نے کوئی وضاحت نہیں کی۔

(252) اگلے صفحہ پر دیا گیا شجرہ نسب مختلف قبائل کی باہمی رشتہ داری کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوگا۔ صرف ماہر تعمیرات وزیر کے خاندان کا اس میں ذکر نہیں ہے کیونکہ اس کا تعلق عربوں کی جنوب عربی شاخ سے تھا۔

(253) اسلام کے ظہور سے مکہ مکرمہ میں ریاست کے اندر ایک ریاست کی شکل پیدا ہوئی کیونکہ مسلمان مکہ مکرمہ کی ریاست میں رہتے ہوئے اپنے تمام معاملات میں ہادیٔ اعظم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے مکمل رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حیثیت ایک حاکم کی تھی مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زیر ابھی تک کوئی علاقہ نہیں تھا۔

(254) 622ء میں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مدینہ منورہ کی جانب ہجرت کے وقت چند افراد ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو رب تعالیٰ جل شانہٗ کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تسلیم کرتے تھے۔ ان میں کچھ مکی بھی تھے جب کہ باقی مدنی تھے۔ اس وقت نہ تو یہ سارا علاقہ دائرہ اسلام میں داخل ہوا تھا اور نہ ہی آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو کسی قسم کی کوئی سیاسی طاقت وقوت

حاصل تھی۔ مزید یہ کہ اس تمام علاقے میں نہ تو واحد ریاست تھی اور نہ ہی کوئی مؤثر حکومت تھی۔ نہ صرف عرب میں بلکہ مدینہ منورہ میں بھی ہر قبیلہ آزاد و خود مختار تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان قبیلوں میں باہمی رنجشیں، دشمنیاں اور لڑائیاں تھیں۔ مدینہ منورہ کا علاقہ زرخیز ہونے کی وجہ سے زراعت اور باغات کے لیے انتہائی فائدہ مند تھا اور پھر یہ کہ اس کا زیر زمین پانی میٹھا تھا۔ جب معلم کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ کے منتشر قبیلوں کو منظم و مربوط کر کے مدینہ منورہ کو شہری ریاست کی شکل دینے میں کامیابی و کامرانی حاصل کر لی تو پھر مدینہ منورہ کی طاقت مکہ مکرمہ سے بھی بڑھ گئی۔ مزید یہ کہ مدینہ منورہ کو مکہ مکرمہ کی نسبت زیادہ خود کفالت حاصل تھی۔ اگرچہ صحیح اعداد و شمار کا علم نہیں تاہم حالات و واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ سن ہجری کے آغاز پر مدینہ منورہ کی آبادی 10,000 کے قریب تھی۔ ان میں عرب اور ان کے یہودی اتحادی بھی شامل تھے۔ رسول مکرم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت مدینہ کے فوراً بعد حکم دیا کہ مدینہ منورہ کے تمام مسلمان مردوں اور عورتوں کی فہرست تیار کر کے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیش کی جائے۔ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق اس فہرست میں 1500 نام شامل تھے۔ 8 ہجری کی فتح مکہ تک آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پالیسی یہی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عام مسلمانوں کو ایک ایک کر کے اور گروہوں کی شکل میں بھی مدینہ منورہ کی جانب ہجرت کی ترغیب و تلقین کرتے رہے تاکہ مسلمان اپنے آپ کو مشرکین مکہ کے شر سے بچا سکیں۔ جب پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے 632ء میں اس دار فانی کو خیر باد کہا تو اس وقت یہودیوں کی اکثریت مدینہ منورہ سے جا چکی تھی اور مکہ مکرمہ سے نئے مہاجر آتے رہتے تھے۔ ایک اندازے کے مطابق اس وقت مدینہ منورہ کی آبادی 15 سے 20 ہزار تک پہنچ چکی تھی۔

(255) رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ منورہ میں مضبوط و مستحکم بنیادوں پر استوار ایک ایسی شہری ریاست کے قیام میں کامیاب و کامران ہو چکے تھے جس نے جلد ہی ایک مملکت بلکہ ایک وسیع سلطنت کی شکل اختیار کر لی۔ ایسی سلطنت جس کی سرحدیں پورے عرب، عراق اور فلسطین سمیت جنوبی علاقوں تک بھی پہنچ چکی تھیں۔ چونکہ اس سے پہلے اس علاقے میں کسی مملکت کا وجود نہیں تھا اس لیے ضروریات کے تحت ہر قسم کے انتظامی شعبہ کا قیام عمل میں لایا گیا اور پھر تجربات و مشاہدات کی بنیاد پر اسے بہتر بنایا گیا۔ مدینہ منورہ شہر کی انتظامیہ اس وسیع و عریض سلطنت کا دار الخلافہ اور وفاقی حکومت کا مرکز تھا جب کہ ہر قبیلہ دائرہ

اسلام میں داخل ہونے کے ساتھ اپنے علاقہ میں ہی اس سلطنت کا صوبہ بن جاتا تھا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ پالیسی اختیار کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی بھی قبیلہ کے مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد اسی قبیلہ کے کسی مقامی فرد کو (صوبائی) حکومت کا حکمران مقرر فرما دیتے اور اگر قبیلہ کا سردار بھی مسلمان ہو جاتا تو اسے ہی حکومت کا سربراہ بنا دیتے جب کہ اس کی (انتظامی) مدد و اعانت کے لیے مسلمانوں کی ایک کونسل قائم کر دی جاتی۔ اس قسم کا انتظام مرکزی حکومت کی طرف سے تنخواہ دار گورنر اور دوسرے عمال بھیجنے کی نسبت سستا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ نفسیاتی طور پر بھی یہ انتظام بہتر رہتا تھا کیونکہ اس طرح عوام الناس میں یہ تاثر پیدا نہیں ہوتا تھا کہ ان پر کوئی اجنبی حکومت کر رہے ہیں۔ قبیلوں کے سرداروں کے لیے باقاعدہ ایسے فرمان جاری کر دیے جاتے جن کے ذریعے ان کی سابق جاگیر یعنی زمین اور پانی وغیرہ پر ان کی ملکیت کو برقرار رکھا جاتا یا اسی علاقے میں انہیں نئی جاگیر دے دی جاتی۔ اگرچہ یہ نظام جاگیردارانہ سا محسوس ہوتا ہے مگر بالواسطہ حکومت اس دور کی ضرورت تھی کیونکہ علاقہ کے لوگ خانہ بدوش فطرت رکھتے تھے تاہم عرب کے زیادہ آباد اور زرخیز علاقوں جیسا کہ یمن، عمان اور بحرین وغیرہ کو جہاں پہلے ہی حقیقی مملکتیں موجود تھیں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں اسی طرح قائم رکھا۔ سرور کونین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکمرانی میں قبائلی سرداروں کے ساتھ ساتھ بادشاہ بھی شامل تھے۔ جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غلامی میں رہ کر آزادی و خودمختاری سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

(256) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس مملکت کے سربراہ تھے وہ اپنی ترکیب اور بناوٹ کے لحاظ سے انتہائی پیچیدہ تھی۔ اس مملکت کے مختلف علاقوں میں مختلف نظام حکومت تھا۔ کہیں بلاواسطہ اور براہ راست حکومتی نظام تھا اور کہیں بالواسطہ نظامِ حکومت تھا۔ اس مملکت کو وحدانی نہیں کہا جا سکتا البتہ اسے وفاقی یا نیم وفاقی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس مملکت کی مرکزی حکومت میں فرد واحد کی حکمرانی کے باوجود مطلق العنانی قطعاً نہیں تھی۔ بار بار اور مسلسل مشاورت کا طریق کار تھا۔ اگرچہ انتخابات نہیں ہوتے تھے تاہم ہر قبیلے کا سردار اپنے قبیلے کے اراکین کا فطری نمائندہ تھا۔ جب مشاورت ہوتی تھی تو اس میں عام آدمی بھی شریک ہوتے تھے کیونکہ معلم کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز کے ختم ہوتے ہی مسجد میں موجود نمازیوں کے سامنے مسئلہ بیان فرما دیتے تھے۔ اس پر قبائلی سرداروں کے ساتھ ساتھ عوام الناس بھی رائے دے سکتی تھی۔ خفیہ مشاورت کا عمل برائے نام تھا تاہم جنگ کے دوران یا جنگ کے

خطرہ کی صورت میں خفیہ صلاح مشورہ کی ضرورت پڑتی تھی تاہم کسی مسئلہ پر رائے شماری کا موقع بمشکل ہی آتا تھا۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ دشمن کے قیدیوں کو غلام بنا کر مال غنیمت کے طور پر تقسیم کر دیا گیا تو رسول اکرم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعد میں مسلمانوں سے پوچھا کہ کیا ان غلاموں کی تقسیم کو منسوخ کر دیا جائے یا نہیں؟ کیونکہ دشمن نے اپنے فعل پر شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے دائرہ اسلام میں داخل ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔ اس سوال پر رائے عامہ میں اختلاف محسوس کرتے ہوئے ہادیٔ اعظم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چند افراد کی یہ ڈیوٹی لگادی کہ اس مسئلہ پر اسلامی فوج کے ہر مجاہد کی رائے لے کر باہمی مشاورت اور غور وفکر کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رپورٹ پیش کریں۔ رپورٹ کے مطابق بھاری اکثریت کی رائے یہ تھی کہ غلاموں کو آزاد کر دیا جائے جب کہ چند سپاہیوں نے مال غنیمت اپنے پاس ہی رکھنے کو ترجیح دی۔ اس پر سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ تمام غلاموں کو رہا کر دیا جائے تاہم جو سپاہی مال غنیمت کو اپنے پاس رکھنے کے حامی تھے انہیں بیت المال سے ان غلاموں کے بدلے نقد معاوضہ ادا کرنے کا اعلان کیا گیا تو وہ بھی غلاموں کو آزاد کرنے پر تیار ہو گئے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جہاں کسی قبیلہ، ریاست یا علاقے کا حکمران نامزد کرتے تھے یا اسے تسلیم کرتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ضرورت کے مطابق کسی بھی حکمران کو معزولی کا حکم بھی دے سکتے تھے اور اس کی جگہ کسی دوسرے حکمران کی تقرری کر سکتے تھے۔ یوں ملک کے مختلف حصوں میں اختلاف کے باوجود ان میں ذاتی نوعیت کا اتحاد پایا جاتا تھا۔

(257) ہم دور خلافت کی مسلم مملکت کا نہیں بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور یعنی (دور رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اسلامی مملکت کا ذکر کر رہے ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پاک بے مثل و بے مثال تھی۔ ہر مسلمان کا ایمان وایقان تھا کہ نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی کا نزول ہوتا ہے چنانچہ جب محبوب خدا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ یہ رب رحمٰن ورحیم کا حکم ہے تو اس حکم کے خلاف کوئی اپیل نہیں کی جا سکتی تھی۔ یوں پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو زندگی کے تمام شعبوں یعنی دین، سیاست، اخلاق، معاشرتی وسماجی اقدار اور دیگر امور میں مکمل اور قطعی اختیار حاصل تھا۔

(258) آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب مدینہ منورہ کی شہری ریاست کی بنیاد رکھی تھی تو

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے بظاہر مکہ مکرمہ کی جلاوطن حکومت خیال کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب فوج لے کر نکلتے تو اپنا لواء یعنی پرچم بنوعبدالدار کے کسی مسلمان کے حوالے فرماتے۔ جب اہل مکہ سے مذاکرات کی ضرورت ہوتی تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلایا جاتا اور جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسلام لے آئے تو انہیں اسلامی فوج کے گھڑسوار دستہ کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ چاہ زمزم کی نگرانی اسی طرح حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ (آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا) کے ذمہ رہی۔ یہ سب لوگ مکہ مکرمہ میں وراثتی طور پر ان معاملات کے نگران ونگہبان اور وزیر وانچارج تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان اقدامات کی اور کوئی وجہ نہیں بیان کی جاسکتی سوائے اس کے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ منورہ کی حکومت کو مکہ مکرمہ کی جلاوطن حکومت سمجھتے تھے۔

(259) جس طرح اسلامی مملکت کی سرحدیں بڑھتی گئیں۔ اسی طرح قبائل کی زیادہ تعداد کے ساتھ اسلامی مملکت کے رابطے استوار ہوئے۔ انتظامی امور میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ تمام معاملات کو نمٹانے کے لیے باقاعدہ تنخواہ دار سیکرٹری رکھے گئے۔

(260) مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ منورہ کی مرکزی مسجد تھی۔ اس میں اقامتی یونیورسٹی ''صفہ'' بھی قائم تھی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ کئی دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم بھی اس کے ابتدائی اور اعلیٰ درجوں کے طلباء کو تعلیم دیتے تھے۔ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ایک سے زائد مؤذن بھی تھے جن کی ذمہ داری تھی کہ وہ رات کے اوقات میں مسجد میں لیمپ روشن کریں اور مسجد کی صفائی وغیرہ کا خیال رکھیں۔ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ منورہ کی اکیلی مسجد نہیں تھی بلکہ سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات پاک ہی میں مدینہ منورہ میں 9 مزید مساجد کی تعمیر ہو چکی تھی۔ محبوب خدا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث ''ہمسایوں سے علم حاصل کرو'' سے واضح ہے کہ ان چھوٹی چھوٹی مساجد میں مکتب (سکول) بھی موجود تھے۔

(261) شروع میں سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وصول ہونے والے تحائف یا صدقات کو فوراً ہی لوگوں میں تقسیم فرمادیتے تھے مگر بعد ازاں ایک اسٹور کا قیام عمل میں لایا گیا جہاں یہ صدقات وغیرہ جمع کر دیئے جاتے۔ اس اسٹور کے نگران ونگہبان حضرت بلال حبشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایات واحکامات کے مطابق ان صدقات وغیرہ کو خرچ کرتے تھے۔ اسی اسٹور نے بعد میں بیت المال کی صورت اختیار کرلی۔

جب زکوٰۃ فرض ہو کر باقاعدگی سے وصول ہونا شروع ہوئی تو بیت المال میں نقد رقوم کے ساتھ ساتھ اونٹ، بھیڑیں، بکریاں، کھجوریں اور دوسری زرعی اجناس بھی وصول ہونا شروع ہو گئیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر بیت المال کے کارندوں کی تعداد میں بھی اضافہ کرنا پڑا۔ آمدنی اور خرچ کا حساب رکھنے کے لیے نہ صرف کلرکوں کا تقرر کیا گیا بلکہ مویشیوں کی دیکھ بھال کے لیے چرواہے بھی رکھے گئے۔ جنگ تبوک کی تیاری کے اخراجات کے لیے سپہ سالار اعظم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو زکوٰۃ کی پیشگی ادائیگی کا حکم دیا۔

(262) مملکت اسلامیہ کی دفاعی ضروریات میں اضافے کو مدنظر رکھتے ہوئے مسلمانوں کی ''کافی تعداد'' پر جہاد فرض کیا گیا لیکن اگر کسی مہم کے لیے زیادہ تعداد میں فوج کی ضرورت پڑتی تو رضاکاروں کے لیے اپیل کی جاتی تھی۔ اس طرح ضرورت کے مطابق فوج کی تعداد پورا ہونے میں انتظار کرنا پڑتا تھا۔ نتیجتاً نہ صرف یہ کہ کافی وقت گزر جاتا بلکہ پریشانی بھی اُٹھانا پڑتی تھی۔ لہٰذا آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور ہی میں مستقل فوج کی بنیاد رکھ دی گئی تھی۔ حضرت امام محمد الشیبانی اپنی (شرح) ''السیر الکبیر'' (1978ء) میں لکھتے ہیں کہ:

> ''......محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ ہی میں زکوٰۃ کی رقم علیحدہ رکھی جاتی تھی۔ اس شعبہ کے ملازم الگ تھے جب کہ مال غنیمت کا حساب رکھنے والے ملازم الگ تھے۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زکوٰۃ فنڈ میں سے یتیموں، عمر رسیدہ لوگوں اور غریب خاندانوں کی مدد واعانت کرتے تھے۔ جب کوئی یتیم بالغ ہو جاتا اور اس پر جہاد واجب ہو جاتا تو اسے زکوٰۃ فنڈ کی بجائے مال غنیمت سے امداد ملنا شروع ہو جاتی تھی۔ اگر یہ نوجوان فوجی فرائض کی ادائیگی پسند نہ کرتا تو پھر حتی کہ اسے زکوٰۃ فنڈ سے بھی کوئی امداد نہ دی جاتی اور اسے حکم دیا جاتا کہ وہ اپنی روزی خود کمائے۔''

(263) مدینہ منورہ کی آبادی میں اضافہ ہونے کی وجہ سے نئی منڈیوں کا قیام اور ان کی نگرانی ونگہبانی کا مستقل انتظام وقت کی ضرورت تھی۔ چنانچہ ایک تعلیم یافتہ خاتون حضرت شفاء بنت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو مارکیٹ کی کچھ ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ چونکہ ان کے عہدے کا صحیح پتہ نہیں چل سکا۔ اس لیے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ انہیں مارکیٹوں کی انسپکٹر جنرل یا تاجروں پر کسٹم ڈیوٹی کی کلکٹر یا کم از کم تاجر خواتین پر انسپکٹر مقرر کیا گیا تھا۔ درآمدی ڈیوٹی میں وقت کے

ساتھ ساتھ اصلاحات بھی کی گئیں جیسا کہ بعد میں وینس میں تاجروں کی مختلف قسموں پر مختلف شرح سے درآمدی ڈیوٹی لگائی گئی۔ یہ مقامی تاجروں کے لیے $2^1/_2$ فی صد، آمد و رفت رکھنے والے مستقل رہائش پذیر غیر ملکیوں کے لیے 5% جب کہ خالص غیر ملکیوں کے لیے 10% تھی۔

(264) اسلامی مملکت و حکومت کا شروع میں کوئی مستقل سیکرٹریٹ نہیں تھا۔ تاہم بعد میں خطوں اور فرمانوں پر لگانے کے لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مہر بنوائی گئی۔ غیر ملکی زبانوں کے ماہرین کو مترجم اور سیکرٹری کے عہدوں پر تعینات کیا گیا۔ قرآن الحکیم کی ترتیب و تدوین، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے خطوط نویسی، حکومت کی آمد و خرچ کا حساب رکھنے اور فوجی نظم و نسق قائم رکھنے اور اسی طرح کے دوسرے کاموں کے لیے الگ شعبوں کے قیام کے ساتھ ان میں متعلقہ اہلیت کے افراد کو ملازمت دی گئی۔

(265) فوجی تربیت کی ہر لحاظ سے قدر افزائی اور حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بذات خود گھڑ دوڑ کے میدان میں تشریف لے جاتے اور جیتنے والوں میں انعامات تقسیم فرماتے۔ تیر اندازوں کو نشانہ بازی کی مشق کرائی جاتی۔ پتھر پھینکنے کی تربیت اور اسی طرح کے دوسرے جنگی فنون میں نوجوانوں کو مہارت دلانے کے موقع پر رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی موجودگی ان کے لیے حوصلہ افزائی کا باعث بنتی۔

(266) اسلامی مملکت کے شعبہ اطلاعات و معلومات کو خصوصی طور پر فعال بنایا گیا۔ اندرون ملک کے ساتھ ساتھ بیرون ملک نامہ نگاروں کا تقرر کیا گیا جو کہ مکہ مکرمہ، نجد، طائف اور کئی دوسرے مقامات کے اسلام کے زیر اثر آنے سے پہلے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اطلاعات و معلومات فراہم کرتے رہتے تھے۔

(267) ضرورت اور تجربہ کی بناء پر اسلامی مملکت کے مرکزی اور صوبائی انتظامی ڈھانچے قائم کرنا پڑے اور پھر ان میں وقت کے ساتھ ساتھ اصلاح بھی کی جاتی رہی۔ دونوں حکومتیں پُر سکون طور پر کام کرتی ہوئی دن بدن مکمل سے مکمل تر ہوتی گئیں۔ انسانی کمزوریاں بھی تھیں۔ ظالم و جابر حکمرانوں کے لیے دولت ہی ان کی سب سے بڑی کمزوری ہوتی ہے اور ان دنوں زکوٰۃ اسلامی حکومت کا سب سے بڑا ذریعہ آمدنی تھی۔ رسول رحمت حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی یہ حدیث کس قدر راحت فزا اور سکون آفریں ہے کہ "زکوٰۃ مجھ پر اور میرے خاندان پر حرام ہے!" اگر کسی حکومت کا حکمران دیانت دار و ایماندار ہو تو اس کے عمال کس طرح

غبن اور بددیانتی کر سکتے ہیں؟ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حرص و ہوس کی حوصلہ شکنی کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک ٹیکس کلکٹر (تحصیلدار) ایک صوبہ سے واپس آیا تو اس نے بتایا کہ "یہ والا مال حکومت کی آمدنی ہے جب کہ وہ والا مال مجھے لوگوں نے تحفتاً دیا ہے۔" سرور کونین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ایک عام اجلاس طلب کیا جس میں عوام الناس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ کوئی یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ "یہ وہ مال ہے جو لوگوں نے مجھے تحفتاً دیا ہے؟" انہیں اپنی والدہ کے گھر بٹھا دیجئے اور پھر دیکھئے کہ کون انہیں تحفتاً کوئی چیز دینے آتا ہے؟ ایک موقع پر آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم ملازمت کرتے ہو تو ہر شخص تم سے یہ توقع رکھے گا کہ تم اپنے فرائض دیانتداری اور ایمانداری کے ساتھ انجام دو اور اگر تم کسی قسم کی معمولی سی کوتاہی بھی کرو گے تو اس کی ذمہ داری تم پر عائد ہو گی اور تم اس کے جوابدہ ہو گے لیکن اس کے برعکس اگر تمہارے مسلسل انکار کے باوجود تم پر دباؤ ڈال کر تمہیں کوئی ذمہ داری دے دی جائے تو پھر سب لوگ اس کام میں تمہاری مدد کریں گے اور اگر اس کام میں کوئی خامی بھی رہ جائے گی تو وہ تم سے ہمدردی کریں گے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعض افراد کو ان کی اہلیت یا نااہلیت کی بنیاد پر کسی کام کی ذمہ داری دینے یا نہ دینے کے احکامات کسی ہچکچاہٹ کے بغیر جاری کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت العباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ٹیکس جمع کرنے کی ذمہ داری نہ دی جائے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یتیموں کی املاک کا انتظام ان کے ذمہ نہ لگایا جائے۔ اسی طرح کے اور بھی احکامات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کی صلاحیتوں اور قابلیتوں کی تعریف و تحسین اور حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ معلم کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تعلیم کی ہر ممکن طریقے سے ترقی اور پھیلاؤ کی حوصلہ افزائی اور قدر کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض جنگی قیدیوں کی رہائی کے لیے فدیہ منسوخ کر کے ان پر لازم قرار دیا کہ وہ فدیہ کی رقم کے عوض مسلمان بچوں کو لکھائی پڑھائی کی مہارت دیں۔ تاہم ناخواندگی کسی کی ترقی میں رکاوٹ نہیں تھی۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو منصف بنا کر یمن بھیجا حالانکہ وہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ انہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس عالم فنا کو رخصت کر جانے کے بعد لکھائی پڑھائی سیکھی۔ (ابن سعد، جلد چہارم صفحہ 83) شاید یہی وجہ تھی کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ

سے کہا تھا کہ وہ کسی عیسائی کو اپنا سیکرٹری نہ بنائیں۔

(268) سرور کونین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے اول وآخر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے دی گئی ذمہ داری اور مشن کی تکمیل کے لیے اپنی ساری زندگی صرف کردی۔ حتیٰ کہ حکومت اور مملکت وسلطنت کے ذریعے بھی اس خاص نظریہ کی اشاعت تھی کہ جس کے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علمبردار تھے وہ یہ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کی ذات اصل حاکم و مالک ہے۔ رب تعالیٰ جل شانہٗ کے ماتحت کی حیثیت سے انسان کو اپنا رویہ رکھنا چاہیے اور رب تعالیٰ ہی کے احکامات کی تکمیل کرنی چاہیے۔ چونکہ رب کائنات کی ذات پاک انسانی محسوسات کی حد سے بہت آگے ہے اس لیے بندے کو اللہ تبارک وتعالیٰ کے منتخب انسان یعنی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کردہ احکامات وارشادات کی تعمیل وتکمیل کرنا چاہیے اور دین اسلام کا اقرار لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ اسی نظریہ کی تعمیر وتشکیل کرتا ہے۔ رب کائنات کی ذات پاک ہر جگہ حاضر و ناظر اور قادر و قدیر مطلق ہے اس کے بندوں کو اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت وفرمانبرداری کرنا چاہیے۔ رب تعالیٰ جل شانہٗ کے ایسے پیغمبر بھی ہو سکتے ہیں جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کہ جنہوں نے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ ان کا تعلق زندگی کے تمام شعبوں سے نہیں بلکہ چند پہلوؤں سے ہے مگر پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا میں نیکی اور آخرت میں نیکی کا مثالی تصور پیش کیا۔ یوں انفرادی یا معاشرتی زندگی کا کوئی پہلو بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکامات وارشادات کے دائرہ سے الگ نہیں۔

(269) معلم کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کے مطالعہ سے پہلے یہ دیکھنا ازحد ضروری ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات زمانے کی گردش سے محفوظ و مامون کس طرح رہیں اور پھر یہ کہ وہ ہم تک کیسے پہنچیں۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کا تحفظ:

(270) کسی بھی پیغمبر کے اپنے اقوال، اپنے افعال اور اس کے پیروکاروں کے اعمال پر اس کی خاموش رضامندی اس کی تعلیمات کی تشکیل کرتے ہیں۔

(271) حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اقوال (احادیث) کو مختلف حصوں

میں تقسیم کیا ہے۔اپنے بعض اقوال کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''یہ رب تعالیٰ جل شانہٗ کا کلام و پیغام ہے۔اسے لکھ لیجئے۔اسے یاد کر لیجئے اور اسے نماز میں پڑھیئے۔'' یہ قرآن پاک ہے۔دیگر اقوال کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ حکم نہیں دیا کہ اس قول یا اقوال کو قرآن پاک میں شامل کر لیا جائے۔یہ حدیث قدسی ہے۔آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعمال وافعال یا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیروکاروں کے وہ اعمال جن کی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خاموشی اختیار کر کے تصدیق وتوثیق کی اور وہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ذریعے ہم تک پہنچے ہیں۔یہ سنت ہے۔آیئے دیکھیں کہ یہ مختلف حصے ہم تک کیسے پہنچے!

قرآن الحکیم:

(272) مسلمانوں کا یہ ایمان ہے کہ قرآن الحکیم، اللہ تبارک وتعالیٰ کا کلام ہے۔رب تعالیٰ جل شانہٗ کی ذات پاک زبان و آواز سے پاک ہے کیونکہ یہ تو انسانی خوبیاں ہیں۔ہم اسے ایک تشبیہ کی مدد سے سمجھ سکتے ہیں۔اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کا کلام بجلی کی رو کی مانند ہے جو بے رنگ ہے اور اسے دیکھا بھی نہیں جا سکتا۔رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بجلی کے بلب کی مانند ہیں جو اس تار کے ساتھ منسلک ہیں جس میں بجلی کی رو ہے۔یہ بلب اسی رو ہی سے روشن ہوتے ہیں۔بلب کا رنگ پیغمبر کی مادری زبان ہے۔بجلی کی رو جو کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا کلام ہے اسی رنگ کی روشنی پھیلاتی ہے۔جس رنگ کا بلب ہوتا ہے چاہے یہ سفید ہو، سرخ ہو، زرد ہو یا سبز وغیرہ۔بجلی کی رو کا خود کوئی رنگ نہیں۔پھر روشنی کی کمی یا زیادتی بلب کی قوت وطاقت پر انحصار کرتی ہے اس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ کا کلام جو زبان و آواز سے پاک ہے ہم تک بلب یعنی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان و آواز میں پہنچتا ہے کیونکہ یہ انہیں پر نازل ہوتا ہے۔

(273) قرآن الحکیم کا ایک عام نسخہ 500 کے قریب صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔یہ زبور اور انجیل کے عہد نامہ جدید دونوں سے زیادہ بڑا ہے۔تاریخی حوالے سے قرآن الحکیم ایک ہی دفعہ نازل نہیں ہوا بلکہ اس کا نزول 609 سے 632ء تک یعنی 23 سال میں تکمیل کو پہنچا ہے۔شروع شروع میں جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے والے بہت ہی کم تھے تو اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جو بھی آیات نازل ہوتی تھیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں لکھے بغیر اپنے حافظہ میں محفوظ فرما لیتے تھے۔دراصل ابتدائی آیات نہ تو طویل تھیں اور نہ ہی ان کی تعداد کوئی اتنی زیادہ تھی۔ان کی حفاظت کو کوئی خطرہ نہیں تھا کیونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم نزول وحی کے حوالے سے لوگوں سے گفتگو کرتے ہوئے روزانہ ان آیات کو دہراتے تھے۔ شاید آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عبادت کے دوران بھی ان ہی آیات کی تلاوت فرماتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دن میں دوبار یعنی صبح اور شام نماز پڑھا کرتے تھے۔ (پانچ نمازوں کی ادائیگی تو حکم ربانی کے تحت عرصہ بعد شروع ہوئی تھی)۔

(274) جلد ہی آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے والوں کی تعداد میں اضافہ ہونا شروع ہوا تو آیات قرآنی کے نزول میں بھی اضافہ ہوا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا کلام مسلمانوں تک پہنچایا جائے۔ ابن اسحٰق نے سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جو سوانح حیات لکھی ہے اس کے کچھ حصے ہم تک پہنچے ہیں۔ ان دنوں رباط میں موجود ایک مسودہ میں یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ "جب کبھی قرآن پاک کی کسی آیت کا نزول ہوتا تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے پہلے مردوں کے اجتماع اور پھر مسلمان عورتوں کے اجتماع میں سناتے۔" (آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عورتوں کی تعلیم سے گہری دلچسپی رکھتے تھے) چونکہ ہر شخص کی یادداشت مختلف ہوتی ہے (کسی کی کم جب کہ کسی کی زیادہ) چنانچہ یہ بات فطری معلوم ہوتی ہے کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم قرآنی آیات کو لکھ لیا کرتے تھے تاکہ فارغ وقت میں انہیں بار بار دہرا کر حفظ کر لیں۔ قرآن پاک کی آیت کو لکھنے کا کام کب شروع ہوا اس کا قطعی طور پر تعین نہیں کیا جا سکتا لیکن ہم جانتے ہیں (بحوالہ اسی کتاب کا پیراگراف نمبر 105) کہ جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایمان لائے تو قرآن الحکیم کی آیات تحریری شکل میں موجود تھیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دعویٰ نبوت کے پانچویں سال اور تبلیغ رسالت کے دوسرے سال اسلام قبول فرمایا جو کہ ہجرت مدینہ سے کوئی آٹھ سال پہلے کا زمانہ بنتا ہے۔ ہمیں علم ہے کہ اس موقع پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دو سورتوں 81 ویں (التکویر) اور 20 ویں (طٰہٰ) کا مطالعہ فرمایا تھا جو نزول کے اعتبار سے 7 ویں اور 45 ویں سورتیں تھیں۔ اس اطلاع کے صحیح ہونے پر شبہ کرنے کی کوئی معقول وجہ معلوم نہیں ہوتی کیونکہ ہجرت مدینہ سے پہلے نازل ہونے والی کئی سورتوں میں قرآن پاک کی تحریری نقول کا ذکر ملتا ہے۔ چنانچہ سورۃ 25 (جو نزول کے اعتبار سے 42 ویں ہے) کی آیت 5 اور سورۃ 56 (جو نزول کے اعتبار سے 46 ویں ہے) کی آیت 79 اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

وَقَالُوٓا اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ اکۡتَتَبَهَا فَهِیَ
تُمۡلٰی عَلَیۡهِ بُکۡرَۃً وَّ اَصِیۡلًا ۝

(الفرقان : 5)

"یہ بھی کہتے ہیں کہ افسانے ہیں یہ گزرے ہوئے
جو کسی سے اس نے (کچھ لے دے کے) ہیں لکھوا لیے
اور وہی پڑھ کر سنائے جاتے ہیں اس کو (مدام)
(اور کرائے جاتے ہیں وہ یاد اس کو) صبح و شام"

لَّا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الۡمُطَهَّرُوۡنَ ۝

(الواقعہ : 79)

"جو پاک ہیں بس اس کو چھوتے ہیں وہی"

قرآن الحکیم میں خود قرآن کے لیے لفظ کتاب کئی دفعہ استعمال ہوا ہے جس کا مطلب تحریری دستاویز ہے۔ سب سے پہلے نازل ہونے والی سورۃ العلق میں حکم دیا جاتا ہے کہ "پڑھیے"۔ اس حکم سے بھی قرآن الحکیم کو تحریر میں لانے کی تصدیق و توثیق ہوتی ہے۔

اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ ۝

(العلق : 1)

"اپنے رب کا نام لے کر (اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پڑھیے (قرآن)"

(275) معلم کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فیصلہ کیا کہ قرآن الحکیم کی مختلف سورتوں کو ان کے نزول کے مطابق مشینی طریقے سے ترتیب نہیں دیا جانا چاہیے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن الحکیم کی تمام سورتوں کی خود ترتیب لگائی۔ یہی وجہ ہے کہ سب سے پہلے نازل ہونے والی سورۃ جس میں قلم کی تعریف کی گئی ہے اور اسے انسانی علم کا نگران و نگہبان قرار دیا گیا ہے اب قرآن الحکیم کی 114 سورتوں میں 96ویں نمبر پر ہے۔ ایسا کرنا ضروری بھی تھا کیونکہ قرآن الحکیم کی سورتیں ایک ساتھ نازل نہیں ہوئیں بلکہ مختلف آیات مختلف اوقات میں نازل ہوئی ہیں۔ مورخین کے مطابق بعض اوقات کئی سورتوں کی آیات ایک ہی وقت بھی نازل ہوتی تھیں۔ جب بھی کوئی نئی آیت نازل ہوتی تو معلم کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرما دیتے تھے کہ اسے کونسی سورۃ میں کس مقام پر ترتیب دیا جائے۔

کے ان قطعی نسخوں میں سے دو نسخے اب بھی محفوظ و مامون ہیں۔ ایک نسخہ ترکی کے میوزیم توپ کاپی میں اور دوسرا تاشقند کی لائبریری میں موجود ہے قرآن الحکیم کے جو نسخے بعد کے زمانوں میں مختلف مسلمان ممالک میں تیار ہوئے وہ بھی مختلف مقامات پر محفوظ ہیں۔ جرمنی کی میونخ یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ برائے تحقیق قرآن نے پوری دنیا سے قرآن الحکیم کے مکمل و نامکمل 42,000 نسخے جمع کیے اور ان پر 50 سال تک تحقیق کی گئی اور ثابت ہوا کہ ان میں کوئی قابل ذکر اختلاف قطعی طور پر نہیں پایا جاتا۔ تاہم کتابت کی بعض غلطیوں کی نشاندہی کی گئی۔ یہ عظیم الشان ادارہ دوسری عالمی جنگ کے دوران امریکی بمباری سے تباہ ہو گیا تھا۔

(279) یہ حکایت امت مسلمہ تک قرآن الحکیم پہنچانے کی حکایت ہے۔ اب قرآنی مواد و مندرجات کے حوالے سے یہ بتانا ضروری ہے کہ قرآن الحکیم میں رب تعالیٰ جل شانہٗ کی حمد وثناء، احکامات، ممنوعہ افعال و اعمال، وعدے، سزا و جزا، قصے اور تاریخی روایات ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ بعض اوقات صیغہ متکلم یعنی ''میں'' یا ''ہم'' میں کلام فرماتے ہیں اور بعض اوقات اپنے لیے صیغہ واحد غائب یعنی ''وہ'' میں کلام فرماتے ہیں۔ قرآن الحکیم کے سب سے پہلے مخاطب نبی مکرم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ قرآن الحکیم میں بعض جگہوں پر تلمیح اور استعارہ بھی استعمال فرماتے ہیں جنہیں اللہ تبارک وتعالیٰ کے پاک رسول اور مقرب ترین بندے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی سمجھ سکتے ہیں چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ہی اللہ تبارک وتعالیٰ کا کلام لوگوں تک پہنچانے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے اور شاید یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ بادشاہوں کا انداز گفتگو عام لوگوں کی طرح نہیں ہوتا۔ بادشاہ اپنے کلام کے دوران جملے تبدیل کر کے استعمال کرتے ہیں یعنی میں کہتا ہوں یا مابدولت فرماتے ہیں۔ یا شاہ کہتا ہے یا مالک فرماتا ہے وغیرہ۔ قرآن الحکیم کا انداز بیان دلکش اور پُر عظمت ہے اور اس حقیقت کو سبھی افراد حتٰی کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دشمن بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اگرچہ قرآن پاک نثر میں ہے مگر اس میں شاعری کی تمام تر خوبیاں اور رعنائیاں حتٰی کہ ردیف، قافیہ وغیرہ تک موجود ہے اور صورت حال یہاں تک ہے کہ اگر کسی قرآنی آیت کے کسی لفظ کے ایک حرف تک کو نہ بولا جائے تو اس کی خوبصورت صوتی کیفیت اپنا حسن کھو دیتی ہے اور فوراً پتہ چل جاتا ہے کہ کوئی غلطی ہوئی ہے۔ مسلمانوں نے قرأت کا فن ایجاد کیا جو خوبصورت صوتی کیفیت کی ایک شاخ ہے یہ دنیا میں بے مثل و بے مثال ہے اور اس کی آج تک ہر طرح سے تعریف وتوصیف کی جاتی ہے۔

(280) سرسری طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہودیوں کی مقدس کتاب "عہد نامہ قدیم" بلکہ اس کا اہم ترین حصہ زبور بھی جس کی پانچ کتابیں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے منسوب کی جاتی ہیں ایک نسل کی تاریخ پر مشتمل ہیں۔ جس میں کہیں کہیں اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکامات بھی دیئے گئے ہیں۔ دوسرے انبیاء کی کتابوں میں بھی یہودیوں کی اس دور کی تاریخ ہی بیان کی گئی ہے۔ اسی طرح انجیل (عہد نامہ جدید) میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سوانح حیات ہے جو ان کے حواریوں اور پیروکاروں نے ان کی وفات کے بعد صرف اپنی یادداشت کی بنیاد پر تیار کی ہے۔ لیکن قرآن الحکیم کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ قرآن الحکیم کو خود پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کہ دین اسلام کے بانی ہیں نزول کے ساتھ ہی اپنے سیکرٹریوں کو لکھوایا اور اس کو پوری درستگی و حفاظت کے ساتھ دوسروں تک پہنچانے کے لیے بہتر اور مؤثر اقدامات کیے قرآن الحکیم اپنی اصلی اور خالص حالت میں ہم تک پہنچا ہے۔ 1400 سالوں سے زیادہ عرصہ ہونے کے باوجود اس کے الفاظ اور گرائمر تو ایک طرف اس کا ایک حرف تک نہیں تبدیل ہوا۔ اس کا یہ خوش گوار نتیجہ ہے کہ جو لوگ آج عربی اخبارات پڑھ سکتے ہیں وہ قرآن پاک کو سمجھ بھی سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ محض ترکی میں 5 لاکھ مرد وخواتین حافظ قرآن ہیں۔ موریطانیہ کی 80 فیصد آبادی حافظ قرآن ہے جب کہ دنیا بھر میں کروڑوں کی تعداد میں قرآن الحکیم کے حافظ موجود ہیں۔

حدیث اور سُنہ:

(281) پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وہ اقوال جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن الحکیم میں شامل نہیں کرائے "حدیث" کہلاتے ہیں۔ اگر رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ فرمائیں کہ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ہے۔ مگر اسے قرآن الحکیم میں شامل نہ کرائیں تو وہ "حدیث قدسی" کہلاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول کو صرف "حدیث" کہتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے افعال و اعمال سنت کی بنیاد ہیں لیکن بعض اوقات حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپس میں یوں مل جاتے ہیں کہ انسان "حدیث" اور "سنت" کو ہم معنی سمجھنے لگتا ہے۔ "حدیث" آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے افعال واقوال دونوں کا احاطہ کرتی ہے۔ اسی طرح سنت بھی آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے افعال واقوال کا احاطہ کرتی ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے افعال و

اعمال سے مراد وہ کام ہیں جو آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود کیے۔ اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ایسے افعال و اعمال بھی جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم میں آئے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی توثیق کی وہ بھی سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں شامل سمجھے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نبی مکرم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں جو باتیں رائج تھیں اور ان کی توثیق آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کی وہ بھی سنت سے کم نہیں۔ جیسا کہ ایک قانونی قول ہے کہ "جب بات ضروری ہو اور اس پر کوئی شخص خاموشی اختیار کرے تو اس کی خاموشی کو اس کی رضامندی سمجھنا چاہیے۔"

(282) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث وسنت کی ترتیب و تدوین ایک بہت مختلف اور جدا قصہ ہے۔ احادیث کا ایک حصہ تو خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے تحریر میں لایا گیا۔ ان میں رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خطوط، معاہدے، مدینہ سے دور عمال کے لیے ہدایات اور اسناد اور اس طرح کی دوسری دستاویزات شامل ہیں۔ ایسی مثالیں بھی ہیں کہ جب لوگوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث تحریر کر کے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں پیش کیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود ان کے متن کی تصحیح فرمائی۔ ان میں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذاتی ملازم حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مثال واضح ترین ہے۔ تقریباً ایک درجن صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم ایسے ہیں کہ جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ ہی میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں اپنی یادداشتیں ترتیب دیں۔ اسی طرح کم از کم 50 صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم ایسے ہیں جنہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس دار فانی کو خیرباد کہنے کے فوراً بعد وہ سب کچھ تحریر کیا جو وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں جانتے تھے۔ البتہ ایسے افراد تو بے شمار ہیں جنہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت تو نہیں کی تھی تاہم انہیں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے ملاقات کا اعزاز حاصل ہوا تو انہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں سوالات کیے اور جوابات حاصل کر کے اس عظیم علمی خزانہ کو تحریری طور پر محفوظ کیا۔ حدیث پاک کے ایک مستند و معتبر ماہر کا بیان ہے کہ ایسے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی تعداد جنہوں نے کم از کم ایک حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیان کی ہے ایک لاکھ سے زیادہ ہے اور اس میں کوئی مبالغہ بھی نہیں۔ ہم اس بات کا علم رکھتے ہیں کہ نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر میدان عرفات

میں ایک لاکھ چالیس ہزار مسلمانوں کے اجتماع سے خطاب کیا تھا۔

(283) پہلی نسل میں تو صرف اور صرف صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی یادداشتیں ہی ہو سکتی تھیں۔ دوسری نسل میں اگر کسی طالب علم نے ایک سے زائد صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے علم حاصل کیا ہو تو وہ مختلف ذرائع سے حاصل کردہ علم کو زیادہ بہتر اور جامع و مربوط انداز میں مرتب کر سکتا تھا۔ تیسری نسل میں تمام ذرائع سے حاصل ہونے والی معلومات کو یکجا کیا جا سکتا تھا اور حدیث و سنت کی ترتیب و تدوین میں بالکل یہی ہی ہوا ہے۔

(284) قرآن الحکیم کی طرح چونکہ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ترتیب و تدوین پر مؤثر کنٹرول نہیں ہو سکتا تھا اس لیے غلط فہمی، غلطیوں اور دوسرے امکانات و خدشات پیدا ہو سکتے تھے۔ چنانچہ ان امکانات کو مدنظر رکھتے ہوئے مسلمانوں نے احادیث رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی انفرادی روایت کی اچھی طرح جانچ و جرح کے لیے سائنسی طریق کار اختیار کیا اور اس کا آغاز صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے دور سے ہی ہو چکا تھا۔ احادیث کو روایت کرنے والوں کی سوانح حیات بڑی محنت و مشقت سے مرتب کی گئی جس میں راویٔ حدیث کی شہرت و دیانت کے حوالے سے مستند و معتبر یا ضعیف ہونے پر خاص طور پر توجہ دی گئی۔ راوی کے اساتذہ اور شاگردوں کی بھی تفصیل کے ساتھ ساتھ دوسری متعلقہ معلومات بھی دی گئیں۔ یوں تیسری اور بعد میں آنے والی نسلوں کا تو ذکر ہی کیا صرف دوسری نسل میں ہی صرف یہ کہنا کافی نہ تھا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا" بلکہ حدیث کے راوی کو یہ بتانا پڑتا تھا کہ "میں نے یہ حدیث اپنے فلاں اُستاد سے سنی ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے ہیں ......" تیسری نسل میں یوں کہنا پڑتا تھا کہ "میں نے اپنے فلاں اُستاد سے سنا جس نے اپنے فلاں اُستاد سے سنا ہے (جو کہ صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ......" اور یوں فطری طور پر کسی بھی حدیث کی روایت کے لیے راویوں کی فہرست نسل در نسل بڑھتی چلی گئی۔

(285) حدیث کے مستند و معتبر اور درست و صحیح کی جانچ کا ایک طریقہ اور بھی تھا۔ وہ یہ کہ اگر کوئی حدیث رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک سے زیادہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے روایت کی ہے اور سب نے ایک ہی بات کی ہے تو ایسی حدیث پاک کسی ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مقابلے میں زیادہ معتبر و مستند سمجھی جاتی تھی۔

(286) ترتیب و تدوین کے دوسرے طریقوں کے ساتھ ساتھ احادیث کو راویوں کے لحاظ

سے یا موضوع کے اعتبار سے ترتیب دیا جا سکتا تھا لیکن ہر طریقے میں ہر حدیث کے ذرائع کا مفصل ذکر ضروری تھا۔

(287) مختلف راویوں سے روایت کردہ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اختلاف کا بھی امکان تھا یہ اختلاف مختلف نسل کے راویوں کی غلطی کی وجہ سے ہو سکتا تھا یا پھر یہ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی بات پر اپنے رویہ میں ترمیم کر کے اپنے سابقہ حکم کو منسوخ کر دیا ہو۔ ایسے اور اسی طرح کے دیگر معاملات کے حوالے سے علم الحدیث کی کتابوں میں بحث موجود ہے تاہم یہ کہنا کافی ہے کہ رسول رحمت حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث وسنت کے حوالے سے جس قدر اور جتنی معلومات اکٹھی کی گئی ہیں دنیا کی تاریخ میں اس کی کوئی بھی مثال نہیں ملتی۔

سیرت رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:

(288) نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے سے تحریر کردہ کتب کی تیسری قسم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سوانح حیات سے متعلق ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس دار فنا سے کوچ کر جانے کے بعد لکھی گئیں۔ اس قسم کی اولین کتب صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے بیٹوں نے لکھیں۔ ان میں حضرت عروہ ابن الزبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم بھی شامل ہیں۔ ان کتابوں کے بعض حصے ہی ہم تک پہنچ پائے ہیں جن کا ذکر بعد کی نسلوں کے مصنفوں نے اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ رسول مکرم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قدیم ترین سوانح حیات جس کے قلمی نسخے کے بعض حصے ہم تک پہنچے ہیں ایک تابعیؒ (جس نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور ان کے پیروکاروں کی نگرانی میں علم حاصل کیا ہو) کی تحریر کردہ ہے۔ یہ تابعی حضرت ابن اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ ان کا انتقال 768ء (151 ہجری) میں ہوا تھا۔ ایسی کتب کو ''سیرت'' کہا جاتا ہے۔ یہ کتب ان کتابوں کی طرح ہیں جن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے حالات ان کے حواریوں نے بیان کیے ہیں۔ چونکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان سیرت نگاروں نے اپنے ماخذ تفصیل سے بیان کرنے کا طریقہ اختیار کیا ہے لہٰذا ان کے معتبر ہونے اور ان کتب میں دیئے گئے حقائق کے مستند ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔

وثیقہ جات دور نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:

(289) یہ دو قسم کے ہیں۔ پہلی قسم ان کتبوں کی ہے جو خاص طور پر مدینہ منورہ، مکہ معظمہ اور

طائف وغیرہ میں دستیاب ہوئے ہیں ۔ بعض کتبوں پر تاریخیں بھی ملی ہیں ۔ مثلاً طائف کے نزدیک ایک واٹرڈیم ہے جس پر صحابی حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گورنر کا نام مع سن کندہ ہے ۔ کئی ابتدائی دور کے کتبوں پر تاریخ نہیں لکھی گئی ۔ ان میں سے بعض کتبے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور کے ہیں ۔ (میں نے بعض ایسے مدنی کتبوں کے عکس شائع کیے ہیں اور بعض کا مطالعہ بھی کیا ہے جو میرے خیال میں 5 ہجری جنگ خندق کے زمانے کے ہیں ۔ مصنف) ۔

(290) وثیقہ جات نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دوسری قسم خطوط پر مشتمل ہے ۔ نبی اکرم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منسوب پانچ خطوط کے اصل مسودے ہم تک پہنچے ہیں ۔ ان میں سے مقوقس (مصر میں قبطیوں کا سردار) کے نام ایک خط استنبول کے توپ کاپی عجائب گھر میں موجود ہے ۔ مصر کے قدیم مخطوطوں میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کئی خطوط ملے ہیں جو 22 ہجری اور اس کے بعد لکھے گئے ہیں ۔ چونکہ ان پر تاریخیں درج ہیں اس لیے ان میں جعل سازی کا خدشہ نہیں ہے ۔

(291) نبیٔ آخر الزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتی استعمال کی بعض چیزیں ہم تک پہنچی ہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے موئے مبارک تو اکثر ممالک میں ہیں ۔ استنبول، ہندوستان اور بعض دوسرے ملکوں میں سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جُبہ یا دوسرے لباس مبارک موجود ہیں تاہم ان چیزوں کے حقیقی ہونے کی کوئی ضمانت نہیں ۔ مثال کے طور پر تاریخ اسلام میں یہ ہے کہ سرورِ کونین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلوار "ذوالفقار" اسلام کے شروع ہی میں ٹوٹ گئی تھی مگر یہی "ذوالفقار" بالکل صحیح حالت میں استنبول کے توپ کاپی عجائب گھر میں محفوظ ہے ۔ سپہ سالارِ اعظم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منسوب یہ چیزیں اگر حقیقتاً اصلی ہوں تو ان سے اس دور کی صنعتی تاریخ کے حوالے سے معلومات میں اضافہ ہو سکتا ہے ۔

عقل اور مافوق الفطرت:

(292) انسانی تاریخ میں متقی اور پرہیزگار انسانوں کی زندگی میں مافوق الفطرت (قانون فطرت سے بالا، غیر فطری) باتیں پائی جاتی ہیں چاہے وہ نبی اور کسی مذہب کے بانی ہوں یا ولی ہوں جیسے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، زرتشت اور گوتم بدھ وغیرہ ۔ یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

حیات مبارکہ میں بھی مافوق الفطرت واقعات پائے جاتے ہیں۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعض عظیم معجزے بیان کیے جاتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مردے کو زندہ کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انگلی سے اشارہ کیا تو چاند دو ٹکڑے ہو گیا اور پھر جڑ گیا۔ خوراک کی معمولی سی مقدار بے شمار لوگوں کے لیے کافی ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بلند ترین مقام رب رحمٰن ورحیم کے حضور جا کر واپس زمین پر تشریف لے آئے۔ اسی طرح کے کئی اور معجزوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ مومن اپنے نبی پاک حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان معجزات پر بجا طور پر فخر وافتخار محسوس کرتے ہیں۔

(293) چند باتیں تاہم قابل غور وتوجہ ہیں۔ قرآن الحکیم کے مطابق معجزہ پیغمبر نہیں بلکہ رب تعالیٰ جل شانہٗ دکھاتے ہیں۔ سرور کونین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود کچھ نہیں کر سکتے۔ رب خالق وقادر کے لیے کوئی بات بھی معجزہ نہیں۔ رب خالق ومالک فرماتے ہیں ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے کسی وجہ اور سبب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا نہ ہی کسی مثال کی ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ جل شانہٗ جب چاہیں اور جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ رب کائنات کے بعض نبیوں نے حیران کن کام کیے ہیں جبکہ بعض نبیوں کو ان کے ساتھیوں نے ہی قتل کر دیا مگر ان کی زندگی بچانا اللہ تبارک وتعالیٰ کی مرضی نہیں تھی۔

(294) قابل غور وفکر بات یہ ہے کہ معجزوں کی اصل افادیت کسی موقع سے متعلق اور اضافی ہوتی ہے۔ مسلمان ہمیشہ اس بات پر متفق رہے ہیں کہ کسی بھی نبی یا پیغمبر کے لیے معجزے ضروری نہیں۔ دوسری بات یہ کہ معجزوں سے کسی کو کسی بات پر مائل وقائل نہیں کیا جا سکتا کیونکہ معجزوں کو کسی مافوق الفطرت امر کے حوالے سے کسی دعوے یا اصول کی سچائی کا ٹھوس اور مستند ومعتبر ثبوت نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ مثلاً: ہمیں علم ہے کہ دو اور دو مل کر چار بنتے ہیں۔ فرض کریں کہ کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ دو اور دو مل کر پانچ بنتے ہیں کیونکہ میں ننگے پاؤں آگ پر یا پھر یہ کہ پانی پر چل سکتا ہوں۔ ان دونوں باتوں میں کوئی تعلق یا عقل مندانہ بات نہیں۔ دو اور دو ہمیشہ چار ہی ہوتے ہیں پانچ نہیں ہو سکتے۔ یہ سچائی ریاضی کے اصول سے بھی ثابت کی جا سکتی ہے۔ رہی بات یہ کہ آگ پر ننگے پاؤں چل کر یا ڈوبے بغیر پانی پر چل کر دکھا بھی دیا جائے تو قانونِ فطرت میں ضرور اس کا کوئی سبب اور وجہ ہو گی کیونکہ ہماری یہ دنیا سبب اور وجہ پر قائم ہے۔ قرآن حکیم بار بار یقین دہانی کراتا ہے کہ رب تعالیٰ جل شانہٗ قانون فطرت کو تبدیل نہیں فرماتے (تاہم اگر اللہ تبارک وتعالیٰ پسند

فرمائیں تو ایسا کرنے پر قادر ہیں)۔

سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ
مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ﴿۷۷﴾

(بنی اسرائیل : 77)

"تم سے پہلے ہم نے بھیجے ہیں (یہاں) جتنے نبی
کچھ یہی دستور (دنیا میں) رہا ہے ان کا بھی
اور جو دستور ہیں (ہم نے مقرر کر دیئے)
تم کوئی ردوبدل ان میں نہ ہرگز پاؤ گے۔"

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ
تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴿۶۲﴾

(الاحزاب : 62)

"ہاں یہی اگلوں میں بھی دستور تھا اللہ کا
تم نہ پاؤ گے کبھی تبدیل دستورِ خدا"

فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ﴿۴۳﴾

(فاطر : 43)

"تم بدلتا پاؤ گے ہرگز نہ دستورِ خدا
اور نہ دستورِ خدا کو پاؤ گے ٹلتا ہوا"

سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾

(الفتح : 23)

"یونہی پہلے سے چلا آتا ہے دستورِ خدا
تم تغیر اس کے آئیں میں نہ پاؤ گے ذرا"
(آئیں یعنی آئین)

اگر کسی مافوق الفطرت واقعہ کی وجہ یا سبب کسی کو معلوم نہیں ہو سکتا تو وہ اسے معجزہ کہتا ہے چاہے وہ واقعہ کسی رسول یا ولی کے ذریعہ ہوا ہو یا حتیٰ کہ کسی شیطانی ذہن کی کارروائی ہو۔ کوئی سوچ اور سمجھ نہ رکھنے والا انسان ہی ایسے کسی واقعہ کو دو اور دو برابر ہوئے پانچ کے اصول کی

تصدیق تسلیم کرے گا۔ دو اور دو کو چار ثابت کرنے کے لیے کسی معجزے کی ضرورت قطعاً نہیں بلکہ ریاضی کی تھوڑی سی واقفیت کی ضرورت ہے۔ اسی طرح دعویٰ نبوت، اللہ تبارک وتعالیٰ کی وحدانیت، موت کے بعد حیات اور یوم آخرت وغیرہ پر ایمان لانے کے لیے عام عقل اور سمجھ رکھنے والے انسان کے لیے بھی کسی معجزے کی ضرورت نہیں۔ انبیاء کرام علیھم السلام کے معجزے تاریخی حقائق ہیں مگر میری ناقص سمجھ کے مطابق یہ معجزے ان انبیاء کرام علیھم السلام کی تعلیمات کی صداقت کی کوئی دلیل، بنیاد یا ثبوت نہیں ہیں۔ انبیاء کرام علیھم السلام کی تعلیمات ان معجزوں کے بغیر بھی سچی اور مبنی برحق ہیں۔ یہ بڑی اہم بات ہے کہ اس طرح کے معاملات میں قرآن نے معجزہ کا لفظ استعمال نہیں کیا بلکہ انہیں آیات یعنی نشانیاں قرار دیا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کسی معجزہ کے بغیر ہی اسلام قبول کر لیا تھا مگر ابوجہل نے معجزے دیکھ کر بھی اسلام قبول نہ کیا۔ بعض افراد مافوق الفطرت واقعات کو دیکھتے ہی مغلوب ہو جاتے ہیں اور یوں معجزہ دکھانے والے کی ہر بات فوراً تسلیم وتصدیق کرتے ہیں۔

(295) مزید یہ کہ اس بات کا بھی امکان ہے کہ کوئی عجیب مگر فطری واقعہ صرف تجسس اور تعریف وتوصیف کے علاوہ کوئی خاص توجہ حاصل نہ کر پائے مگر یہی واقعہ اس لمحے بہت زیادہ اہمیت حاصل کر جاتا ہے جب کسی کو اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ فرض کریں کہ چاند کے مادوں میں اندرونی آگ کی وجہ سے دھماکہ ہو جاتا ہے اور یوں چاند دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے مگر مادوں کی باہمی کشش (کشش ثقل) کی وجہ سے دونوں حصے دوبارہ آپس میں جڑ جاتے ہیں تو ہم ضرور کہیں گے کہ یہ ایک عجیب مگر فطری واقعہ ہے۔ لیکن اگر یہی واقعہ اس وقت وقوع پذیر ہو جب پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمن یہ کہہ رہے ہوں کہ اگر صرف اور صرف ایک خدا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر وقدیر ہے تو اسے کہو کہ وہ چاند کے دو ٹکڑے کر دے اور پھر اگر یہ واقعہ رونما ہوتا ہے تو ہم لازماً اسے معجزہ ہی کہیں گے۔ یہ معجزہ محض عجیب و غریب واقعہ نہیں بلکہ یہ مشرکین کے مطالبے پر وقوع پذیر ہوا ہے ورنہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے لاشریک ہونے اور چاند کے دو ٹکڑے ہونے میں کوئی تعلق نہیں بنتا۔ (فرض کرو نعوذ باللہ) اگر ایک سے زیادہ خدا ہوتے اور چاند کا خدا چاند کو سزا دینا چاہتا تو پھر بھی تو چاند کے دو ٹکڑے ہو سکتے تھے۔

(296) ایک اور نکتہ کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ غیر معمولی واقعات محض نبیوں تک محدود نہیں ہیں۔ اگر کوئی غیر معمولی واقعہ کسی نبی کے ہاتھوں رونما ہو تو اسے معجزہ کہا جاتا ہے

(معجزہ کے لغوی معنی ایسے واقعہ کے ہیں جس کے سامنے دوسرے عاجز ہوں یعنی وہ اس طرح کا کام نہ کرسکیں) اگر ایسا کوئی غیر معمولی واقعہ ولی کے ہاتھوں رونما ہو تو اسے کرامت کہا جاتا ہے۔شرپسندوں کو بھی خلاف فطرت واقعات کی طاقت وقوت دی گئی ہے۔اگر کسی شیطان سے ایسا واقعہ رونما ہو تو اسے استدراج (دوسروں کو دھوکہ دینے کے لیے خفیہ طور پر کوئی کام کرنا) قرار دیا جائے گا۔تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی سچے نبی اور جھوٹے مدعی نبوت کے درمیان وہ کون سی چیز ہے جو فرق قائم کرتی ہے؟

(297) ان وجوہات کو مدنظر رکھتے ہوئے میرا خیال ہے کہ قرآن الحکیم کبھی بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات پر زور نہیں دیتا بلکہ مومنین کو بار بار سوچنے، غور وفکر کرنے، توجہ ودھیان دینے، وجہ معلوم کرنے، دلیل ڈھونڈنے اور پھر نتیجہ اخذ کرنے کی تعلیم ودعوت دیتا ہے ۔اسلام کے مطابق ایمان دراصل دل سے تصدیق وتوثیق کا نام ہے محض جذبات کی رو میں بہہ جانے کا نام نہیں کیونکہ قرآن الحکیم ترقی یافتہ انسانیت کے لیے ہے قدیم وحشی اور غیر مہذب وغیر متمدن انسانوں کے لیے نہیں کہ جن کی سوجھ بوجھ ابھی ابتدائی مرحلے میں تھی اور وہ فطرت کے عظیم قوانین کو نہیں سمجھ پائے تھے اور یہ محض ان کے خوابوں ہی میں تھا کہ وہ چاند پر جاسکتے ہیں۔

(298) چنانچہ پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات وہ واقعات ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کی کتاب کے حاشیہ پر درج ہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ کا نچوڑ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات (اسوۂ حسنہ) ہیں۔

باب 11

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کا خلاصہ

(299) مذہبی علم کے ماہر ایک ہندوستانی برہمن کے مطابق معاشرے کا رسم ورواج بہترین قانون ہوتا ہے۔ چنانچہ مذہبی حکم میں عوام کے لیے قابل قبول تبدیلی مذہبی قانون کی خلاف ورزی نہیں سمجھی جائے گی چاہے وہ کسی ایک علاقے تک ہی محدود کیوں نہ ہو۔ یہودیوں میں یہودی عالم کی رائے کو زبور کے قانون پر ترجیح دی جاتی ہے۔ عیسائی تو اس سے بھی آگے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ پادریوں کا اجلاس روح القدس کے سائے میں منعقد ہوتا ہے۔ پہلے جو افراد اس سے انکار کرتے تھے ان کو پادریوں کی کونسل سے خارج کر دیا تھا مگر اب صرف کثرتِ رائے کو ہی کافی سمجھا جاتا ہے اور پوری کونسل کا (کسی معاملہ میں) متفق ہونا بھی ضروری خیال نہیں کیا جاتا۔ یوں کسی بھی عقیدہ یا رواج کو تبدیل کر دیا جاتا ہے۔

(300) صرف اسلام ہی دین کی اصلیت کو اہمیت دیتا ہے (یعنی اس میں ملاوٹ برداشت نہیں کرتا) دوسرے مذاہب کے برعکس اسلام واحد دین ہے جو بڑے افتخار واعزاز کے ساتھ اعلان کرتا ہے کہ اس کے عقیدے اور عبادت کے طریقے آج بھی انہی قوانین کے پابند ہیں جو ہادیٔ کون ومکاں حضرت مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں تھے۔ انفرادی طور پر انہیں نظر انداز کیا جا سکتا ہے مگر پھر بھی ایسا فرد یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس کا عمل اسلام کے مطابق ہے۔ اسلام میں بعض فرقے یقیناً اب بھی موجود ہیں جنہوں نے زمانہ جاہلیت کے رواج خاص طور پر وراثت کے معاملے میں ابھی تک اپنائے ہوئے ہیں تاہم وہ رضا کارانہ طور پر اس کا اقرار و اعتراف کرتے ہیں کہ ان کے یہ رواج اسلام کے مطابق نہیں ہیں۔

(301) ہم یہ جانتے ہیں کہ اسلامی تعلیمات کی بنیادی دستاویزات خاص طور پر قرآن الحکیم انتہائی با اعتماد ذریعوں سے مکمل طور پر اپنی اصلی زبان و بیان میں ہم تک پہنچی ہیں۔ چنانچہ ہمارے لیے یہ معلوم کرنا کہ رسول مکرم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کیا تعلیمات ہیں بہت آسان ہے۔ اسلام کی ان تعلیمات کو کوئی شخص قبول کرسکتا ہے اور قبول نہیں بھی کرسکتا تاہم وہ یہ تسلیم کرنے پر ضرور مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ تعلیمات وہی ہیں جو ہادیٔ کون ومکاں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عنایت کی تھیں۔

(302) کسی علاقائی یا قومی مذہب اور آفاقی و کائناتی دین میں بڑا فرق ہوتا ہے۔اسی طرح عارضی اور مستقل مذہب میں بھی فرق ہوتا ہے۔قرآن اور حدیث میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تبارک وتعالیٰ کے آخری نبی ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔

(303) مذہبی عقائد پر ایمان اور مذہبی قوانین کی پابندی ہمارے فرائض ہیں۔ایک روح کے لیے اور ایک جسم کے لیے ضروری ہے۔قرآن اور حدیث نے انتہائی ضروری اصول وقواعد بیان کیے ہیں جب کہ باقی سب کچھ انسان کی مرضی اور استطاعت پر چھوڑ دیا ہے۔رب تعالیٰ جل شانہٗ پر ایمان لانا لازمی ہے مگر (ہر ایک کے ذہن میں) رب رحمٰن ورحیم کا ایک جیسا تصور ممکن نہیں یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ رب ذوالجلال ہم پر ہماری استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے جیسا کہ قرآن الحکیم نے اعلان کیا ہے۔

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا

(البقرہ : 286)

''حسب وسعت، نفس کو تکلیف دیتا ہے خدا''

(304) ایک دن پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود ہی اپنی تعلیمات کا خلاصہ بیان فرمایا اس حوالے سے جو حدیث پاک ہم تک پہنچی ہے وہ احادیث پاک کی مستند ومعتبر ترین کتب صحیح بخاریؒ اور صحیح مسلمؒ وغیرہ میں موجود ہے۔اس حدیث پاک کے ایک ایک لفظ کی بنیاد قرآن پاک ہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْہِ مِنْ رَّبِّہٖ
وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ ۟
لَانُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ ۟ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا
غُفْرَانَکَ رَبَّنَا وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ ۝

(البقرہ : 285)

''رب نے جو نازل کیا، ہے اس پر ایمان رسولؐ
اور مسلمانوں نے بھی، سب نے (کیا اس کو قبول)
کر لیا سب نے خدا پر اور فرشتوں پر یقیں

انبیاء پر اور کتابوں پر بھی (جو نازل ہوئیں)
ایک کو بھی وہ رسولوں میں نہیں رکھتے جدا
اور کہتے ہیں (ترے ارشاد کو) ہم نے سنا
اور کیا تسلیم، تجھ سے مغفرت کی ہے دعا
یاالٰہی! تیری ہی جانب ہمیں ہے لوٹنا۔"

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝

(النساء : 136)

"لاؤ ایماں حق پر اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مومنو!
جو کتاب اتری پیمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر، یقیں اس پر کرو
اس صحیفے پر بھی، جو پہلے ہی نازل ہو چکا
جس نے انکار (اس) خدا سے اور نبیوں سے کیا
اور جو منکر صحیفوں اور فرشتوں کا ہو
اور نہیں روز قیامت پر یقیں جس کو (ذرا)
وہ بہک کر دور (سیدھے راستے سے) جا پڑا"

حدیث رسول رحمت حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق ایک دن ایک اعرابی نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا "ایمان کیا ہے؟" سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "ایک اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، روز آخرت پر اور یہ کہ اچھائی یا برائی سب اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی طرف سے ہے پر یقین رکھنا ایمان کہلاتا ہے۔"

پھر اس نے پوچھا اسلام کیا ہے؟ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمایا "نماز قائم کرنا، رمضان کے مہینے میں روزے رکھنا، اگر (مالی) حیثیت ہو تو حج کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا اسلام ہے۔"

اس نے مزید پوچھا: "احسان کیا ہے؟" آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "تم اس طرح عبادت کرو یعنی نماز پڑھو کہ جیسے تم اللہ تبارک وتعالیٰ کو حاضر دیکھ رہے ہو اور اگر چہ تم

اللہ تبارک وتعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتے تاہم اللہ تبارک وتعالیٰ تمہیں دیکھ رہے ہیں۔''

جب یہ اجنبی چلا گیا تو معلم کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (حاضرین سے) فرمایا: ''دیکھو وہ کون ہے؟'' مگر وہ تو پہلے ہی غائب ہو چکا تھا۔ اس پر پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''یہ جبرئیل (علیہ السلام) تھے جو تمہیں تمہارا دین سکھانے آئے تھے۔''

کوئی شخص اس سب کچھ کو اس طرح تصور کر سکتا ہے کہ اسلام ایک شاندار عمارت کی طرح ہے جس کی چھت ہمارا ایمان ہے۔ اور وہ چار ستون جو اس چھت کو سنبھالے ہوئے ہیں وہ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج ہیں اور اس عمارت کی آرائش وزیبائش اسلام کے عقائد اور عبادت کے صحیح طریقوں پر خلوصِ دل سے عمل کرنے سے قائم ہوتی ہے۔

(305) نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کا عمدہ، ہم آہنگ اور منطقی خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو اپنے خالق رب تعالیٰ جل شانہٗ پر ایمان رکھتے ہوئے رب قادر وقدیر کی اطاعت کرنا چاہیے۔ وہ ذات پاک اتنی بڑی اور اعلیٰ ہے کہ ہماری عقل وفہم سے بالاترین ہے۔ اس ذات پاک کے احکامات ہم تک نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے پہنچتے ہیں۔ جن کے پاس ایک فرشتہ لے کر آتا ہے۔ پھر یہ کہ یوم قیامت جو کہ یوم حساب ہے اس پر بھی یقین کامل رکھنا چاہیے۔ اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ کوئی چیز اپنی حیثیت میں بذات خود اچھی یا بُری نہیں ہوتی بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہی مختلف چیزوں کو مختلف خواص عطا فرماتے ہیں۔

(306) دین اسلام کے انتہائی سادہ عقیدے میں دل اور روح کو متاثر کرنے والے عوامل میں اس کی آفاقیت اور تسلسل ہے جن میں تحمل اور رواداری نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ اسلام کا خدا (جل شانہٗ) محض کسی خاندان یا قبیلے کا نہیں بلکہ کائنات میں موجود سب کا خدا (جل شانہٗ) ہے۔ (یہی اس کی آفاقیت ہے) مسلمان کے لیے تمام الہامی کتابوں پر ایمان لانا لازمی ہے صرف ایک کتاب یعنی قرآن الحکیم پر نہیں۔ مسلمان کو تمام رسولوں پر بھی ایمان لانے کا اعلان کرنا ہے صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نہیں (یہی اس کا تسلسل ہے) حالانکہ اگر اسلام محض قرآن الحکیم اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے تک بھی محدود ہوتا تو یہ عقل ودلیل کے حوالے سے قابل قبول ہوتا لیکن نہیں!! دل کا بڑا ہونا اور ظرف کا اعلیٰ ہونا (مسلمان کے لیے) اسلام کی ایسی خوبی ہے کہ جس کی دنیا کے مذاہب کی تاریخ میں کوئی مثال

نہیں ملتی (یہ تحمل اور رواداری ہے) حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک تمام انبیاء کرام علیہم السلام جو کسی بھی زمانہ میں کسی بھی قوم یا نسل اور کسی بھی ملک کے لیے مبعوث کیے گئے اور حتیٰ کہ تمام کتابیں جو رب ذوالجلال نے مختلف زبانوں میں مختلف پیغمبروں پر نازل کیں سب اسلام کے انبیاء اور اسلام کی کتابیں ہیں قرآن الحکیم میں بار بار اس امر کا اعلان کیا گیا ہے کہ رب تعالیٰ جل شانہٗ نے کسی فرق کے بغیر ہر دور میں تمام قوموں کے لیے انبیاء کرام علیہم السلام مبعوث فرمائے۔ قرآن الحکیم میں بے شمار انبیاء کرام علیہم السلام کے ناموں کا ذکر بھی کیا گیا ہے اور واضح الفاظ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے انبیاء کرام علیہم السلام بھیجے گئے۔

(307) یہ بات بالکل واضح ہے کہ جب کوئی قانون ساز ایک ہی موضوع پر ایک سے زائد بار قانون نافذ کرتا ہے تو سب سے آخر میں نافذ کیا جانے والا قانون ہی مؤثر اور رائج سمجھا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی سابق قانون پر ہی قائم رہے اور رائج الوقت قانون پر عمل پیرا نہ ہو تو اسے قانون کا پابند شہری قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگرچہ تمام قوانین ایک ہی قانون ساز لاگو کرتا ہے مگر ایک قانون دوسرے کی جگہ لے لیتا ہے اور بعد میں نافذ شدہ قانون، سابقہ قانون کو منسوخ کر دیتا ہے چنانچہ اسی اصول کے تحت تمام الہامی کتابوں اور رب تعالیٰ جل شانہٗ کے بھیجے ہوئے تمام رسولوں پر مسلمان ایمان تو رکھتے ہیں مگر عمل صرف رب رحمٰن ورحیم کی جدید ترین الہامی کتاب (قرآن الحکیم) پر کرتے ہیں۔

(308) عام معلومات اور موازنہ کے لیے مسیحی عقیدہ کا باضابطہ متن یہاں پیش کرنا شاید بے جا نہ ہوگا:

> ''میں یقین رکھتا ہوں قادر مطلق باپ پر جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور اس کے اکلوتے بیٹے ہمارے خداوند مسیح پر کہ وہ روح القدس سے مجسم ہو کر کنواری مریم سے پیدا ہوا۔ پونٹیس پائلٹ (Pontius Pilate) (رومی گورنر جس نے مسیح علیہ السلام کی پھانسی کا حکم دیا) کی حکومت میں دکھ اُٹھایا۔ صلیب پر کھینچا گیا، فوت ہوا اور دفن ہو کر زمین میں نیچے چلا گیا۔ تیسرے دن مُردوں میں سے جی اُٹھا۔ آسمان پر چڑھ گیا اور خدا باپ قادر مطلق کے دائیں ہاتھ پر بیٹھ گیا (نعوذ باللہ) جہاں سے وہ زندوں اور مُردوں کا انصاف کرنے کے لیے آئے گا۔ میں یقین رکھتا ہوں

روح القدس پر پاک کیتھولک چرچ پر، مقدس افراد کی رفاقت پر، گناہوں کی معافی پر، جسم کے دوبارہ جی اُٹھنے پر اور ہمیشہ کی زندگی پر۔ (آمین)"

(309) موجودہ دور کے دو بڑے مذاہب (اسلام، عیسائیت) کی بنیادی التجا (دعا) کا معلوماتی موازنہ درج ہے۔

اسلام	عیسائیت
پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: سورۃ الفاتحہ کی تلاوت کے بغیر کوئی نماز جائز نہیں۔ سورۃ الفاتحہ یہ ہے: اللہ تبارک وتعالیٰ کے نام سے آغاز کرتا ہوں جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔ سب تعریفیں اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔ بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔ یوم جزا کا مالک ہے۔ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔ ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔ ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا۔ ان کا نہیں جن پر تیرا عذاب نازل ہوا اور نہ ان کا جو گمراہ ہوئے۔ (آمین) (الفاتحہ : 1تا7)	حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پہاڑ پر اپنے وعظ میں کہا: اور دعا کرتے وقت کفار کی طرح بے فائدہ باتیں نہ دہراؤ...... کیونکہ تمہارا باپ تمہارے مانگنے سے پہلے ہی جانتا ہے کہ تم کن کن چیزوں کی ضرورت رکھتے ہو۔ پس تم اس طرح دعا کیا کرو کہ اے ہمارے باپ! تُو جو آسمان پر ہے تیرا نام پاک تسلیم کیا جائے۔ تیری بادشاہی آئے۔ تیری مرضی جیسے آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو۔ ہماری روزانہ کی روٹی آج ہمیں دے اور جس طرح ہم نے اپنے قرض داروں کو معاف کر دیا ہے تو بھی ہمارے قرض معاف کر اور ہمیں آزمائش میں نہ ڈال بلکہ بُرائی سے بچا کیونکہ بادشاہی، قدرت اور جلال ہمیشہ تیرے ہیں۔ (متی (vi) 7تا13)

(310) "نیکی اور بدی کے تعین" پر اسلامی عقیدہ کے مطابق غور وفکر کی ضرورت ہے۔ کیا اس فارمولے کا تعلق قضا وقدر سے ہے؟ یہ یقینی نہیں۔ نیکی اور بدی کا تعین رب قادر وقدیر کا معاملہ ہے۔ یہی اس کے لغوی معنی ہیں۔ اس پر کوئی بھی اعتراض کا حق نہیں رکھتا۔ ایک ہی بات

کسی کے لیے بُری جب کہ دوسرے کے لیے اچھی ہو سکتی ہے۔ بھیڑیا خرگوش کو ہضم کر جاتا ہے۔ یہ بھیڑیے کے لیے غذا (یعنی بھلائی) ہے جب کہ خرگوش کے لیے موت (بُرائی) ہے۔ کسی بھی فیصلہ کن جنگ کا نتیجہ فاتح کے لیے اچھا جب کہ شکست خوردہ کے لیے بُرا ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ قتل بھی ہمیشہ بُرائی نہیں ہوتا۔ کوئی چھوٹا سا بچہ کسی پر گولی چلا دے۔ پاگل کسی کو گولی مار دے۔ کوئی شکاری پرندے پر گولی چلاتے ہوئے کسی انسان پر گولی چلا کر اس کی جان لے لے۔ سرکاری جلاد مجرم پر گولی چلا دے۔ کوئی سپاہی میدان جنگ میں دشمن کے سپاہی کو موت کے گھاٹ اُتار دے۔ ان مختلف افراد کی جانب سے کسی کی جان لینے میں کتنا فرق ہے! کسی کے لیے کوئی کام اچھا ہے جب کہ دوسرے کے لیے وہی کام بُرا ہے۔ عام سادہ معاملات میں تو عام سوجھ بوجھ اور اچھے ضمیر کی رہنمائی کافی ہو سکتی ہے مگر زیادہ پیچیدہ معاملات میں اسے لازماً رب قادر وقدیر کے سپرد کر دینا چاہیے۔ کیا ''نیکی اور بدی کا تعین رب تعالیٰ جل شانہٗ کا کام ہے'' کے فارمولے کا مفہوم یہی ہے؟ میں اس کی تصدیق کی جرأت نہیں کرسکتا۔ ہر قاری کو خود اس کا تعین کرنے دیا جائے۔

(311) تاہم میں ''انسان کی فعل وعمل میں خودمختاری'' اور قضا وقدر'' (رب تعالیٰ کی مرضی اور حکم، تقدیر وقسمت) کے مسئلہ پر چند الفاظ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں ہر شخص یہ سوال کرنا چاہتا ہے کہ اگر اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر بات کا پہلے ہی سے فیصلہ اور تعین کیا ہوا ہے تو پھر مجھے سزا کس بات کی دی جائے گی؟ لیکن کوئی شخص یہ سوال کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا کہ اگر رب قادر وقدیر نے ہر بات کا پہلے ہی سے فیصلہ اور تعین کر دیا ہے تو مجھے نیکی کی جزا کیوں ملے گی؟'' دونوں صورتوں میں ہمارا عمل لازماً مشینی طرز کا ہوگا۔ پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس بحث کو سختی سے منع فرمایا ہے اور اس کی معقول وجوہات ہیں۔ دراصل یہ ایک ناحل ہونے والا مسئلہ ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ انسان اپنے فعل وعمل میں خود مختار ہے تو اس سے یہ کافرانہ عقیدہ پیدا ہوتا ہے کہ رب تعالیٰ جل شانہٗ کی قدرت کامل نہیں حالانکہ رب قادر وقدیر کی مرضی ومنشاء کے بغیر کسی درخت کا پتہ تک حرکت نہیں کرسکتا۔ کیا ہم رب کائنات کی مرضی ومنشاء کے بغیر کوئی کام کیسے کر سکتے ہیں؟ اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ قادر مطلق ہیں اور ہم ہر کام اللہ تبارک وتعالیٰ کے پہلے سے تعین کردہ پروگرام کے مطابق کرتے ہیں تو پھر انسانی منطق پہلو بدل کر سوال کرتی ہے کہ ''تو پھر مجھے کسی فعل وعمل کا ذمہ دار کیوں ٹھہرایا جاتا ہے؟'' یا تو رب تعالیٰ جل شانہٗ قادر مطلق ہیں یا پھر انسان اپنے کسی فعل وعمل کا ذمہ دار نہیں۔ یہ دونوں

باتیں یقینی طور پر ایک ساتھ نہیں ہوسکتیں اور یہی پیچیدہ مسئلہ ہے!

(312) اسی ممکنہ ذہنی انتشار سے بچاؤ کے لیے سرورِ کونین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے قضا وقدر یعنی تقدیر وقسمت کے مسئلہ پر بحث کو سختی سے منع فرمایا ہے۔ آیئے ہم ایک بنیادی نکتے پر غور کرتے ہیں۔ رب تعالیٰ جل شانہٗ کا قادرِ مطلق ہونا ایک آسمانی معاملہ ہے جب کہ انسان کا اپنے فعل وعمل کا ذمہ دار ہونا دنیاوی اور زمینی معاملہ ہے۔ دونوں ایک ہی سطح پر نہیں ہیں۔ اس لیے ان میں ٹکراؤ کا کوئی بھی امکان نہیں ہوسکتا بالکل اسی طرح جس طرح زمین کا سورج کے ساتھ ٹکراؤ کا امکان نہیں ہے حالانکہ دونوں ہی خلا میں گردش کر رہے ہیں مگر ان کا دائرہ عمل جدا اور الگ ہے۔ کسی بھی شخص کو اس عقیدہ پر ذرا سا بھی شک وشبہ نہیں ہونا چاہیے کہ رب تعالیٰ جل شانہٗ ہمارے خالق اور قادرِ مطلق ہیں۔ رب تعالیٰ جل شانہٗ ہمارے افعال و اعمال کا پہلے سے تعین کرنے پر قادر ہیں۔ اس کے باوجود ہم اپنے افعال واعمال کے خود ذمہ دار ہیں کیونکہ ہم نے روزِ ازل یہ ذمہ داری رضا کارانہ طور پر خود قبول کی تھی۔ اس روز اللہ تبارک و تعالیٰ نے پیش کش کی تھی مگر انسان کے علاوہ کسی نے اس پیش کش کو قبول نہ کیا۔

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ
أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ
ظَلُومًا جَهُولًا ﴿٧٢﴾

(الاحزاب : 72)

"پیش ہم نے (اک) امانت کو (جو تھی صبر آزما)
آسمانوں اور زمیں پر اور پہاڑوں پر کیا
ڈر گئے سب اس سے، اور انکار اُٹھانے سے کیا
اور انساں نے اٹھایا اس کو (بے چون و چرا)
شک نہیں اس میں کہ وہ ظالم بھی تھا، ناداں بھی تھا۔"

وہ کون سی امانت تھی جسے انسان نے اُٹھانا قبول کرلیا۔ وہ یہی رضا مندی تھی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی پسند، رضا اور مرضی ومنشاء سے ہماری تقدیر لکھ سکتے ہیں۔ لہٰذا اب ہمیں رب تعالیٰ جل شانہٗ کی رضا کو خوشی کے ساتھ قبول کرنا چاہیے۔ شکایت تو سرے سے ہو ہی نہیں سکتی۔ کیا کوئی وفادار غلام یہ سوچ بھی سکتا ہے کہ آقا نے دوسرے غلام کو کیا دیا ہے؟ کیوں دیا ہے؟

مجھے کیوں نہیں دیا؟ اگر کوئی آرٹسٹ (مصور) کوئی تصویر بناتا ہے اور پھر اس میں جزوی ترمیم کر دیتا ہے یا اس کو بالکل مٹا دیتا ہے اور کوئی نئی تصویر یا ڈیزائن بنالیتا ہے تو اس صورت حال میں کیا وہ تصویریں یا ڈیزائن شکایت کا کوئی معمولی سا بھی حق رکھتے ہیں؟ کیا ہم رب قادر وقدیر کے سامنے کسی آرٹسٹ (مصور) کی تصویر یا ڈیزائن سے زیادہ قدر و قیمت رکھتے ہیں؟ (کیونکہ اللہ تبارک تعالیٰ کی پاک ذات "المصور" ہے)۔

[هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ

(الحشر : 24)

"وہ خدا جو خالق وموجد ومصور ہے (ہر اک چیز کا)"

هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ

(ال عمران : 6)

"جیسی چاہے رحم میں صورت تمہاری کھینچ دے"۔]

(رِحم یعنی رحم مادر)

(313) حضرت جبرئیل علیہ السلام کی آمد کے حوالے سے حدیث کا دوسرا حصہ عبادت کے بارے میں ہے (اسی کتاب کا پیراگراف 304) ہم نے سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سوانح حیات کے سلسلہ میں کافی گفتگو کی ہے۔ اب اس گفتگو کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔ تاہم آیئے ایک عام غلط فہمی دور کرنے کا موقع ضائع نہ کریں۔ "احسان" کہ جس کا ذکر کرتے ہوئے معلم کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا ہے کہ یہ اسلام کی عظیم الشان عمارت کی زیب وزینت ہے۔ "یہ "احسان" عقیدہ کے سلسلہ میں ہو یا عبادت کے حوالے سے ہو، بہرحال یہ وہی چیز ہے جسے بعض اوقات تصوف سلوک اور طریقہ بھی کہتے ہیں۔ [تصوف یعنی اخلاق الٰہی اختیار کرنا اور وہ علم جس کے ذریعے صفائی قلب حاصل ہو۔ "سلوک" یعنی حق کی تلاش "طریقہ" یعنی باطن کی پاکیزگی یا نفس کی صفائی] سائنس ایک علم ہے۔ اگر کسی فرد کو پورا اور مکمل علم نہ ہو مگر وہ یہ غلط دعویٰ کرے کہ وہ جانتا ہے یا کسی کو علم (سائنس) پر مکمل عبور حاصل ہو مگر وہ اس کا غلط استعمال کرے تو ان صورتوں میں سائنس یعنی علم کو کیسے الزام دیا جا سکتا ہے؟ رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کا خلاصہ یوں بیان فرماتے ہیں کہ "رب تعالیٰ جل شانہٗ کے حاضر ناظر ہونے کا تصور مضبوط کیجیے۔ رب تعالیٰ جل شانہٗ ہر جگہ

موجود ہیں۔ اگر کوئی محسوس کر لے تو یہ ممکن ہی نہیں کہ رب تعالیٰ جل شانہٗ کے امین یعنی پیغمبر کو جھٹلانے کی جرأت و جسارت کر سکے۔" رب تعالیٰ جل شانہٗ کے حاضر و ناظر ہونے کا تصور مضبوط کرنے کے بعض اصول اور طریقے ہیں۔ رب تعالیٰ جل شانہٗ کی یاد میں محو ہونے کے علاوہ ایک بنیادی ضرورت سچ بولنا اور حلال کھانا بھی ہے جسے صوفیاء کی زبان میں "صدق المقال واکل الحلال" کہتے ہیں۔ جہاں تک طریقوں کا تعلق ہے وہ ہر فرد کے لیے مختلف اور جدا ہیں۔ "احسان" پر خانقاہ کی اجارہ داری نہیں ہے۔ "احسان" کسی رحمدل اور خداترس بادشاہ کے تخت پر بھی پایا جا سکتا ہے۔ کیا کسی خانقاہ میں رہنے والا کوئی صوفی حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے زیادہ پرہیزگار ہو سکتا ہے جو اندلس سے چین تک وسیع اسلامی سلطنت کے بادشاہ تھے؟ خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا تو ذکر ہی کیا جنہوں نے ہادیٔ اعظم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نگرانی میں تربیت حاصل کی تھی۔ ایک دلچسپ مگر بامقصد کہانی ہے:

> کسی خانقاہ میں ایک دن ایک درویش نے اپنے شیخ سے پوچھا "یا حضرت! کیا آپ سے بھی بہتر کوئی شخص ہے؟ میں اس کی زیارت کرنا چاہتا ہوں۔" شیخ نے جواب دیا "جی ہاں! ایک شخص ایسا ہے۔" اور پھر درویش کو شیخ نے ایک تعارفی خط دے کر اس شخص سے ملاقات کے لیے بھیجا۔ جب درویش خط پر لکھے ہوئے پتہ پر پہنچا تو اس کی حیرانی کی کوئی حد نہ رہی۔ جس کے نام خط لکھا گیا تھا وہ تو ایک بادشاہ تھا۔ درویش نے بادشاہ کو اپنے شیخ کا خط دیا۔ بادشاہ کو درویش کی الجھن سمجھ آ گئی۔ اس نے حکم دیا کہ دودھ کا ایک کٹورا لایا جائے جو انتہائی لبالب بھرا ہوا ہو۔ اس نے یہ کٹورا درویش کو تھمایا اور کہا "اس کٹورے کو ہاتھ میں لے کر پورے شہر کا چکر لگاؤ مگر احتیاط کرنا کہیں دودھ کی ایک بوند بھی گرنے نہ پائے۔" بادشاہ نے ایک سپاہی بھی درویش کے ہمراہ کر دیا اور اسے حکم دیا اگر دودھ کے کٹورے میں سے ایک قطرہ بھی زمین پر گرے تو فوراً اسی لمحے اس درویش کی گردن اُڑا دینا۔" تھوڑی دیر بعد درویش دوبارہ بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا تو بادشاہ نے پوچھا "درویش جی! کیا آپ نے ہمارے خوبصورت دارالحکومت کی سیر کر لی ہے اور ان دنوں جو تقریبات اور میلے وغیرہ منعقد ہو رہے ہیں ان سے لطف اُٹھا لیا ہے"؟

درویش نے جواب دیا" بادشاہ سلامت! میں تو کچھ بھی نہیں دیکھ سکا۔ وہ اس لیے کہ میری ساری توجہ دودھ کے کٹورے پر لگی ہوئی تھی۔" بادشاہ نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا "میرے لیے بادشاہت ایسے ہی ہے جیسے دودھ کا یہ کٹورا ہے۔ میں رب ذوالجلال کے خوف سے اس بادشاہت سے ایک لمحہ کے لیے بھی لطف نہیں اُٹھا سکتا۔"

قوانینِ اسلام:

(314) اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ ایمان، عبادت اور تصوف (احسان) اسلامی تعلیمات کے بنیادی نکات ہیں لیکن یہ دنیاوی زندگی کا تفصیلی احاطہ نہیں کرتے۔ چنانچہ دنیاوی زندگی کے مختلف شعبے اور پہلو اسلامی قوانین کے دائرے میں آتے ہیں جسے ہم "فقہ" کہتے ہیں۔ فقہ سے نہ صرف عبادت کی تفصیل معلوم ہوتی ہے بلکہ اس سے باہمی لین دین، جرم وسزا، آئین و دستور، بین الاقوامی اصول وضوابط، انفرادی مقام اور وراثت جیسی باتوں کے بارے میں علم ہوتا ہے۔ اسلامی قانون کا فلسفہ قابل غور وفکر ہے۔ اس فلسفہ میں ترقی کے امکانات پوشیدہ ہیں۔ قرآن الحکیم نے قانون کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک "معروف" (نیکی) جب کہ دوسرا "منکر" (بُرائی) ہے۔ نیکی ہر مسلمان پر واجب اور فرض ہے۔ جب کہ بُرائی سے مکمل طور پر اجتناب کا حکم دیا گیا ہے اور اسے قرآن الحکیم کی زبان میں حرام ٹھہرایا گیا ہے۔ جن معاملات میں نیکی اور بُرائی کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا مشکل ہو، ان میں اگر نیکی غالب ہو تو اس پر عمل کرنا لائق تحسین ہے تاہم اسے واجب قرار نہیں دیا گیا اور اگر بُرائی غالب ہو تو اس سے اجتناب اور پرہیز کی تلقین کی گئی ہے اور اسے مکروہ (ایسی چیز جس سے نفرت کی جائے، ناگوار) قرار دیا گیا ہے مگر حرام نہیں کیا گیا۔ اس کے علاوہ جو معاملات فرد کی منشاء ومرضی پر چھوڑ دیئے گئے ہیں انہیں مباح قرار دیا گیا ہے (یعنی فرد کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو ان پر عمل کرے اور نہ چاہے تو عمل نہ کرے) قطب نما کی طرح اس میں بھی درمیانی درجے مقرر ہیں جس طرح قطب نما میں چار سمتوں یعنی مشرق، مغرب، شمال اور جنوب کے علاوہ شمال مشرق اور شمال مغرب وغیرہ بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر مکروہ کے دو درجے ہیں ایک مکروہ تنزیہی جب کہ دوسرا مکروہ تحریمی ہے۔ ان کی تفصیل ہمیں ہمارے موضوع سے دور لے جائے گی۔

(315) یہ امر قابل غور ہے کہ قرآن اور حدیث میں فرائض یعنی جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے "اوامر" اور جن کے نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے "نہی" ان کی تعداد بہت محدود ہے۔

تاہم مستحب (پسندیدہ کام جن کے کرنے سے ثواب ملتا ہو) اور مکروہ (ناپسندیدہ اور ناگوار) کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے تاہم یہ بھی لاتعداد نہیں۔ تمام معاملات میں ضمیر سے رہنمائی لینی چاہیے جو کہ بہترین رہبر و رہنما ہے۔ (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ "چاہے ماہر قانون آپ کو کسی کام کے کرنے کا اختیار بھی دے دے مگر اپنے ضمیر سے مشورہ ضرور کیجیے۔") ایک معروف و مشہور حدیث پاک میں ہم اسلامی قانون کے فروغ کا مرکزی خلاصہ مطالعہ کرتے ہیں۔ ایک دن جب نامزد گورنر حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے روانگی سے پہلے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے رخصت لینے کے لیے آئے تو اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مابین یہ گفتگو ہوئی:

"معاذ! جب تمہارے سامنے کوئی مسئلہ پیش ہوگا تو تم اس کا فیصلہ کیسے کرو گے؟"

"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں رب رحمٰن و رحیم کی کتاب (القرآن الحکیم) کے مطابق فیصلہ کروں گا۔"

"اور اگر تمہیں اس میں کوئی قطعی فیصلہ نہ ملے تو پھر؟"

"تو پھر میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے مطابق فیصلہ کروں گا۔"

"اور اگر تمہیں اس میں بھی کوئی قطعی فیصلہ نہ ملے تو پھر؟"

"پھر میں اپنی رائے استعمال کرتے ہوئے فیصلہ دینے کی کوشش کروں گا۔"

اس پر سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"سب تعریفیں اللہ تبارک و تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے اپنے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے قاصد کو اس امر کی طرف رہنمائی فرمائی کہ جو اللہ تبارک و تعالیٰ کے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو پسند ہے۔" ظاہر ہے اس طرح اسلامی قوانین میں بنیادی استحکام کے ساتھ ساتھ تقاضے اور ضرورت کے مطابق ڈھلنے کا بھی امکان پیدا ہوگا۔

(316) کسی ایک فرد کی رائے کو کسی دوسرے فرد کی بہتر رائے سے بدلا جا سکتا ہے۔ (بہت سے افراد کی) متفقہ رائے قدرتی طور پر زیادہ وزنی ہوتی ہے۔ تاہم خطاکار انسانوں کی متفقہ رائے کو بھی خطا سے پاک اور مستقل اہمیت کی حامل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ چنانچہ فقہ کے ماہرین یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ایک اجماع (متفقہ رائے) کو دوسرے اجماع کے ذریعے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اس میں یہ بنیادی اصول لاگو ہوتا ہے کہ جو اتھارٹی کوئی قانون نافذ کرتی ہے وہ یا اس سے

بڑی اتھارٹی اسے منسوخ بھی کر سکتی ہے۔اسی طرح قرآن پاک کے الفاظ رب تعالیٰ جل شانہٗ کی دوسری وحی کے ذریعے ہی تبدیل کیے جا سکتے ہیں۔کوئی بھی شخص قرآن الحکیم کے الفاظ میں ترمیم یا تنسیخ کا ہرگز ہرگز اختیار نہیں رکھتا۔اسی طرح حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں صرف آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام سے تبدیلی ممکن ہے۔علماء کرام کی رائے سے قرآن الحکیم یا حدیث پاک میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔البتہ ایک عالم کی رائے (فتویٰ) کو دوسرے عالم کی رائے سے بدلا جا سکتا ہے کیونکہ تمام مسلمان مساوی درجہ رکھتے ہیں تاہم اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عوام کی نظروں میں علماء کے بھی درجے ہوتے ہیں کیونکہ تمام افراد کو رب رحمٰن ورحیم نے یکساں اور مساوی صلاحیتوں سے نہیں نوازا۔

(317) عام مسلمانوں کے زیادہ مفاد کی خاطر ایک جیسے ملتے جلتے حالات و معاملات اور واقعات سے نتائج اخذ کرنا وغیرہ ایسے طریقے ہیں کہ جن کی مدد سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد نہ صرف اسلامی قانون کو فروغ ملا ہے بلکہ اس کی یہ لچک بھی برقرار رہی ہے کہ: قانون انسان کے لیے ہے، انسان قانون کے لیے نہیں۔

(318) ہمارے اور پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں 1400 سال سے زائد کا فاصلہ ہے موجودہ دور میں انسانی زندگی بالکل بدل چکی ہے۔کیا 1400 سال سے زائد پرانے اصول وضوابط اب بھی انسانوں کی رہبری ورہنمائی کر سکتے ہیں؟ اس حوالے سے امریکہ کے ایک مشنری ایچ۔جی۔ڈورمن کی کتاب ''اسلام فہمی کی جانب'' کو ایک غیر جانبدارانہ رائے کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔وہ لکھتا ہے کہ اسلامی ضابطہ اخلاق میں طلاق اور بیویوں کی تعداد کے علاوہ کوئی بات ایسی نہیں جس پر گرفت کی جا سکے۔تنقید نگاروں کی خاطر اس میں جہاد اور چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا کو بھی شامل کر لیتا ہوں۔چونکہ ایک غیر مسلم کو بھی اسلامی ضابطہ اخلاق میں کوئی دوسری بات گرفت کے قابل نظر نہیں آتی۔آیئے ہم ان اسلامی اصولوں پر غور کرتے ہیں۔

اگر دوسری شادی کی ممانعت کر دی جائے اور طلاق ختم کر دی جائے تو بعض اوقات گھر جہنم بن جاتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے انجیل میں طلاق کو قطعی طور پر ممنوع قرار دینے کی باوجود دنیا میں پارلیمانی قوانین کے ذریعے طلاق کی اجازت دے دی گئی ہے۔اسلام نے اس سماجی اور معاشرتی ضرورت کو پہلے دن ہی سے محسوس کر لیا تھا۔مگر عیسائیت نے اسے سمجھنے میں پورے دو ہزار سال لگا دیئے۔یہ بات

قابل ذکر ہے کہ ایک حدیث پاک کے مطابق اسلام میں "طلاق اللہ تبارک وتعالیٰ کی نظر میں مباح چیزوں میں سے سب سے زیادہ نفرت کے قابل ہے۔" تاہم طلاق کی اجازت کے باوجود مسلمانوں میں طلاق کے واقعات بہت کم ہیں۔ شاید اس کی ایک وجہ مہر بھی ہے جو شادی کے وقت مقرر کیا جاتا ہے اور اس کے بغیر شادی نہیں ہوسکتی۔ مہر کی مالک بیوی ہی ہوتی ہے چنانچہ طلاق کی صورت میں شوہر اپنی سابقہ بیوی کا مہر ادا کرنے کا پابند ہوتا ہے۔

(319) اب بیویوں کی تعداد کو لیجیے۔ دنیا کے کسی مذہب میں بھی بیویوں کی تعداد پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی حتیٰ کہ عیسائیت میں بھی ایسا نہیں ہے۔ انجیل مقدس کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام کی ایک ہزار بیویاں (700 بیویاں اور 300 کنیزیں) تھیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی 100 بیویاں تھیں۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور انسانی تاریخ کے دوسرے سرکردہ افراد کی ایک سے زائد بیویاں تھیں۔ اسلام ہی دراصل پہلا دین ہے جس نے:

(1) بیویوں کی تعداد کی حد مقرر کی ہے (چار بیویاں اور وہ بھی مشروط)۔

(2) خلع کا حق بیوی کو دیا گیا ہے (یعنی عورت مہر کے عوض طلاق لے سکتی ہے) اسلام کے مطابق زندگی میں کیے جانے والے دوسرے معاہدوں کی طرح شادی بھی ایک معاہدہ ہے اور یہ معاہدہ فریقین کی رضامندی سے جاری رہ سکتا ہے۔ اس معاہدہ میں محض حق مہر ہی نہیں بلکہ شادی کے بعد کے دوسرے عوامل بھی شامل ہیں۔ چنانچہ ایک وقت میں ایک بیوی کی شرط کو شادی کے معاہدے میں شامل کرنا قانون کے عین مطابق ہے۔ کوئی عورت شادی کے وقت یہ مطالبہ کرنے کا حق رکھتی ہے کہ اس کا شوہر اس سے شادی کرنے کے بعد کسی دوسری عورت سے شادی نہیں کرے گا۔ اگر شوہر کو یہ شرط قبول ہے تو پھر اسے اس شرط کو پورا کرنا ہوگا لیکن اگر ہونے والا شوہر شادی کے وقت یہ شرط قبول نہ کرے مگر ہونے والی بیوی اس پر اصرار کرتی رہے تو پھر ان کی شادی جائز نہیں۔ اس حوالے سے خاندان عباسیہ کے خلیفہ المنصور کا قصہ تاریخ میں از حد مشہور و معروف ہے خلیفہ المنصور نے اپنی بیوی کے ساتھ شادی کے وقت دوسری شادی نہ کرنے کی شرط کو منظور کر لیا تھا۔ چنانچہ اس دور کا کوئی مفتی اس شرط کو غیر قانونی یا غیر اسلامی قرار دینے کا فتویٰ نہ دے سکا۔

(320) دین اسلام میں جہاد کے نظریہ کو دشمنانِ اسلام نے غلط رنگ میں پیش کیا ہے اور اس کی غلط وضاحت کی ہے۔ قرآن الحکیم میں ہے:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ

(البقرہ : 256)

"دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔"

طاقت کے بل بوتے پر کسی کو بھی اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی کسی ملک کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنے کے لیے اس کے خلاف جنگ کا اعلان ہوسکتا ہے۔ اس ضمن میں قرآن الحکیم کے احکامات واضح ہیں۔

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ وَاقْتُلُوْھُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْھُمْ وَاَخْرِجُوْھُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْھُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْھُمْ ۭ كَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝

(البقرہ : 191, 190)

"جو لڑیں تم سے، خدا کی راہ میں ان سے لڑو
زیادتی لیکن نہ کچھ (اپنی طرف سے) تم کرو
کرتے ہیں جو زیادتی، ہیں ناپسند اللہ کو
قتل کر دو تم، جہاں پاؤ انہیں (کر کے جدال)
تم کو جس جا سے نکالا، تم بھی ان کو دو نکال
اور خونریزی سے بدتر ہے فساد (بد مآل)
ہاں لڑو (کفار سے) ہرگز نہ تم کعبے کے پاس
وہ نہ جب تک خود یہاں تم سے لڑیں (کھو کر حواس)
پھر اگر وہ خود لڑیں، تو ان کو مارو (برملا)
کافروں کی ہے یہی (تو اے مسلمانو!) سزا

مطلب یہ کہ جہاد کے لیے دو پیشگی شرطیں لگائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ جہاد صرف اور صرف اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی راہ میں کیا جانا چاہیے۔ دوسری یہ کہ جہاد ان کے خلاف

ہونا چاہیے جو (مسلمانوں پر) حملہ آور ہوں۔ اس طرح مسلمانوں کے لیے دوسروں کے خلاف جنگ محض ایک دفاعی کارروائی ہے۔ پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے اپنی زندگی میں ان شرائط کے علاوہ کوئی دوسری جنگ نہیں کی۔ ہم جانتے ہیں کہ رسول مکرم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو جنگیں لڑیں وہ خونریزی سے پاک اور انسانی ہمدردی پر مشتمل تھیں ۔ 30 لاکھ مربع کلومیٹر علاقہ کی فتح کے دوران دشمنوں کے 300 افراد بھی ہلاک نہیں ہوئے۔ خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے بھی تین براعظموں کو اسلامی سلطنت میں شامل کیا اور وہ بھی رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ کو مثال بنا کر آگے بڑھتے رہے۔

(321) جہاں تک جرم کی سزا کے حوالے سے اسلامی قوانین کا تعلق ہے میں شراب کی خرابیوں کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا لیکن جیسے ہی کوڑوں کی سزا شروع ہوئی اس برائی کا اختتام ہو گیا تھا۔ قتل بالا رادہ کے لیے موت کی سزا ہے مگر اس پر عمل کرنا فرض نہیں کیونکہ مجرم کو یہ رعایت دی گئی ہے کہ اگر مقتول کے وارث راضی ہو جائیں تو وہ دیت (معاوضہ) ادا کر کے پھانسی کی سزا سے بچ سکتا ہے۔ زانی کی سزا سنگساری ہے مگر اس سزا پر بھی اس وقت عمل ہو سکتا ہے جب چار چشم دید گواہ گواہی دیں کہ انہوں نے مجرم کو جرم کرتے دیکھا تھا۔ اگر چشم دید گواہ موجود نہ ہوں تو عدالت ملزم کو سزا قطعی طور پر نہیں دے سکتی۔ (انجیل کے عہد نامہ قدیم میں بھی اسی طرح کی سزا کا تعین کیا گیا ہے) چوری کے لیے ہاتھ کاٹنے کی سزا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد جب ترکوں نے حجاز خالی کر دیا تو شریف حسین کی بادشاہت میں کوئی حاجی یہ یقین اور اعتماد کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ زندہ واپس اپنے گھر جا سکے گا۔ بعض عربوں نے جنہوں نے ترکوں اور پھر شریف حسین کا زمانہ دیکھا ہے مجھے یہ بتایا کہ شریف حسین تو ڈاکوؤں سے بھی لوٹ مار کے مال سے اپنا حصہ وصول کرتا تھا۔ جب ابن سعود نے شریف حسین کی بدعنوان حکومت کا خاتمہ کیا تو اس نے اسلام کے وہ قوانین نافذ کر دیئے جن کے ذریعے مختلف جرائم پر سزا دی جاتی ہے۔ میں نے 1932ء میں مکہ مکرمہ کے اخبارات اور رسائل میں پڑھا کہ جب چند افراد کو ہاتھ کاٹنے کی سزا دی گئی تو پوری مملکت میں کئی ماہ تک چوری کا کوئی واقعہ نہیں ہوا ۔ میں نے بذات خود 1939ء میں ایک عجیب وغریب واقعہ دیکھا۔ میں اونٹوں کے ایک قافلہ کے ہمراہ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ جا رہا تھا۔ جب ہم ایک جگہ ٹھہرے تو قافلے کی ایک خاتون نے شکایت کی کہ اس کا سوٹ کیس گم ہو گیا ہے۔ پولیس نے مقدمہ درج کر کے وعدہ کیا کہ اس

واقعہ کی مکمل تفتیش کی جائے گی۔ تین ہفتوں کے بعد جب ہم مدینہ منورہ سے واپس مکہ مکرمہ جاتے ہوئے اسی جگہ سے گزرے تو پولیس افسر نے پوچھا: ''سوٹ کیس میں موجود چیزوں کی مالیت کیا تھی؟ کیونکہ ہم چور نہیں پکڑ سکے۔ اب ہم آپ کو اس کی قیمت دینا چاہتے ہیں اور یہ رقم حکومت نے آپ کا نقصان پورا کرنے کے لیے فراہم کی ہے۔'' اس بات پر اختلاف رائے ہو سکتا ہے کہ آیا کوئی سخت قانون کہ جس کے نفاذ کی ضرورت بہت کم پیش آئے اس نرم قانون سے بہتر ہے یا نہیں کہ جو بُرائی کے خاتمہ میں ناکام رہے؟ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام میں سزا کے دو مواقع ہیں۔ اگر کوئی مجرم شہادت نہ ہونے کی بناء پر اس دنیا کی حکومت سے سزا حاصل نہیں کر پاتا تو وہ روز قیامت اپنے جرم کی سزا ضرور پائے گا اور عام حالات میں روز قیامت سزا کا تصور انتہائی اثر انگیز ثابت ہوتا ہے۔ حکومتوں کو چاہیے کہ وہ لوگوں کو روز قیامت کی سزا کا خوف دلائیں جو کہ پولیس اور سزا دینے والے قوانین سے ہر طرح سے اثر انگیز ڈراوا ہے۔

باب 12
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گھریلو زندگی

(322) ہم نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عوامی زندگی میں خدائے بزرگ و برتر کے ایک پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش و کاوش کی ہے کہ کس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دین کی بنیاد رکھی تا کہ رب کائنات جل شانہٗ کی طرف سے سونپے گئے فرض کی تکمیل کر سکیں اور رب تعالیٰ جل شانہٗ کی جانب سے نازل شدہ پیغام کو لوگوں تک پہنچا سکیں۔ ہم نے یہ بھی بتانے کی کوشش و کاوش کی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کس طرح ایک ریاست کی بنیاد رکھی جو کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی منزل یا مقصد ہونے کی بجائے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذمہ لگائے گئے مشن کی تکمیل اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قائم کردہ تنظیم کی بقاو سلامتی کا ایک ذریعہ تھی۔ اب ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گھریلو نجی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کس طرح عبادت کرتے تھے۔ کس طرح روزے رکھتے تھے۔ اہل خانہ اور اپنے بچوں کے ساتھ کس طرح پیش آتے تھے۔ مہمانوں، ملازموں اور غلاموں سے کیسا سلوک کرتے تھے اور یہ کہ اپنے گھر میں رہتے کیسے تھے!

اللہ تبارک و تعالیٰ سے تعلق:

(323) امت مسلمہ کے سربراہ ہونے کے حوالے سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ قطعی طور پر حق اور اختیار حاصل تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امامت کا فریضہ سرانجام دیں اور نماز باجماعت کرائیں۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوسروں کو پانچ وقت نماز پڑھنے کا حکم دیتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کئی سنتیں اور کئی نوافل اپنے اوپر واجب کر رکھے تھے جو کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے گھر ہی میں ادا فرماتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس عمل کی بھی ایک وجہ تھی۔ وہ یہ کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل مسلمانوں کے لیے قانون کی حیثیت رکھتا ہے اور پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ نہیں پسند کرتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی امت پر ضرورت سے زیادہ بوجھ ڈالیں۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم مسجد میں نفلیں ادا کرتے تو مسلمان یہ سمجھتے کہ یہ نوافل بھی گویا نماز کا لازمی حصہ ہیں۔ اس سے دین کا عمل مشکل ہو جاتا اور امت مسلمہ کی مادی زندگی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ پیدا ہوتا۔ مزید یہ کہ نفلوں کی ادائیگی کسی نمائش یا دکھاوے کے لیے نہیں تھی بلکہ یہ خالصتاً رب تعالیٰ جل شانہٗ اور اس کے بندے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق تھا جو دونوں کے مابین ہی رہا۔ قرآن الحکیم میں ہے:

[وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا۝

(بنی اسرائیل:79)

"اور ایک حصے میں شب کے تم تہجد بھی پڑھو
یہ تمہارے واسطے گویا نفل ہیں (رات کو)
کیا تعجب اگر برکت سے اس کی ایک بار
منزل محمود تک پہنچا دے تم کو کردگار"
(منزل محمود یعنی مرتبۂ شفاعت)]

تہجد کے نوافل پڑھنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر فرض ہیں جبکہ "یہ فرض دوسرے مسلمانوں کے لیے نہیں ہے۔" عشاء کی نماز کی ادائیگی کے بعد ہادیٔ کون ومکاں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کچھ وقت کے لیے آرام فرماتے اور پھر تہجد کی ادائیگی کے لیے بیدار ہو جاتے۔ بعض اوقات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نفل پڑھتے وقت اتنی زیادہ دیر قیام میں کھڑے رہتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ٹانگوں پر ورم آجاتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عام مملکتوں کے دوسرے سربراہوں کی طرح نہیں تھے کہ عیش وعشرت کی زندگی بسر کریں بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحیح معنوں میں نفس کو مارنے اور دنیاوی لذتوں کو ترک کرنے کا عملی نمونہ تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اہل خانہ کے تمام حقوق پورے فرماتے تھے مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی اور شخص سے بھی زیادہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے بندے تھے۔

(324) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے پیروکاروں کو حکم دیا کہ وہ رمضان کے مکمل مہینے میں روزے رکھیں۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود رمضان کے مہینے کے علاوہ دوسرے دنوں میں بھی اکثر روزے رکھتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر سوموار اور جمعرات کے ساتھ ساتھ ہر قمری مہینہ کی 13، 14 اور 15 تاریخ کو بھی روزے رکھتے تھے۔ غیر

مسلموں میں روزہ کا صحیح تصور نہیں ہے۔ عام آدمی کا تو ذکر ہی کیا عیسائی پادریوں اور راہبوں کو بھی پوپ نے یہی بتایا ہے کہ روزہ صرف اور صرف خیالی عمل ہے اور خوراک کی بندش سے اس کا کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ ابھی حال ہی میں ہمبرگ کے ایک پادری نے میرے دریافت کرنے پر مجھے بتایا کہ عیسائیت میں روزہ کا مفہوم یہ ہے کہ صبح قدرے ہلکا ناشتہ کیا جائے۔ دوپہر کو پیٹ بھر کر کھانا کھایا جائے اور رات کو قدرے کم کھانا کھایا جائے مگر مسلمان صبح صادق سے لے کر شام تک کھانے پینے، سگریٹ نوشی اور کئی دوسری باتوں سے مکمل اجتناب کو روزہ کہتے ہیں۔ وہ شدید گرمی اور شدید سردی میں یہی عمل قائم و دائم رکھتے ہیں۔ اعتراض کرنے والوں کا اعتراض یہ ہے کہ روزہ صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔ حالانکہ درخت تک سردیوں میں روزہ رکھتے ہیں۔ انہیں پانی نہیں دیا جاتا اور ان کے پتے جھڑ جاتے ہیں۔ جب موسم بہار آتا ہے تو وہی درخت پتوں، پھولوں اور پھلوں سے سرسبز ہو جاتے ہیں۔ جنگلی درندے اور پرندے بھی سخت سردی میں روزہ (سوئے رہتے ہیں) رکھتے ہیں۔ وہ کھاتے پیتے بالکل نہیں اور جب بہار آتی ہے تو وہ نئے دیدہ زیب پروں اور نئی جلد کے ساتھ اپنی زندگی کا نئی قوت کے ساتھ سفر شروع کر دیتے ہیں اور اپنی نسل میں اضافہ کرتے ہیں مگر جو روزہ نہیں رکھتے ان کی صحت عام طور پر بہتر نہیں ہوتی۔ نپولین بڑے رشک اور حسرت سے کہا کرتا تھا۔ "اگر میری فوج میں ترک (مسلمان) ہوتے تو لمحہ بھر میں پوری دنیا کا فاتح بن جاتا کیونکہ ترک کھانا پینا چھوڑنے کے باوجود پوری جنگی صلاحیت کے ساتھ لڑتے ہیں۔" محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کئی دوسرے دنوں میں بھی روزہ رکھتے تھے مگر ہمیشہ ایک ہی دن کو منتخب نہیں کر لیتے تھے۔

(325) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ماننے والوں کو ان کی بچت اور جمع شدہ زائد رقم پر زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیتے تھے مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود اس قدر فیاض اور سخی تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جو کچھ بھی ہوتا رب رحمن و رحیم کی راہ میں خرچ کر دیتے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دار بقا کی جانب کوچ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر میں کوئی درہم یا دینار نہیں تھا۔

ملازم اور غلام:

(326) اسلام نے (آغاز میں) انجیل کی طرح غلامی کو تسلیم کیا ہے لیکن انجیل میں غلاموں کی آزادی کے حوالے سے ایک لفظ بھی موجود نہیں جبکہ اسلام نے عملی طور پر غلامی کا خاتمہ کر دیا۔ اب ہم اس پر کچھ بات کریں گے۔ اس دور میں جب کہ دنیا بھر میں غلامی کا رواج تھا دشمن مسلمانوں کو

بھی غلام بنا کر فروخت کرتے تھے۔ چنانچہ غلامی کو یک طرفہ طور پر ختم کرنا ایک مشکل امر تھا۔ اس پر رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ دشمن کا وہ غلام جو مسلمانوں سے پناہ کا طلبگار ہو اور مسلمان اسے پناہ دے دیں تو وہ خود بخود آزاد سمجھا جائے گا۔ اسی طرح جس لونڈی کے بطن سے بچہ پیدا ہو تو جیسے ہی اس کے مالک کی وفات ہوگی وہ لونڈی خود بخود آزاد ہو جائے گی۔ اگر اس کا مالک اسے پہلے ہی آزاد کر چکا ہے تو بہتر ہے۔ قرآن الحکیم کا فرمان ہے کہ: فَكُّ رَقَبَةٍ ﴿۱۳﴾ (البلد : 13) یعنی غلاموں کو آزاد کرنا بہترین خیرات ہے۔ پھر مختلف گناہوں میں مثلاً اتفاقی قتل، مجبوراً قسم توڑنا اور طلاق جس میں شوہر نے اپنی اہلیہ کو اپنی والدہ کے برابر قرار دیا ہو۔ غلام کی آزادی کو کفارہ قرار دیا گیا ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا
خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ
مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۚ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ
لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ
بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ
رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۡ
تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۹۲﴾

(النساء : 92)

"ہے مسلماں کے لیے قتلِ مسلماں ناروا
اور جو بھولے چوکے بھی ہو جائے سرزد یہ خطا
(اور ہے یہ بات) اگر سہواً ہو، ایسا ہو گیا)
تو بھی آزاد اک مسلماں بردے کو (قاتل) کرے
(بردے یعنی غلام)
خوں بہا بھی (ساتھ) گھر والوں کو دے مقتول کے
(خوں بہا کی) وہ معافی دیں (تو احساں مان لو)
اور اگر مقتول مومن کے، قوم سے دشمن کی ہو
تو (فقط قاتل) کرے آزاد اک مومن غلام
اور اگر مقتول ہو اس قوم کا اک فرد (عام)

عہد و پیماں ہو تمہارا جن سے امن و صلح کا
تو کرے مسلم غلام آزاد ، اور دے خوں بہا
اور جو (آزادیٔ بردہ کا) نہ ہو مقدور اسے
تو مسلسل دو مہینے تک وہ روزے (ہی) رکھے
یہ طریق توبہ ، ہے خالق کا ٹھہرایا ہوا
واقفِ (حالات) ہے اور صاحب حکمت خدا

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ
بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ
فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ
اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ
ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ۭ وَاحْفَظُوْٓا
اَيْمَانَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

(المائدہ : 89)

(ہاں) تمہیں لایعنی قسموں پر نہ پکڑے گا خدا
لیکن ان قسموں پہ جن کو (دل سے) مستحکم کیا
یہ کفارہ ہے کہ اوسط درجے کا کھانا کھلاؤ
دس فقیروں کو ، وہی گھر والوں کو جیسا کھلاؤ
یا انہیں کپڑا دو ، یا آزاد کر دو اک غلام
ہو نہ یہ وسعت ، تو رکھو تین روزے (لاکلام)
جب قسم کھا لو ، تو قسموں کا کفارہ ہے یہی
اپنی قسموں کی رکھو تم احتیاط (واقعی)
اس طرح اللہ اپنے حکم کرتا ہے بیاں
تا کہ شکر اس کا کرو تم (ہے وہ کیسا مہرباں)

وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ
مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ
قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ
خَبِيْرٌ

(المجادلہ : 3)

اور اپنی عورتوں کو لوگ ، کہہ بیٹھیں جو ماں
اور پھرنا چاہیں اپنے قول سے (وہ بدزباں
تو پھر اک بردہ انہیں آزاد کرنا چاہیے
اس سے پہلے کہ کوئی اک دوسرے کو مس کرے
یہ نصیحت تم کو کی جاتی ہے (سن لو مومنو
ہے خدا کو سب خبر اس کی ، جو کچھ تم کرتے ہو
(بردہ یعنی غلام)

مزید یہ کہ اسلامی مملکت کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے سالانہ بجٹ میں ایک معقول رقم غلاموں کو خرید کر آزاد کرنے کے لیے مخصوص کرے۔ اسلام غلاموں کو یہ سہولت بھی دیتا ہے کہ وہ خود اپنے مالک کو قیمت ادا کر کے آزادی حاصل کر لے۔ ایسی رقم کو جمع کرنے کے لیے وہ کسی جگہ ملازمت بھی کر سکتا ہے جب کہ اس کی اس ملازمت کے اوقات میں مالک کے لیے کام کرنا اس پر فرض نہیں ہے۔

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ
وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ
وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ
اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ

(التوبہ : 60)

مفلسوں کا اور محتاجوں کا ہے خیرات حق
اور جو ہیں خیرات کے کارندے وہ ہیں مستحق
جن کا دل پرچانا ہو (خیرات ہے ان کو روا)

اور غلاموں کو چھڑانے اور اہل قرض کا
ہیں مجاہد اور مسافر (مستحق خیرات کے)
یہ حقوق اللہ (برتر) کے ہیں ٹھہرائے ہوئے
اور خدا آگاہ ہے ہر حکمت وتدبیر سے

وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ۖ وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ ۭ
(النور : 33)

اور غلاموں لیں تمہارے جن کا ہو یہ مدعا
(مال دے کر) تم سے آزادی کی وہ تحریر لیں
تو انہیں تحریر دے دو (ہے یہی لازم تمہیں)
شرط یہ ہے ان میں تم نیکی (کا) پاؤ شائبہ
اور خدا کے مال میں سے، جو تمہیں اس نے دیا
ان کو بھی دیتے رہو (اس میں تمہارا ہے بھلا)

قرآن الحکیم کی رو سے جنگی قیدی جو کہ نئے غلاموں کا سب سے بڑا ذریعہ تھے فدیہ لے کر یا رحم دلی کے طور پر رہا کر دیے جانے چاہیں۔

فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ۭ حَتّٰٓي اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ڎ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاۗءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ڬ ذٰلِكَ ړ وَلَوْ يَشَاۗءُ اللّٰهُ لَانْتَـصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ۭ وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝
(محمد : 4)

جب (لڑائی میں) مقابل آؤ تم کفار کے
مارو ان کی گردنیں (بے عذر اور تکرار کے)
اور جب تم ان میں خونریزی بشدت کر چکو
(قید کر لو ان کو) کس کر ان کی مشکیں باندھ لو

کر کے پھر احسان یا تاوان لے کر چھوڑ دو
رکھ دیں حتیٰ کہ وہ ہتھیار، اور لڑائی ختم ہو
ہے یہی (حکم اور تعمیل اس کی ہونی چاہیے)
گر خدا چاہے تو بدلہ ان سے (خود) لے لے، و لے
تم میں سے اک دوسرے کو آزماتا ہے (خدا)
اور جو مارے گئے راہ خدا میں (با وفا)
رایگاں ان کے عمل ہونے نہ دے گا (کبریا)

ابن رشد نے "بدایۃ المجتہد" (I،351) میں تحریر کیا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں اس بات پر اتفاق تھا کہ جنگی قیدیوں کو غلام نہیں بنانا چاہیے۔ اگرچہ اس سے پہلے نازل ہونے والی ایک آیت میں جنگی قیدی عورتوں کو لونڈی بنانے کی اجازت دی گئی ہے۔

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ
الّٰتِیْۤ اٰتَیْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَ مَا مَلَكَتْ یَمِیْنُكَ مِمَّاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَیْكَ
(الاحزاب : 50)

ہم نے کیں تم پر حلال (اب وہ) تمہاری بیویاں
اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مہر جن کا دے چکے ہو (بے گماں)
وہ کنیزیں بھی (غنیمت میں) جو دیں اللہ نے

ان دونوں آیات میں مطابقت کے لیے یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ سورۃ "محمدؐ" کی آیت 4 میں جو ہدایت فرمائی گئی ہے وہ "متبادل" ہے خصوصی نہیں یا دوسری آیت کے حکم کو منسوخ نہیں کرتی کیونکہ رسول مکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود 5 ہجری میں بنوالمصطلق کے لوگوں کو غلام بنایا تھا (ابن ہشام صفحہ 729) اسی طرح 8 ہجری میں بنو ہوازن (ابن ہشام صفحہ 877) اور 9 ہجری کے آخر میں بنوالعنبر کے افراد کو غلام بنایا گیا تھا (ابن ہشام صفحہ 983) تاہم بعدازاں یہ تمام غلام آزاد کر دیے گئے۔

حضرت امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک حدیث نقل کی ہے جس کے مطابق "عرب غلام کے بغیر عرب نہیں ہوتا"۔ (مبسوط X 118, 40۔ شرح السیر الکبیر II 269, 265)

8 ہجری میں جنگ حنین کے موقع پر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واضح لفظوں میں حکم دیا

تھا کہ دشمن قبیلہ بنو ہوازن کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنا کر اسلامی فوج میں مال غنیمت کے طور پر تقسیم کیا جائے۔ تاہم جب شکست خوردہ بنو ہوازن والوں نے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی غلطی پر ندامت ظاہر کی اور اسلام قبول کر لیا تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سفارش پر تمام غلاموں کو آزاد کر دیا گیا۔ اس سے نومسلم ہوازن کا ایمان مضبوط و مستحکم ہوا۔

کوئی بھی غلام اپنی مرضی ومنشا کے ساتھ اسلام قبول کر سکتا ہے جب کہ کسی آزاد مسلمان کو غلام نہیں بنایا جا سکتا چاہے اسے بغاوت کے جرم میں گرفتار ہی کیوں نہ کر لیا جائے (اسلام کا یہ قانون انجیل کے قانون کے عین اُلٹ ہے۔ انجیل کے مطابق ایک یہودی دوسرے یہودی کو غلام بنا سکتا ہے)۔

(327) غلام بنانے کا فائدہ یہ تھا کہ بے سہارا جنگی قیدیوں کو رہائش اور اچھا ماحول مل جاتا۔ وہ دوسری قوم کی ثقافت سے آگاہ ہوتے اور یوں معاشرے کے مفید شہری بن سکتے تھے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسلام میں آزاد شدہ غلام اور پیدائشی آزاد شہری میں کوئی تفریق وامتیاز نہیں۔ تاریخ اسلام میں آزاد شدہ غلاموں نے حکمرانی کی ہے بلکہ شاہی خاندانوں کی بنیاد تک رکھی ہے۔ مصر میں "مملوک" اور ہندوستان میں "خاندانِ غلاماں" اور دوسرے اس کی مثالیں ہیں۔

(328) یہ حیرت وحیرانی کی بات نہیں کہ اسلامی قانون کے مطابق سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جب بھی کوئی غلام تحفتاً یا مال غنیمت کے طور پر پہنچتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے آزاد فرما دیتے۔ ہمیں علم ہے کہ اگر کسی لونڈی کے ہاں اس کے مالک کا بچہ پیدا ہو جائے تو وہ مالک (بچے کے والد) کی وفات پر از خود آزاد ہو جاتی ہے۔ مزید یہ کہ مالک کو صاحب اولاد لونڈی فروخت کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے جب کہ لونڈی کو مالک کے گھر میں منکوحہ بیوی کی طرح حقوق حاصل ہوں گے تاہم وہ مالک کی وراثت میں حصہ دار نہیں ہوگی۔ ان احکام کو عملی طور پر مضبوط و مستحکم کرنے کے لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مصری سردار مقوقس کی طرف سے تحفتاً آنے والی لونڈی حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو گھر ہی میں رکھا اور بعد ازاں وہ پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیٹے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی والدہ بنی مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہ بیٹے دو سال کی عمر میں ہی اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے۔ حضرت امام الزہری رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق محمد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ صرف حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی آزادی کا حکم دیا بلکہ یہاں تک فرمایا کہ "اگر میرے بیٹے ابراہیم رضی اللہ عنہ زندہ رہتے تو میں تمام قبطی عیسائیوں کا جزیہ معاف کر دیتا۔"

ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنھن:

(329) قرآن الحکیم نے نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنھن کو مومنین کی مائیں قرار دیا ہے۔

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِہِمْ وَاَزْوَاجُہٗٓ اُمَّھٰتُہُمْ

(الاحزاب : 6)

ہیں مسلمانوں کی جانوں سے بھی اولیٰ تر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویاں ہیں ان کی مائیں واقعی

وَاللّٰہُ لَا یَسْتَحْیٖ مِنَ الْحَقِّ ۭ وَاِذَا سَاَلْتُمُوْھُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔــلُوْھُنَّ مِنْ وَّرَاۗءِ حِجَابٍ ۭ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ ۭ وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا ۭ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا

(الاحزاب : 53)

کہنے سے حق بات کے اللہ شرماتا نہیں
جب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویوں سے مانگو کچھ تو (بالیقیں)
پردے کے باہر (کھڑے رہ کر ہی) ان سے مانگ لو
صاف ان کے اور تمہارے دل رہیں گے یوں (سنو)
دو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایذا، تمہیں شایاں نہیں
اور نہ بعد ان کے (مناسب ہے تمہیں اے مومنیں)
بیویوں سے تم کبھی ان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رکھو شادی روا
ہے بڑی (بے جا) یہ بات البتہ نزدیکِ خدا

آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عالم بقا کی جانب تشریف لے جانے کے بعد کوئی مسلمان آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنھن سے

شادی نہیں کر سکتا کیونکہ وہ تو اس کی مائیں ہیں۔ کسی مسلمان خاتون کی اس سے بڑھ کر کیا شان اور عزت ہو سکتی ہے کہ وہ سرور کونین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زوجہ ہو اور تمام مسلمانوں کی ماں ہو! اس میں کوئی حیرت و حیرانی والی بات نہیں کہ سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ نکاح کرنے کے لیے خواتین بڑی آرزو مند رہتی تھی۔ میں نے یورپ کی کئی فیشن زدہ مگر مذہبی خیالات و جذبات رکھنے والی عیسائی دوشیزاؤں سے پوچھا کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ دنیا میں آئیں اور وہ ایک سے زائد بیویوں کی موجودگی میں تم سے نکاح کرنا چاہیں تو کیا تم انکار کر دو گی؟ ایک بھی مسیحی دوشیزہ نے اس سوال کے جواب میں نہیں کہنے کی جرأت نہیں کی۔

(330) رسول مکرم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کئی موقعوں پر فرمایا "مجھے بیوی کی ضرورت نہیں" دراصل آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے شادی شدہ زندگی کا بوجھ اٹھا کر از حد قربانی دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک سے زائد بیویوں سے نکاح کی صورت میں مثالی زندگی کا عملی نمونہ اپنی امت کے لیے پیش کرنا تھا۔ ایک بیوی کے ساتھ اچھی اور خوش گوار زندگی بسر کرنا کوئی مشکل بات نہیں۔ اگر غیر معمولی حالات میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک سے زائد بیویوں کے ساتھ بحسن و خوبی گزارا کیا ہے تو اس سے رسول رحمت حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اپنی امت کو یہ سکھانا چاہتے تھے کہ ایک سے زیادہ بیویاں ہوں تو ان کے ساتھ کیسا رویہ اور سلوک ہونا چاہیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مسلم خواتین کو بھی یہ سکھانا چاہتے تھے کہ ایک ہی شوہر کی ایک سے زائد بیویوں کو اپنے شوہر سے اور آپس میں ایک دوسرے سے کیا برتاؤ اور رویہ رکھنا چاہیئے۔

(331) قدیم ادوار میں کسی بھی پیغمبر نے ایک سے زائد بیویوں سے منع نہیں کیا اور نہ ہی ایک وقت میں زیادہ سے زیادہ تعداد کی کوئی حد یا پابندی لگائی ہے۔ ظہور اسلام سے پہلے عربوں میں یہی رواج تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ قرآن الحکیم وقتاً فوقتاً آیات کی صورت میں نازل ہوتا رہا ہے۔ بیویوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کی حد کے متعلق قرآنی حکم اس وقت آیا جب رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے آخری شادی کر لی تھی۔

[فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝

(النساء : 3)

"تو پھر اپنے حسب مرضی (ایک) دو، تین اور چار
عورتوں سے عقد کر لو (ہے یہ امر خوش گوار)
ہو جو اندیشہ ، کئی تم نے اگر کیں بیبیاں
ہوں گی ان کے ساتھ پھر انصاف میں دشواریاں
ایک ہی بیوی سے پھر کرنا مناسب ہے نکاح
یا جو لونڈی ہو، تمہارے قبضے میں (وہ ہے مباح)
ہو جو ناانصافی سے بچنا (زروئے معرفت)
تو یہ ہے بہتر طریقہ (اور قرینِ مصلحت)]

عام طور پر کوئی قانون پچھلی تاریخوں سے لاگو نہیں ہوتا مگر جیسے ہی رب تعالیٰ جل شانہٗ کا یہ حکم پہنچا تو سرور کونین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چار سے زائد بیویاں نکاح میں رکھنے والے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ چار سے زائد بیویوں کو طلاق دے دیں۔ اس وقت رسول رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی 9 بیویاں تھیں مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود اس قانون پر عمل کیوں نہ کیا؟ یہ سوال بہت سے لوگ کرتے ہیں۔ اس کا جواب ہے کہ رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے درج ذیل انداز میں اس حکم پر عمل فرمایا۔

(332) آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے 9 بیویوں کو ایک جگہ بلایا اور پھر ان کو قرآن الحکیم کے اس حکم سے آگاہ کیا کہ 4 سے زائد ممنوع ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی تمام ازواج سے فرمایا "مجھے تم میں سے کسی سے بھی کوئی گلہ یا شکایت نہیں ہے۔ اب (اس حکم کی رو سے) تم نے مل کر ہی فیصلہ کرنا ہے کہ تم میں سے کون طلاق لینا پسند کرتی ہے اور کون میری زوجہ بن کر زندگی گزارنا چاہتی ہے؟ اب کون مسلمان خاتون ہو گی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ ہونے کے اعزاز و افتخار کو کھونا پسند کرے گی!! فطرتاً اور قدرتاً کوئی زوجۂ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم طلاق حاصل کر کے طلاق یافتہ کے طور پر زندگی بسر کرنے کو تیار نہیں تھی چنانچہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو بتایا "میں اگرچہ تم سب کو اپنی زوجہ کی طرح رکھنے کو تیار ہوں مگر احکام ربانی کی بنیاد پر میری شرط یہ ہے کہ میں ازدواجی تعلقات ایک وقت میں صرف چار سے رکھوں گا۔" آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس بات پر تمام ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنھن متفق ہو گئیں۔

تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَتُـْٔوِیْۤ اِلَیْكَ مَنْ تَشَآءُ ؕ وَمَنِ ابْتَغَیْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكَ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ تَقَرَّ اَعْیُنُهُنَّ وَلَا یَحْزَنَّ وَیَرْضَیْنَ بِمَاۤ اٰتَیْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا فِیْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَلِیْمًا ۝

(الاحزاب : 51)

بیبیوں میں سے جسے چاہو الگ اس کو کرو
اور جس کو چاہو (جب تک چاہو) پاس اپنے رکھو
(ایک وقتِ خاص تک) تم نے جُدا جن کو کیا
ان کو پھر واپس بلا لو، تو نہیں ہے کچھ خطا
اس طرح اغلب ہے آنکھیں ان کی بھی ٹھنڈی رہیں
خاطر آزردہ نہ ہوں وہ (خوش رہیں راضی رہیں)
اور اس پر شاد ہوں جو کچھ انہیں تم نے دیا
جو دلوں میں ہے تمہارے، جانتا ہے سب خُدا
بُردبار اور جاننے والا ہے (بے شک) کبریا

درحقیقت نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن چار بیویوں سے ازدواجی تعلقات رکھتے تھے ان میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ردوبدل کرتے رہتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد پہلی چار کی جگہ دوسری چار لے لیتی تھیں لیکن قرآنی آیات کی یہ تشریح و تفسیر رب کائنات جل جلالہٗ نے پسند نہ فرمائی۔

لَا یَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَلَاۤ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ یَمِیْنُكَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ رَّقِیْبًا ۝

(الاحزاب :52)

(اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس وقت کے بعد اب نہیں تم پر حلال
عورتیں (کچھ دوسری) اور ہے نہ یہ شایان (حال)
تم بدل کر ان کو، کر لو دوسری کچھ بیبیاں

حُسن کتنا ہی تمہیں ان کا پسند آئے (یہاں)
ہاں مگر (جائز ہیں وہ) جو ہیں تمہاری لونڈیاں
اور وہ اللہ (تو) ہر چیز کا ہے پاسباں

اور ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پاک شادی کے معاملہ میں بھی اسلامی قوانین سے بالاتر نہیں۔

(333) ایسی کئی باتیں ہیں جو کوئی خاتون شرم و حجاب کی وجہ سے کسی مرد سے نہیں پوچھ سکتی لیکن وہ کسی عورت سے انتہائی آسانی کے ساتھ پوچھ سکتی ہے لہٰذا مسلم معاشرے میں تعلیم یافتہ خاتون کی بہت ضرورت ہے۔ چنانچہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنھن سے زیادہ تعلیم یافتہ کون سی خواتین ہو سکتی تھیں کیونکہ وہ تو ہادیٔ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ہمہ وقت رہتی تھیں اور معلم کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے (اسلامی اصول وضوابط) سیکھتی رہتی تھیں۔ اگر نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محض ایک زوجہ محترمہ ہوتیں تو اس امر کی کیا ضمانت ہو سکتی تھی کہ وہ لمبی عمر پاتیں۔ کسی شخص کی جتنی زیادہ بیویاں ہوں گی اس بات کا اتنا زیادہ امکان ہو گا کہ ان بیویوں میں سے بعض لمبی عمر پائیں۔ رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جس قدر احادیث ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنھن سے روایت کردہ ہیں اور جتنے فتوے انہوں نے دیئے ہیں ان سے یہ امر روز روشن کی طرح واضح ہے کہ ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنھن بہت زیادہ ذہین و فطین اور اعلیٰ فہم و فراست رکھنے والی تھیں مزید یہ کہ ان سب نے پاکیزگی اور فیاضی سے مزین زندگی کا عملی نمونہ پیش کیا۔

(334) نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دینِ اسلام کے استحکام اور مضبوطی کی خاطر اہم اور سرکردہ افراد سے پائیدار دوستی کی ضرورت تھی۔ کسی طاقتور اور نامور قبیلہ کے سردار کی بیٹی سے شادی کا یقیناً فائدہ ہوتا ہے اور سرور کائنات حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے اس قسم کی شادی کا مقصد اسلام کا مفاد اور رب تعالیٰ جل شانہٗ کے نام کی سربلندی تھی۔

(335) بعض اور مفادات بھی تھے جن میں کچھ کا ذکر ہم آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنھن کی سوانح حیات میں کرنے کی کوشش کریں گے۔

1. حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا:

(336) خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پہلی زوجہ محترمہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھیں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ظہور اسلام سے بہت پہلے (تقریباً 15 سال پہلے) شادی کی تھی۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا مکہ مکرمہ کے ایک امیر اور شاہی قبیلہ ''اسد'' سے تعلق رکھتی تھیں۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیوہ تھیں کیونکہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے یکے دیگرے دو شوہر فوت ہو چکے تھے۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بہت زیادہ عقل مند تھیں۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ورثہ میں ملی ہوئی دولت کو ضائع کرنے کی بجائے اسے تجارت میں استعمال کیا اور یوں آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا سرمایہ بڑھتا چلا گیا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نوجوان خاتون ہونے کی بناء پر تجارتی قافلوں کے ہمراہ سفر نہیں کر سکتی تھیں چنانچہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اپنا مالِ تجارت مکہ مکرمہ کے ان ایماندار تاجروں کے حوالے کر دیتیں جو بیرونی ممالک میں خرید و فروخت کے لیے آتے جاتے رہتے تھے۔ تاریخ دانوں کے مطابق اس طرح کی تجارت میں مال کے مالک اور فروخت کرنے والے کا منافع میں حصہ آدھا آدھا ہوا کرتا تھا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے پہلی ملاقات تجارت ہی کے حوالے سے ہوئی۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دیانتداری اور ایمانداری نے ازحد متاثر کیا۔ اسی وجہ سے حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے دل میں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا احترام پیدا ہوا۔ اس احترام نے پسندیدگی کی صورت اختیار کی اور پھر تبدریج محبت کی کیفیت پیدا ہوئی نتیجتاً حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ اس وقت آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر 25 برس تھی جب کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی عمر 28 برس (معروف روایات کے مطابق 40 برس) تھی۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بطن سے کوئی نصف درجن بچے پیدا ہوئے جن میں سے صرف چار بیٹیاں زندہ رہیں۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹیوں کی شادی ہوئی تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہی آرزو تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے داماد ایک ہی بیوی کے شوہر رہیں (یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عام حالات میں کس انداز کی شادی شدہ زندگی پسند فرماتے تھے)۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ازحد سخی اور فیاض تھیں۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رضاعی والدہ (حلیمہ سعدیہ) سے بہت اچھا سلوک اور برتاؤ فرماتی تھیں جو اکثر اپنے رضاعی بیٹے (حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ملنے کے لیے مکہ مکرمہ تشریف لاتی تھیں۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا یتیموں، بیواؤں، ناداروں، حاجت مندوں، مکہ مکرمہ سے گزرنے والے غیر ملکی ضرورت مند مسافروں اور دوسرے مستحق افراد کی مدد و اعانت بھی کرتی تھیں۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا مکہ مکرمہ کے ایک خوبصورت دو منزلہ مکان میں رہتی تھیں۔ تاریخ دانوں کا بیان ہے کہ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فلسطین سے واپس تشریف لائے تو حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنے گھر کی دوسری منزل سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قافلہ کو مکہ مکرمہ میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ جگہ آج بھی لوگوں کو یاد ہے جہاں حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مکان تھا۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کسی بھی قسم کے حالات میں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سب سے پہلے مشرف بہ اسلام ہوئیں اور آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا اقرار کیا۔ نبوت کے ابتدائی دور جب آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قدرے ہچکچاہٹ محسوس کرتے تھے کہ انہیں واقعی اللہ تبارک وتعالیٰ نے رسول منتخب کیا ہے تو حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دیتیں اور حوصلہ بڑھاتیں۔ تاریخ دانوں نے ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے کہ نبوت کے ابتدائی ایام میں ایک دن حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے نبی مکرم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے یہ بتا سکتے ہیں کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس تشریف لاتے ہیں؟ ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "جی ہاں! میں بتا سکتا ہوں۔" ایک روز محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کہا: "حضرت جبرئیل علیہ السلام آگئے ہیں۔" اس پر حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی دائیں طرف کر لیا اور پھر پوچھا کیا اب بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وہ فرشتہ نظر آرہا ہے؟ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جی ہاں! وہ اب بھی نظر آرہا ہے۔" پھر حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنے بائیں، اپنے سامنے اور اپنے پیچھے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کھڑا کر کے وہی سوال کیا تو آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بھی وہی جواب تھا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے شوہر کو اپنے بازوؤں میں تھام لیا تو سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فوراً

فرمایا"وہ فرشتہ اب غائب ہو گیا ہے۔" اس پر حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کہا: "یہ یقیناً رب تعالیٰ جل شانہٗ کی طرف سے بھیجا ہوا فرشتہ ہی ہے کیونکہ اگر وہ شیطان ہوتا تو ہمارے اس طرح بے تکلف ہونے پر وہ ہمیں دیکھتے رہنے سے باز نہ آتا۔" آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے قبیلے کو مشرکین مکہ کی طرف سے تین سال تک اذیت ناک بائیکاٹ کا سامنا کرنا پڑا ۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پریشانی اور آزمائش کے اس دور میں اپنے شوہر کے ساتھ تھیں ۔ اس کے فوراً بعد حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا انتقال ہو گیا۔ پریشانی اور فاقوں نے ان کی صحت تباہ کر دی تھی ۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو مکہ کے عام قبرستان المعلاۃ میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی قبر آج بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

2. حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا:

(337) حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا تعلق قبیلہ عامر ابن لوئی سے تھا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا مکہ مکرمہ میں رہائش پذیر تھیں ۔ پہلے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شادی ایک شخص السکران ابن عمرو سے ہوئی تھی ۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پہلے خود مشرف بہ اسلام ہوئیں اور پھر اپنے شوہر کو اسلام قبول کرایا۔ دونوں میاں بیوی پر مشرکین مکہ نے ظلم وستم کے پہاڑ توڑے ۔ چنانچہ دونوں حبشہ کی جانب ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے ۔ اس کے بعد کی روایات میں اختلاف ہے ۔ کچھ روایات کے مطابق السکران ابن عمرو جب حبشہ پہنچا تو وہاں جا کر مرتد ہو گیا اور اس نے عیسائیت قبول کر لی مگر دوسری روایات اس بات کی نفی کرتی ہیں ۔ جو السکران ابن عمرو کی عیسائیت قبول کرنے کا تذکرہ کرتے ہیں وہ یہ تفصیلات نہیں بتاتے کہ اس نے کیوں اور کیسے ایسا کیا! لیکن اس بات پر سب متفق ہیں کہ حبشہ میں السکران کی وفات کے بعد حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا مکہ مکرمہ واپس تشریف لے آئیں ۔ ان کی عمر کافی ہو چکی تھی ۔ رسول مکرم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے کئی بچے تھے اور کم از کم آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی دو بیٹیوں کی ابھی شادی بھی نہیں ہوئی تھی چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کسی نوجوان خاتون سے شادی کرنے کی بجائے کسی عمر رسیدہ خاتون سے شادی کرنے کو ترجیح دی۔ شاید اس لیے بھی کہ نوجوان خاتون بلوغت کی عمر کو پہنچتے بچوں سے زیادہ عزت نہ کرا سکتی ۔ السکران کی عیسائیت قبول نہ کرنے کے قائل تاریخ دان اس کے قبیلہ کی شہرت وعزت کو خراب نہیں

کرنا چاہتے کیونکہ السکر ان کا پورا قبیلہ بعد میں مشرف بہ اسلام ہو گیا تھا۔ اگر یہ قیاس صحیح ہے تو سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے شادی کا مقصد ان کا انتہائی مشکل حالات میں ثابت قدم رہنے پر انہیں یہ اعزاز وافتخار عطا کرنا تھا۔ تاریخ دانوں کے مطابق حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بچوں سے بے حد محبت کی اور انہیں حقیقی والدہ کا پیار دیا۔ عمر رسیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی سننے کی صلاحیت بہت کمزور ہوتی چلی گئی اور آخر کار وہ بالکل ہی نہیں سن سکتی تھیں۔ سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے معاملہ میں طلاق رجعی (وہ طلاق جس میں نکاح کی تجدید کے بغیر بیوی سے رشتہ زوجیت بحال کرنا جائز ہو) کی ذاتی مثال چھوڑی ہے۔ مگر حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا: ''میرے لیے ازدواجی مسرت حاصل کرنے والی زندگی میں کوئی دلچسپی نہیں۔ میری تو محض یہ آرزو ہے کہ میں محشر کے روز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ کی حیثیت سے اُٹھائی جاؤں'' چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فوراً انہیں گھر لے آئے۔ انہوں نے بڑی لمبی عمر پائی۔ ان کا انتقال حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں 19 ہجری میں ہوا اور وہ مدینہ کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہوئیں۔

3. حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا:

(338) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا مکہ مکرمہ کے قبیلہ بنو تیم سے تعلق رکھنے والے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیٹی تھیں۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پہلی بیوی تھیں جن کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کثیر الازدواج ہو گئے کیونکہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے دور میں سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوسری شادی نہیں کی۔ حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی وفات کے بعد نکاح کیا تھا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نکاح ہجرت مدینہ منورہ سے دو سال پہلے مکہ مکرمہ میں ہوا۔ اس وقت ابھی آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بالغ نہیں تھیں۔ اس لیے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی رخصتی آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے کئی سال بعد بالغ

ہونے پر مدینہ منورہ میں ہوئی۔ کیا وجہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا رشتہ آپ رضی تعالیٰ عنہا کے والدین سے طلب فرمایا؟

(339) ظاہر ہے اس میں کسی قسم کی نفسانی خواہش کا عمل دخل نہیں تھا کیونکہ مستقبل قریب میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ کسی صورت بھی ازدواجی زندگی شروع نہیں کی جاسکتی تھی۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے یہ کافی مشکلات ومصائب کا زمانہ تھا ۔ جناب ابوطالب کا انتقال ہو چکا تھا اور قبیلہ کی سرداری ابولہب کو مل چکی تھی جو کہ نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جانی دشمن تھا۔ ابولہب نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے قبیلے کا باغی قرار دیا تھا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے طائف میں سیاسی پناہ کے حصول کی کوشش بھی ناکام ہو چکی تھی اور ان ایام میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ مکرمہ میں ایک غیر مسلم کی پناہ میں زندگی گزار رہے تھے۔ اس شادی کا مقصد کسی طاقتور حمایتی اتحادی سے تعلق پیدا کرنا بھی نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ اس بات سے سب اچھی طرح واقف تھے کہ مکہ مکرمہ کے قبائل میں قبیلہ بنوتیم کی اہمیت نہ ہونے کے برابر تھی بلکہ ایک شاعر نے تو یہ کہہ کر بنوتیم کا مذاق اُڑایا تھا کہ ”مکہ مکرمہ میں کوئی بھی اہم فیصلہ کے وقت بنوتیم کو مشورہ میں شامل نہیں کیا جاتا۔“

(340) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ظہور اسلام سے پہلے ہی سرور کونین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گہرے دوست تھے اور دونوں ایک دوسرے کے گھر آیا جایا کرتے تھے۔ یوں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو پیدائش کے وقت سے ہی جانتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دیکھ رہے تھے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ کس قدر ذہانت وفراست وفطانت بڑھتی جارہی تھی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اس عظیم دور کے ان چند بچوں میں سے تھیں جو مسلمان والدین کے گھر پیدا ہوئے تھے یعنی آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پیدائشی مسلمان تھیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نکاح کرکے سرور کونین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے گہرے دوست حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اپنے تعلقات کو مزید مضبوط اور مستحکم کرنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کم عمر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو دین اسلام اسلامیات اور اسلامی قوانین کی عظیم ڈاکٹر (عالم) بنانے کی آرزو رکھتے تھے۔ چونکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کم سن تھیں۔ اس لیے معقولیت کے ساتھ یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سرور کائنات حضرت

محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کافی عرصہ بقید حیات رہیں گی ۔ (درحقیقت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا انتقال سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس دار فانی سے کوچ کر جانے کے کوئی 47 برس بعد ہوا) چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے جو امیدیں اور توقعات تھیں وہ پوری ہوئیں ۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نہایت پرہیز گار اور متقی خاتون تھیں ۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا دن رات نوافل اور روزوں میں گزارتی تھیں ۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اس قدر سخی اور فیاض تھیں کہ جب آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو دربار خلافت سے ہر چھ ماہ کے بعد پنشن ملتی تھی تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اسی روز ہی تمام رقم غریبوں میں تقسیم فرما دیتی تھیں ۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ایک خادمہ روایت کرتی ہیں کہ ایک روز حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو پنشن ملی جو کہ خلیفہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھجوائی تھی ۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے مجھے ہدایت کی کہ اس پنشن میں سے اتنی رقم اِس کو دے دو اور اتنی رقم اُس کو دے دو ۔ اس طرح تمام پنشن ختم ہو گئی اور باقی کچھ نہ بچا ۔ جب میں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو بتایا کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روزہ سے ہیں جبکہ شام کی افطاری کے لیے گھر میں کچھ بھی نہیں تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا: ”تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ خیر کوئی بات نہیں ۔ رب رحمٰن ورحیم سب سے بڑے اور عظیم ہیں ۔“

(341) جہاں تک حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے علم کا تعلق ہے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اپنے دور میں نہ صرف اپنے خاص شعبہ اسلامی قانون بلکہ عربی شاعری، اسلام سے پہلے کی تاریخ عرب، ریاضی، علم الادویات اور کئی دوسرے علوم کی ماہر تھیں ۔ اس دور کے عظیم ترین مسلم ماہرین قانون ہمیشہ کسی بھی مشکل کے حل کے لیے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس آتے اور عام طور پر تسلی بخش جواب سے مطمئن ہو کر جاتے ۔ روایات میں ہے کہ بعض اوقات جب ماہرین قانون کی کسی مسئلہ پر رائے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سامنے پیش کی جاتی تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سنتے ہی اس کی خامیاں بیان کر دیتیں جسے وہ ماہرین قانون بھی تسلیم کر لیتے ۔ اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا معلم کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث اور سنت کی بہترین عالم تھیں ۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو اس دور کا عظیم محدث تسلیم کیا جاتا ہے ۔ ہمیں معلوم ہوا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا انتہائی ذہین اور تعلیم یافتہ تھیں ۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب مسلمان خواتین کے لیے پردہ کا

حکم نہیں آیا تھا۔ ایک دن ایک عرب سردار عیینہ ابن الحسن الغزاری سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کے لیے آیا۔ اس نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو دیکھتے ہی گستاخی و بے حیائی سے کہا: ''اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کیا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس چھوٹے گلاب کے پھول (حمیرا) سے میرا رشتہ کریں گے؟ (اس کے بدلے میں) میں اپنی کوئی سی بھی بیوی جسے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ترجیح دیں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حوالے کرنے کو تیار ہوں۔'' اس وقت آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے قریبی دوست حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر پر موجود تھے۔ یہ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا (سیرت کے ساتھ ساتھ) صورت میں بھی انتہائی جاذب نظر تھیں۔ [حمیرا حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ایک توصیفی نام ہے)۔

(342) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا انتہائی دُبلی پتلی تھیں۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے اس دُبلے پن کی وجہ سے ایک دفعہ انتہائی سنجیدہ مسئلہ پیدا ہو گیا۔ یہ 5 ہجری کا واقعہ ہے ۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بنوالمصطلق کے خلاف فوجی مہم میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ تھیں۔ جب اس مہم سے لشکر اسلام واپسی کے سفر پر تھا تو ایک روز صبح سویرے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ایک فطری ضرورت کے تحت لشکر کے پڑاؤ سے دور چلی گئیں۔ جب آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا واپس آئیں تو معلوم ہوا کہ اسلامی لشکر تو کوچ کر چکا ہے۔ جو ملازم حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے اونٹ پر محمل رکھنے کی ذمہ داری پر مامور تھا اس نے یہ دیکھا ہی نہیں کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا محمل میں ہیں یا نہیں۔ (چونکہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا دبلی پتلی تھیں اس لیے کم وزن ہونے کی بناء پر محمل اُٹھانے والے ملازم کو اندازہ ہی نہ ہو سکا)۔ لشکر اسلام کے کوچ کر جانے کی بناء پر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ازحد گھبرائیں اور پریشانی و مایوسی میں اپنے سر سے پیروں تک چادر لپیٹ کر لیٹ گئیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک مسلمان سپاہی (حضرت صفوان بن معطل رضی اللہ تعالیٰ عنہ) جو اتفاق سے پیچھے رہ گیا تھا وہاں سے گزرا تو اس نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو پہچان لیا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو اس طرح لیٹا دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ یقیناً کوئی غیر معمولی حادثہ ہوا ہے۔ اس نے آواز دی اور جب اسے صحیح صورت

حال کا علم ہوا تو وہ اپنا اونٹ زمین پر بٹھا کر کچھ دور فاصلے پر چلا گیا تا کہ ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا آزادی کے ساتھ اونٹ پر سوار ہو سکیں۔ جب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اونٹ پر سوار ہو گئیں تو اس نے مہار پکڑ کر آگے آگے پیدل چلنا شروع کر دیا اور جلد ہی اسلامی لشکر تک پہنچ گیا۔ اس وقت لشکر اسلام یا تو راستے میں تھا یا دوپہر سے پہلے اگلے پڑاؤ پر پہنچ کر اونٹوں پر سے اپنا سامان اُتار رہا تھا۔ فطری طور پر ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پیچھے رہ جانے کی اطلاع اسلامی لشکر میں پھیل چکی تھی تاہم کسی کو اس میں کوئی مشکوک بات کا احساس نہ ہوا۔ ہمیں ابن اُبّی یاد ہے جو مدینہ منورہ میں بادشاہ مقرر کیا جانے والا تھا مگر یہ منصوبہ اس وقت تبدیل ہو گیا جب اہل مدینہ نے سرورِ کونین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کا بہترین متبادل پایا۔ ظاہر ہے ابن اُبّی کو یہ واقعہ نہیں بھولا تھا۔ اس نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کبھی معاف نہیں کیا۔ اس نے تمام زندگی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پاک کے لیے مشکلات و مصائب پیدا کیے۔ اس ابن ابی کو بھی اس واقعہ کا علم ہوا تو اس نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بارے میں فضول بکواس کرتے ہوئے سکینڈل گھڑ لیا۔ اس پر بعض دوسرے لوگ بھی باتیں بنانے لگے۔ آخر کار ان افواہوں اور باتوں کے بارے میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اطلاع دی گئی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے تو کچھ نہ کہا مگر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رویہ میں محبت کی گرمجوشی کی بجائے سرد مہری کو محسوس کر لیا۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس اور کوئی طریقہ نہیں تھا سوائے اس کے کہ انہوں نے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنے والدین کے گھر جانے کی اجازت مانگی تا کہ چند دن وہاں گزار سکیں۔ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اِدھر اُدھر سے پوچھا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خادمہ اور بعض دوسرے افراد سے بھی پوچھا گیا مگر کسی نے بھی کوئی ایسی بات نہیں دیکھی تھی جس کے لیے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو تنقید کا نشانہ بنایا جا سکے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے آخری نبی حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب دیکھا کہ واقعات کے اصل حقائق معلوم کرنا ممکن نہیں اور نہ لوگوں کی زبان روکنا ممکن ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خفا ہو کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ

تعالیٰ عنہ کے گھر تشریف لے گئے تاکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے والدین سے بات کر سکیں۔ وہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ان کے والدین کی موجودگی میں کہا "اگر تم نے کوئی غلطی کی ہے تو بہتر ہے کہ اس کے لیے رب رحمٰن و رحیم سے معافی مانگو۔ رب علیم وخبیر سے کوئی بات چھپی نہیں رہتی۔ روز حساب کی بجائے اس دنیا میں ہی معافی مانگنا بہتر ہے۔" حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اپنے محترم ومکرم شوہر کی باتیں سن کر جذباتی ہوگئیں اور آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنے والدین سے کہا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آپ لوگ ہی بات کیجیے۔" مگر انہوں نے کہا: "ہماری پیاری بیٹی! ہم ایسے معاملہ میں کیا بات کریں جس کا ہمیں کوئی علم ہی نہیں؟" حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جذباتی صدمہ سے سنبھل کر خود پر قابو پایا اور انتہائی مختصر مگر انتہائی پُر اثر بات کی۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتایا کہ وہ معصوم ہیں اور اپنی معصومیت کے حوالے سے کچھ نہیں کہنا چاہتیں بلکہ انہوں نے سارا معاملہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات پر چھوڑ دیا ہے جو حاضر و ناظر ہے اور ہر بات سے باخبر ہے اور وہ اس حوالے سے مزید کچھ نہیں کہنا چاہتیں۔ اچانک سب افراد نے دیکھا کہ نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وہ مخصوص کیفیت طاری ہوگئی جو وحی کے نزول کے وقت ہوا کرتی تھی۔ جلد ہی یہ کیفیت ختم ہوگئی تو سرور کونین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو مبارکباد دی اور فرمایا کہ رب ذوالجلال نے انکی پاکدامنی کی تصدیق کی ہے۔

سُورَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا وَاَنْزَلْنَا فِيْهَآ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لَّعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۝ اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۪ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۝ اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً ۡ وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ۚ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ۝ وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ
اَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ
وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ
شَهٰدٰتٍۢ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ
اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ
اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۢ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝
وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝
وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ ۝
اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ۚ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ۚ
بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ۚ
وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ
ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا ۙ وَّقَالُوْا هٰذَآ
اِفْكٌ مُّبِيْنٌ ۝ لَوْلَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا
بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ۝ وَلَوْلَا فَضْلُ
اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِيْ مَآ
اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ
بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا ۙ وَّهُوَ عِنْدَ
اللّٰهِ عَظِيْمٌ ۝ وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ
نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۖ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ۝ يَعِظُكُمُ اللّٰهُ
اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَيُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ
الْاٰيٰتِ ۚ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ
الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ
وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ
رَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝

یہ (بھی اک) سورت ہے، جس کو ہم نے ہے نازل کیا
اور ہمارا ہی تو (یہ دستور) ہے باندھا ہوا
اور کھلے احکام اس میں ہم نے ہیں نازل کیے
تا کہ تم رکھو انہیں یاد ، (اک نصیحت مان کے)
مرد اور عورت (کریں جب مِل کے آپسمیں) زنا
دونوں میں سے مارو سو درے ہر اک کو (برملا)
چاہیے ، جب تم کرو تعمیل حکم کرد گار
کچھ ترس آئے نہ تم کو ان کے اوپر زینہار
ہے یقیں تم کو جو روز حشر اور اللہ کا
اور دیکھیں کچھ مسلماں ان کو ملتی یہ سزا
عقد کرتا ہے (یہ) زانی ، عورتِ بدکار سے
یا پھر اس عورت سے جو ہو مشرکہ (کردار سے)
زانیہ بھی (یوں بھی) مردِ مشرک و بدکار سے
عقد کرتی ہے (کہ ہیں دونوں ہی اک کردار کے)
اور حرام ایسا تعلق مومنوں پر (چاہیئے)
پاک دامن عورتوں پر جو لگائیں تہمتیں
اور نہ لائیں چار شاہد (جُرم کی تصدیق میں)
اسی (80) درے ان کو مارو اور نہ مانو پھر کبھی
تم گواہی ان کی، ہیں بدکار و نافرماں یہی
پھر جنہوں نے توبہ کر لی ، اور کی اصلاح حال
تو خدا ہے مہرباں ، آمرزگار (و ذوالجمال)
جو لگائیں تہمت اپنی بیویوں پر (ناروا)
اور نہ ہوں شاہد بھی ان کے پاس ، خود اپنے سوا
تو یہی صورت گواہی کی ہے ، ایسے شخص کی
چار بار اللہ کی کھائے قسم (وہ مدعی)
اور کہے وہ اپنے دعوے میں ہے سچا واقعی

پانچویں بار اس کو یہ کہنا بھی ہو گا (لازمی)
وہ اگر جھوٹا ہو لعنت اس پہ ہو اللہ کی
اور سزا عورت کے سر سے یوں ٹلے گی (دیکھئے)
چار بار اللہ کی کھا کر قسم ، وہ یہ کہے
کہ وہ جھوٹا مدعی ہے (کر رہا ہے افترا)
یہ جو سچا ہو تو ٹوٹے مجھ پر قہر اللہ کا
ہاں نہ ہوتا تم پر رحم و فضل اگر اللہ کا
(فتنے خانہ داریوں میں کس قدر ہوتے بپا)
وہ ہے توبہ سننے والا حکمتوں والا خدا

ہیں تمہیں میں سے جنہوں نے یہ کیا طوفاں بپا
اپنے حق میں تم نہ سمجھ (مومنو) اس کو برا
بلکہ یہ حق میں تمہارے (اس طرح) بہتر ہوا
(سچے مومن اور منافق کا پتہ تو چل گیا)
بار تہمت ان میں سے جس نے اُٹھایا (جس قدر)
اور جس نے حصہ تہمت میں لیا ہے بیشتر
ویسی ہی ان کو بڑی ہوگی سزا (بھی سربسر)

مومنو! جب تم نے (ناشائستہ) بات ایسی سنی
تو مسلماں عورتوں مردوں نے (پھر اُس وقت ہی)
کیوں نہ اپنے لوگوں کی نسبت کیا اچھا گماں؟
کیوں نہ فوراً کہدیا ، جھوٹی ہے سب یہ (داستاں)
کیوں نہ وہ اس واقعہ پر چار لے آئے گواہ؟
اور جب شاہد نہ لائے (تو یہ طوفاں تھا گناہ)
پس یہی وہ لوگ ہیں، جھوٹے ہیں جو نزد اللہ

اور نہ ہوتا تم پہ فضل و رحم اگر اللہ کا
آخرت میں اور دنیا میں تو (اندیشہ یہ تھا)
تم نے تھا جس (بے سروپا) بات کا چرچا کیا

اس سے ہو جاتے عذاب بے کراں میں مبتلا
جب زباں پر اپنی تم وہ واقعہ لانے لگے
اور ایسی باتیں اپنے منہ سے دہرانے لگے
علم جن کا (فی الحقیقت) کچھ تمہیں تھا ہی نہیں
اور تم نے اس کو ہلکی بات سمجھا (بالیقیں)
تھی بڑی وہ بات نزدیک اللہ (العالمیں)
جب سنی وہ بات تم نے، کیوں نہ بول اُٹھے وہیں
ایسی باتیں منہ پہ لے آنا ہمیں زیبا نہیں
حاشا وکلا یہ ہے بہتان بھاری (بالیقیں)
(حاشا وکلا یعنی خدا بچائے)
پھر نہ کرنا کام ایسا، ہے یہ تو غیظ خدا
تم اگر ایمان رکھتے ہو (تو سن لو برملا)
کھول کر تم سے خدا احکام کرتا ہے بیاں
حکمتوں والا ہے وہ اللہ، سب کا رازداں
(اے پیمبرؐ) لوگ جو یہ چاہتے ہیں (بے حیا)
ہو مسلمانوں میں بدکاری کا چرچا (جابجا)
آخرت میں اور دنیا میں انہیں کے واسطے
ہے عذاب دردناک (اور ماسوا اس بات کے)
جانتے ہیں (ان کو) ہم ہی، تم نہیں ہو جانتے
تم پہ فضل و رحم اگر اس کا نہ ہوتا (بے کراں)
اور اگر ہوتا نہ وہ تم پر شفیق و مہرباں
(تو یقیناً اک نیا طوفاں بپا ہوتا یہاں)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا واپس سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر تشریف لے آئیں اور انہیں بھی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وہی پہلے والی محبت وشفقت مل گئی۔

(343) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا انصاف کو ہر چیز سے زیادہ پسند فرماتی تھیں۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا زندگی کے ابتدائی دور میں کھیل کو دپسند کرتی تھیں۔ روایت ہے

کہ ایک دفعہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ دوڑنے کا مقابلہ بھی کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ تیز دوڑی تھیں۔ اس کے کئی سال بعد ایک دفعہ پھر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے رسولِ مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ دوڑنے کا مقابلہ کیا مگر عمر کے ساتھ قدرے بھاری ہونے کی بناء پر مقابلہ جیت نہ سکیں تو رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیار سے کہا 'یہ اس وقت کا بدلہ ہے۔''

حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا:

(344) حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صاحبزادی تھیں۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا تعلق مکی قبیلہ بنو عدی سے تھا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شادی ایک متقی اور پرہیز گار مسلمان سے ہوئی جنہوں نے جنگ اُحد میں جام شہادت نوش فرمایا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ابھی جوان تھیں چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی بیٹی کے لئے رشتہ کی تلاش کی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سب سے پہلے اپنے گہرے دوست حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نکاح کے لئے کہا تو وہ خاموش رہے۔ پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا تو انہوں نے بھی معذرت کر لی کیونکہ وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دوسری بیٹی سے شادی کی توقع رکھتے تھے۔ اس پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جذبات مجروح ہوئے اور آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شکایت کی کہ ان کے بہترین دوستوں نے ان کی اعلیٰ خوبیوں کی مالک بیٹی سے نکاح کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ وآلہ وسلم نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی باتوں کا اثر لیا اور فرمایا ''عمر! فکر نہ کرو۔ میں عثمان (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے لئے تمہاری بیٹی سے بہتر بیوی کا انتظام کروں گا جبکہ تمہاری بیٹی کو عثمان (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سے بہتر شوہر ملے گا۔'' دراصل سرورِ کونین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی دوسری بیٹی کا حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ نکاح کر کے انہیں اعزاز و افتخار بخشنا چاہتے تھے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیوہ بیٹی سے خود شادی کر کے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وقار و افتخار میں اضافہ کرنا چاہتے تھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فیصلہ پر ہر شخص نے خوشی و مسرت کا اظہار کیا۔ بعد ازاں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنی خاموشی کا سبب بتا دیا۔ انہوں نے کہا کہ میرا خیال تھا کہ رسول

مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیٹی سے نکاح کر کے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وقار واعزاز میں اضافہ چاہتے ہیں لیکن میں وقت سے پہلے اس بات کو ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تمام معاملہ اچھی طرح سمجھ گئے اور یوں دونوں میں پرانی دوستی پھر سے تازہ ہوگئی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نکاح کے وقت حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی عمر 22 برس تھی۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فہم وفراست میں کسی سے کم نہ تھیں۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا عرب کی ان چند خواتین میں سے تھیں جو لکھائی پڑھائی جانتی تھیں۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا میں قوت حافظہ بے پناہ تھی۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی متعدد احادیث کی روایت کی ہے۔ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے قانونی اقدامات خاص طور پر عورتوں کے متعلق قانونی امور میں مشاورت کیا کرتے تھے۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے لمبی عمر پائی اور 64 برس کی عمر میں 45 ہجری میں اس دار فانی کو الوداع کہا۔

5. حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا ام المساکین:

(345) حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نجد کے ایک بہت بڑے قبیلے عامر ابن صعصعہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شادی مکہ مکرمہ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان میں ہوئی تھی۔ 2 ہجری میں جنگ بدر میں حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے شوہر حضرت عبیداللہ ابن الحارث ابن المطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شہادت کا رتبہ واعزاز پایا چنانچہ حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے مدینہ منورہ میں رہائش اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا مسلمان تھیں جبکہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا قبیلہ مشرف بہ اسلام نہیں ہوا تھا اس لئے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اپنے قبیلہ میں نہیں جانا چاہتی تھیں۔ مزید یہ کہ اس وقت مسلمانوں اور نجد کے اس طاقتور قبیلے کے مابین تعلقات کافی حد تک بگڑ چکے تھے۔ اس قبیلہ کے افراد نے دھوکہ سے بئر معونہ کے مقام پر مسلمان مبلغوں کے ایک وفد کو شہید کر دیا تھا۔ بعد میں اس قبیلہ کے دو مسلمان افراد کو بئر معونہ کے قتل عام میں زندہ بچ جانے والے ایک مسلمان نے قتل کر دیا۔ یہ مسلمان چونکہ قتل عام کے وقت اپنے ساتھیوں کے اونٹ چرانے کیلئے چراگاہ کی طرف گیا ہوا تھا اس لئے اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ جن دو افراد کو اس نے قتل کیا ہے وہ مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے۔ اس قسم کی صورت حال کو مزید خراب ہونے سے بچانے کیلئے فوری طور پر کسی اقدام کی ضرورت تھی۔ پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوچا کہ اگر حضرت

زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نکاح کرلیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے قبیلہ والوں کے دلوں میں نرمی پیدا ہو جائے کیونکہ حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی اپنے قبیلہ میں بہت عزت و وقعت تھی اور آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اس قدر سخی اور فیاض تھیں کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو قبول اسلام سے پہلے ہی "ام المساکین" کے لقب سے پکارا جاتا تھا تاہم حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی صحت نے ان کا ساتھ نہ دیا اور آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شادی کے صرف 3 ماہ بعد ہی اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ اس وقت حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی عمر صرف 30 برس تھی۔ حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت زینب خزیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی وفات کے بعد اب رسول مکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف تین ازواج حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا رہ گئیں۔

6. حضرت ام سلمہ ہند رضی اللہ تعالیٰ عنہا:

(346) حضرت ام سلمہ بنت ابو اُمیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا تعلق مکہ مکرمہ کے اہم قبیلہ بنو مخزوم سے تھا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضرت خالد ابن الولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قریبی رشتہ دار تھیں۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور ان کے شوہر ظہور اسلام کے ابتدائی ایام ہی میں دائرہ اسلام میں داخل ہوئے اور دین اسلام کے لئے کافی کام کیا۔ اپنے خاندان کے ظلم و ستم سے بچنے کے لئے دونوں میاں بیوی نے حبشہ کی جانب ہجرت کی۔ وہاں سے واپسی پر جب وہ دوبارہ مدینہ منورہ جانے لگے تو حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے والدین نے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو زبردستی روک لیا (جبکہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے شوہر مدینہ منورہ چلے گئے) حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے والدین نے ان کے بچے کو ساتھ لے جانے کی اجازت نہ دی مگر حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اپنے بچے سے جدا نہیں ہو سکتی تھیں۔ بچے کے لئے والدین سے حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی جدوجہد کے دوران بچے کا ایک بازو اکھڑ کر زندگی بھر کے لئے ناکارہ ہوگیا۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے والدین انہیں مدینہ منورہ جانے سے تو روک سکتے تھے مگر وہ انہیں زبان بند رکھنے سے نہیں روک سکتے تھے لہٰذا حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روزانہ کعبۃ اللہ جاتیں اور وہاں اپنے خاندان کے لئے بلند آواز سے بد دعا کرتیں کہ "خدا کرے گدھ آسمانوں سے اُتریں اور پورے خاندان کو چیر پھاڑ دیں" آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے خاندان کے افراد نے بالآخر تنگ آ کر آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کہا

''جاؤ جہاں چاہو جا سکتی ہو۔'' اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اکیلی مدینہ منورہ کے لئے روانہ ہو گئیں اور اپنے شوہر سے جا ملیں۔ مگر ابھی آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مصائب کا اختتام نہیں ہوا تھا۔ جلد ہی 3 ہجری میں جنگ اُحد میں آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے شوہر (حضرت عبداللہ بن عبدالاسد رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے جام شہادت نوش فرمایا۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس آہوں اور آنسوؤں کے سوا اور کچھ نہیں بچا تھا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی عمر بھی کافی ہو چکی تھی اور آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے کافی بچے بھی تھے۔ اس صورت حال میں رحمۃ للعالمین حضرت مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قابل تعظیم وتکریم قبیلہ کی فرد حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی دلجوئی کے لئے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے شادی کا فیصلہ کیا۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے لئے یہ ایک غیر متوقع اعزاز وافتخار تھا۔ اگرچہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اپنے شہید شوہر سے ازحد محبت کرتی تھیں مگر رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیش کش کو قبول کر کے بھی انہیں خوشی ہوئی۔ خالد ابن ولید اس وقت اسلام کے بدترین دشمن تھے۔ مگر جب رسولِ مکرم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نکاح کیا تو خالد ابن ولید آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریبی رشتہ دار بن گئے تو ان کی دشمنی میں قدرے کمی آ گئی اور کوئی دو سال بعد وہ مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا عرب کی ان چند خواتین میں سے تھیں جو لکھائی پڑھائی جانتی تھیں۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے لمبی عمر پائی اور 61 ہجری میں آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا انتقال ہوا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد 50 سال تک زندہ رہیں۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا انتہائی اچھی شاعرہ تھیں۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کافی احادیث اور روایات آنے والی نسلوں کے لئے چھوڑی ہیں۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پہلے شوہر سے ایک بیٹی حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھیں جو بعد میں اسلام کی نامور ماہر فقہ ٹھہریں۔ حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا چونکہ حبشہ میں پیدا ہوئی تھیں اس لئے حبشہ والوں کی زبان سے بھی واقفیت رکھتی تھیں ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حبشہ میں قیام کے دوران وہاں کے اکثر گرجا گھروں کا مطالعہ کیا تھا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بتاتی تھیں کہ عیسائی کس طرح اپنے گرجا گھروں کو اپنی عیسائی شخصیات کی تصاویر سے سجاتے تھے۔

7. حضرت زینب جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا:

(347) خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ دوسری زوجہ مطہرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھیں جن کا نام زینب تھا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے والد اگرچہ بنیادی طور پر شمالی عرب کے رہائشی تھے مگر بعض ذاتی وجوہات کی وجہ سے مکہ مکرمہ میں ٹھہر گئے تھے۔ انہوں نے پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک پھوپھی اُمیمہ بنت عبدالمطلب سے نکاح کیا تھا۔ جحش کے پورے خاندان نے شروع ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا اور پورا خاندان مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ منتقل ہو گیا تھا۔ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی عمر اس وقت 36 سال تھی مگر یہ واضح نہیں ہے کہ کیا آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کنواری تھیں، بیوہ تھیں یا طلاق یافتہ تھیں۔ رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نئے وجود میں آنے والے اسلامی معاشرہ میں غلاموں کی حالت بہتر بنانے کے خواہش مند تھے اور ہمیشہ کیلئے یہ طے کر دینا چاہتے تھے کہ اسلام میں کسی پیدائشی آزاد فرد اور کسی آزاد شدہ غلام کے مابین کوئی فرق نہیں ہے۔ تعصبات ختم کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ جب تک کاری ضرب نہ لگائی جائے تعصبات کا خاتمہ نہیں ہوتا چنانچہ رسول مکرم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی پھوپھی زاد حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کہا کہ وہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نکاح کر لیں۔ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غلام تھے جنہیں رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آزاد کر کے لے پالک بیٹا بنا لیا تھا مگر حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا خود رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شادی کی آرزومند تھیں اور انہوں نے منت مانی ہوئی تھی کہ اگر اُن کی یہ خواہش پوری ہو گئی تو وہ چھ ماہ تک روزے رکھیں گی۔ فطری طور پر وہ کسی سے اپنی اس خواہش یا منت کا برملا اظہار بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ ان حالات میں وہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے شادی کی تجویز پر خوش نہیں تھیں لیکن نیک اور متقی مسلمان ہونے کے حوالے سے انہوں نے اور ان کے والدین نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تجویز منظور کر لی۔ تاریخ دانوں کے مطابق حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا امیر خاندان سے تعلق رکھنے کے ساتھ ساتھ "زبان کی قدرے تیز" تھیں۔ چنانچہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ان کا تعلق اور ساتھ خوش گواری کے ساتھ نہیں گزرا۔ دونوں میاں بیوی میں اکثر ناخوش گوار صورت حال پیدا ہو جاتی جس پر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی آپس میں مفاہمت کرا دیتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دونوں میاں بیوی کو اعتدال

پسندی کی نصیحت بھی فرماتے۔ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک حبشی خاتون حضرت ام ایمن سے بھی شادی کی ہوئی تھی جو کہ رسول مکرم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی والدہ محترمہ کی خادمہ تھیں۔ ان کے بطن سے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک بیٹا بھی تھا جس کا نام اسامہ تھا۔ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے محبوب خدا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہت محبت کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک دن معمول کے مطابق حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر تشریف لے گئے دراصل میاں بیوی میں جھگڑا ہوا تھا اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نہ صرف یہ کہ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے رویہ کے بارے میں شکایت کی تھی بلکہ یہ ارادہ بھی ظاہر کیا تھا کہ وہ حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو طلاق دے دیں گے۔ سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نرم رویہ اختیار کرنے کی تلقین کی اور پھر میاں بیوی میں صلح و مفاہمت کرانے کے لیے ان کے مکان پر تشریف لے گئے۔ اس وقت حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ گھر پر موجود نہیں تھے۔ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جب گھر کے دروازے پر رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتایا کہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ گھر پر موجود نہیں ہیں تو آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ کہتے ہوئے دروازہ پر ہی سے واپس آ گئے کہ ''اللہ اکبر، وہی دلوں کو پھیرنے والا ہے۔'' تاریخ دان کہتے ہیں کہ اگرچہ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی عمر 36 برس ہو چکی تھی مگر آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا انتہائی خوبصورت تھیں اور زرد رنگ کے لباس میں تو اور ہی خوبصورت لگتی تھیں۔ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بھی دروازہ کے اندر سے رسول رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زبان مبارک سے ادا ہونے والا کلمہ سن لیا اور اپنے شوہر کے گھر آنے پر آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد اور اس جملے کا ذکر کیا۔ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جملے کا مفہوم کچھ اور سمجھا۔ دراصل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مطلب و مفہوم یہ تھا کہ یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی بوڑھی حبشی بیوی کے ساتھ تو خوش گوار زندگی گزار رہے ہیں جبکہ اس خوبصورت خاتون کے ساتھ ان کی نہیں بنتی۔ اپنی بیوی سے یہ جملہ سنتے ہی حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسی لمحے فوراً آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پسند فرمائیں تو میں زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو طلاق دینے کو تیار ہوں۔'' آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ناراض نہ ہونے، نرم رویہ اختیار کرنے اور اعتدال میں رہنے کی نصیحت کی۔ کچھ عرصہ ہی گزرا تھا کہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو طلاق دے دی کیونکہ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے لئے حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ زندگی گزارنا ممکن نہیں رہا تھا۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس صورت حال میں کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس بات کا ازحد افسوس ہوا۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہی حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے شادی کرنے پر آمادہ و مجبور کیا تھا۔ اس لئے اب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی اس کی تلافی کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی عدت کی مدت پوری ہونے کے بعد رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو شادی کا پیغام بھیجا۔ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو اس پیغام سے اس قدر ڈھیروں خوشی ہوئی کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے پیغام لانے والے کو تھوڑی دیر انتظار کرنے کا کہا۔ پھر وہ اپنے کمرے میں تشریف لے گئیں اور وہاں رب تعالیٰ جل شانہٗ کی بارگاہ میں شکرانہ کے نوافل ادا کئے۔ اس کے بعد انہوں نے پیغام لانے والے کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تجویز پر مثبت جواب دیا اور اُسے (خوشخبری لانے پر) قیمتی تحفے بھی دیئے۔ نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس اقدام سے مشرکین کے اس پرانے عقیدہ پر کاری ضرب لگی کہ لے پالک بیٹا حقیقی بیٹے کی طرح ہوتا ہے اور اس نے جس عورت کو طلاق دی ہو اس سے والد شادی نہیں کر سکتا۔ اگرچہ قرآن پاک نے مشرکین کے اس رواج کو ختم کر دیا تھا مگر اس کے مکمل خاتمہ کے لئے کسی عزت و عظمت کی حامل مثال کی ضرورت تھی۔

وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ؕ
ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِى السَّبِيْلَ ۝
اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْۤا اٰبَآءَهُمْ
فَاِخْوَانُكُمْ فِى الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ ؕ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ
اَخْطَاْتُمْ بِهٖ ۙ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

(الاحزاب:5,4)

اور نہ بیٹا (واقعی) منہ بولے بیٹوں کو کیا
یہ تمہارے منہ کی باتیں ہیں (جو چاہا کہہ دیا)
اور خدا حق بات فرماتا ہے (بے چون و چرا)
اور دکھاتا ہے وہی لوگوں کو سیدھا راستا
اور ان لے پالکوں کو تم پکارو (جب کبھی)
تو (حقیقی) باپوں سے منسوب کر کے (واقعی)
(ہاں) یہی انصاف کی ہے بات نزدیکِ خدا
پس اگر تم باپ سے اُن کے نہیں ہو آشنا
تو تمہارے پھر وہ دینی بھائی ہیں اور دوست بھی
بھول ہو جائے تو پھر تم پر نہیں ذمہ کوئی
ہاں ارادہ دل سے ہو (تو یہ گنہ ہے بے گماں)
اور خدا ہے بخشنے والا، نہایت مہرباں

اب یہ بات (خود آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتی مثال سے) مکمل ہوئی۔
اگر چہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شادی تھوڑا عرصہ برقرار رہی لیکن اسلامی معاشرے پر اس کے دوراس اثرات پڑے کیونکہ اس کے بعد معاشرے میں آزاد شدہ غلاموں کو کسی تعصب کا سامنا نہ کرنا پڑا بلکہ انہوں نے اسلامی دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف ریاستوں کی حکمرانی کی۔ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا انتقال 20 ہجری میں ہوا۔

8. حضرت جویریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا:

(348) الحارث کی بیٹی حضرت جویریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اُس قبیلہ بنو المصطلق سے تعلق رکھتی تھیں جو کہ اسلام دشمنی میں بہت نمایاں تھا۔ بنو نضیر کے یہودیوں کو مدینہ سے نکالے جانے پر بنو المصطلق والے اُن کے حامی و اتحادی بن گئے اور ان کی کرایہ کی فوج میں شامل ہو گئے۔ وہ جنگ خندق کے دوران مدینہ منورہ کے محاصرہ میں بھی شرکت کرنے کے خواہش مند تھے۔ سرور کونین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ کے شمال کی جانب دومۃ الجندل کے رہنے والوں کو سزا دینے کیلئے گئے ہوئے تھے کیونکہ وہ خیبر کے یہودیوں کے کہنے پر مدینہ منورہ کی طرف آنے والے رسد کے قافلوں کو جان بوجھ کر ہراساں کرتے تھے۔ درحقیقت دشمنانِ اسلام

کی یہ ایک چال تھی کہ جب محبوب خدا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجاہدینِ اسلام کی تھوڑی سی تعداد کے ہمراہ مدینہ منورہ سے دور انتہائی شمال میں چلے جائیں تو پیچھے سے مدینہ منورہ پر اجتماعی حملہ کر دیا جائے۔ اس سازش میں بنو غطفان، اہلِ مکہ، بنوسُلیم اور دوسرے دشمنانِ اسلام شریک تھے۔ ان کی اس سازش میں یہ بات بھی شامل تھی کہ مدینہ منورہ پر حملہ کے ساتھ ساتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بھی وہیں گھیراؤ کر لیا جائے جب وہ مدینہ منورہ سے دور انتہائی شمال میں پہنچ جائیں کیونکہ اس وقت وہ اپنے ہیڈکوارٹر یعنی مدینہ منورہ سے دور ہوں گے لیکن معلم کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دشمنانِ اسلام کے اس ناپاک منصوبے کا علم اس وقت ہو گیا جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنو غطفان کے علاقہ میں تھے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تیزی کے ساتھ واپس مدینہ منورہ پہنچے اور آتے ہی شہر کے گرد خندق کی کھدائی شروع کرا دی اور دوسرے دفاعی انتظامات بھی فرمانے لگے۔ اسی دوران آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دفاعی اقدام کے طور پر اسلامی فوج کے ایک دستہ کے ساتھ بنو المصطلق پر چھاپہ مارا جو کہ مدینہ منورہ پر حملہ کے لئے لشکر اکٹھا کر رہے تھے۔ بنو المصطلق والے مسلمانوں کے اس اچانک حملہ سے سخت گھبرا گئے اور قبیلہ کے مرد افراتفری میں اِدھر اُدھر فرار ہو گئے کیونکہ انہیں اس قسم کے حملے کی قطعاً توقع نہ تھی۔ اسلامی فوج نے ان کی عورتوں، بچوں اور جانوروں پر قبضہ کر لیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بنو المصطلق کے ساتھ دشمنی میں اضافہ نہیں چاہتے تھے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے دل جیتنا چاہتے تھے۔ اگرچہ قبیلہ کے جنگی قیدیوں کو اسلامی لشکر میں مالِ غنیمت کے طور پر تقسیم کر دیا گیا مگر رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ خواہش تھی کہ اسلامی لشکر کے سپاہی یہ مال غنیمت خود ہی اصل وارثوں کو واپس کر دیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے صرف سفارش کی بجائے کسی بڑے اقدام کی ضرورت تھی چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (اس مقصد کے حصول کے لئے) قبیلہ کے سردار کی نوجوان بیٹی سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔ نتیجتاً اس کے تمام رشتہ دار پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رشتہ دار بن گئے۔ (اس صورت حال میں) اسلامی لشکر نے سارا مال غنیمت واپس کر دیا چنانچہ جب بنو المصطلق کی عورتیں اور بچے رہا ہو کر اپنے گھروں کو لوٹے تو انہوں نے نبیٔ رحمت حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحمدلی اور شفقت ومحبت کی تمام روداد وہاں قبیلہ کے مردوں کو سنائی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بنو المصطلق کے مرد مدینہ منورہ آئے اور دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ بعد ازاں یہ قبیلہ اسلام کا زبردست حامی واتحادی بن کر سامنے آیا۔

حضرت جویریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا انتہائی پرہیزگار اور متقی خاتون تھیں۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روزے رکھتیں اور زیادہ تر وقت نوافل پڑھنے میں گزارتیں۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے لمبی عمر پائی۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا 57 ہجری تک زندہ رہیں۔ حضرت جویریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ اور کارناموں کے حوالے سے کئی روایات کی ہیں۔

9. حضرت اُم حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا:

(349) مکہ مکرمہ کے قبیلہ بنو امیہ سے تعلق رکھنے والی حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، حضرت ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیٹی اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بہن تھیں۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنے شوہر کے ہمراہ ظہور اسلام کے ابتدائی دنوں ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا اور اس قافلے میں شامل تھیں جس نے حبشہ کی جانب ہجرت کی تھی۔ ان دنوں چونکہ اسلام میں شراب پر پابندی ابھی نہیں لگائی گئی تھی اس لئے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا شوہر شراب کا ازحد شوقین تھا۔ حبشہ پہنچنے پر آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا شوہر عیسائیت کی طرف مائل و قائل ہو گیا۔ اس نے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو بھی عیسائیت اپنانے پر مجبور کیا مگر حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے مزاحمت کی اور دین اسلام پر پوری ثابت قدمی اور استقامت کے ساتھ قائم و دائم رہیں۔ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا شوہر جلد ہی ڈوب کر ہلاک ہو گیا۔ رسول مکرم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو (اسلام کے حوالے سے اُن کی ثابت قدمی اور استقامت پر) اعزاز سے نوازنا چاہتے تھے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اپنی شادی کی تجویز دی۔ اُس وقت حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حبشہ میں تھیں چنانچہ شاہ نجاشی نے وہاں شادی کی تقریب کا اہتمام کیا اور پھر دلہن کو تحائف کے ساتھ اسلامی سفیر کے ہمراہ مدینہ منورہ روانہ کر دیا۔ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اپنی شادی سے اس درجہ خوش ہوئیں کہ جب شاہ نجاشی کی ایک کنیز نے انہیں یہ خوشخبری سنائی تو انہوں نے جوش مسرت میں آ کر اپنے کنگن سمیت وہ تمام زیورات و جواہرات جو انہوں نے اس وقت پہنے ہوئے تھے اُتار کر تحفتاً اُس کنیز کو دے دیئے۔ یہ شادی 6 ہجری میں ہوئی۔ جلد ہی صلح حدیبیہ کا معاہدہ ہوا جس کی اہل مکہ نے خلاف ورزی کی۔ ان دنوں ابوسفیان مکہ مکرمہ میں نہیں تھے بلکہ ایک تجارتی قافلے کے ساتھ شام تشریف لے گئے تھے۔ جب وہ مکہ مکرمہ واپس آئے تو انہیں علم ہوا کہ اہل مکہ نے معاہدہ حدیبیہ کی خلاف ورزی کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے چنانچہ وہ فوراً

مدینہ منورہ پہنچے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی بیٹی حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اپنے شوہر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس سلسلہ میں بات کر کے اہل مکہ کے حق میں بہتری کی صورت نکالے تاکہ صلح حدیبیہ کو از سر نو عمل میں لایا جا سکے مگر حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اسلام کو اپنے خاندانی تعلقات اور کسی بھی چیز سے زیادہ اہمیت دیتی تھیں۔ جب ابو سفیان ان سے ملنے کے لئے گئے تو انہوں نے اپنے والد کو اس چٹائی پر بیٹھنے کی اجازت نہ دی جس پر سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف فرما ہوا کرتے تھے۔ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مشرکین مکہ کے لئے کچھ بھی کرنے سے صاف صاف انکار کر دیا اور کہا کہ دو جہاں کے سردار حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی اس کا فیصلہ فرمائیں گے۔ جب ابو سفیان نے نبیٔ مکرم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بات کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خاموشی اختیار کی چنانچہ ابو سفیان یہ معلوم کئے بغیر ہی واپس لوٹ گیا کہ مسلمان اب اہل مکہ سے جنگ کریں گے یا صلح پر قائم رہیں گے۔ (ہم جانتے ہیں کہ سپہ سالار اعظم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ مکرمہ کو کس طرح فتح کیا تھا) حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنی زندگی انتہائی عبادت و ریاضت میں گزاری۔ انہوں نے لمبی عمر پائی اور 59 ہجری میں اس دار فانی سے کوچ کیا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ہادیٔ کون و مکاں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ کے بارے میں معقول تعداد میں انتہائی قابل قدر معلومات (روایات حدیث) فراہم کی ہیں۔

10. حضرت صفیہ بنت حیی رضی اللہ تعالیٰ عنہا:

(350) بنیادی طور پر حضرت صفیہ بنت حیی رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا تعلق یہود سے تھا۔ 7 ہجری میں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فتح خیبر کے موقع پر آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا مال غنیمت میں آئیں۔ سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے شادی کر لی۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا خود بھی آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شادی کی آرزومند تھیں کیونکہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے خواب میں ایسا ہوتے دیکھا تھا۔ اس شادی سے خیبر فتح کرنے والی مسلمان فوج کی مشکلات میں از حد کمی ہوئی۔ معلم کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت صفیہ بنت حیی رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو بتایا کہ انہیں خیبر کے یہودیوں پر حملے کا افسوس ہے۔ مسلمان جنگ کی خواہش ہرگز نہیں رکھتے بلکہ اسلامی مملکت اور اسلام کے دفاع کی خاطر ایسا کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دوسری ازواج

مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنھن نے اس حقیقت کی تصدیق کی ہے کہ حضرت صفیہ بنت حیی رضی اللہ تعالیٰ عنہا انتہائی نیک، متقی اور پرہیزگار تھیں۔ سردار دو جہاں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان میں حضرت صفیہ بنت حیی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دستر خوان کی بہت شہرت تھی۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بہت فیاض تھیں مگر اسراف نہیں کرتی تھیں۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا 50 ہجری تک زندہ رہیں۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بچت کر کے کافی دولت جمع کی ہوئی تھی۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ایک بھتیجا یہودیت ہی پر قائم رہا۔ اسلام نے والدین کے ساتھ حسن سلوک کی جو تلقین کی ہے اور اس رعایت سے (کہ ترکہ میں حصہ دار افراد کے علاوہ دوسروں کے حق میں بھی چاہے وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو وصیت کی جا سکتی ہے) فائدہ اُٹھاتے ہوئے حضرت صفیہ بنت حیی رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنی جائیداد کا تیسرا حصہ اسی یہودی بھتیجے کے نام کر دیا۔ اس پر بعض مسلمانوں نے سخت اعتراض کیا مگر ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے مداخلت کی اور اس بات پر زور دیا کہ حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی وصیت پر عمل کیا جائے چنانچہ ایسا کیا گیا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا یہ اقدام آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی انصاف پسندی کی دلیل ہے حالانکہ سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے درمیان کئی دفعہ تلخ جملوں کا تبادلہ ہو چکا تھا۔ ایک روز حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کسی کام سے حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو یہودن کی بیٹی کہہ کر آواز دی تو اس پر حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو سخت دکھ ہوا اور انہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شکایت کی۔ معلم کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کہا کہ آئندہ اگر ایسا ہوا تو تم یہ جواب دینا کہ "میرے والد اللہ تعالیٰ کے رسول حضرت ہارون علیہ السلام ہیں۔ میرے چچا اللہ تعالیٰ کے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں اور میرے شوہر محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں۔ بتاؤ کیا تم میں ایسی خوبیاں ہیں؟" مگر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو خاموش کرانا آسان نہیں تھا۔ انہوں نے پھر یہودن کی بیٹی کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ "یہ جواب تمہارے ذہن کی پیداوار نہیں ہے۔" تاہم بعد میں دونوں پکی دوست بن گئیں۔ جب حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بستر مرگ پر تھیں تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اُن سے کہا کہ اگر میری کسی بات سے کبھی تمہیں رنج ہوا ہو تو مجھے معاف کر دو۔" حضرت صفیہ بنت حیی رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان تمام ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنھن سے جو اس وقت بقید حیات تھیں معافی طلب کی۔ ام المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بھی کئی احادیث کی روایت کی ہے۔

آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا انتقال 50 ہجری میں ہوا۔

11. حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا:

(351) حضرت میمونہ بنت الحارث رضی اللہ تعالیٰ عنہا نجد کے قبیلہ عامر ابن صعصعہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضرت زینب ام المساکین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی سوتیلی بہن تھیں۔ یہ نو (9) بہنیں تھیں اور سب کی شادی مختلف قبائل کے سرداروں سے ہوئی تھی۔ حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیوگی کی حالت میں مکہ مکرمہ میں رہائش پذیر تھیں۔ جب رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم 7 ہجری میں صلح حدیبیہ کے بعد عمرہ ادا کرنے کی غرض سے وہاں تشریف لے گئے تو ان دنوں حضرت زینب ام المساکین رضی اللہ تعالیٰ عنہا انتقال فرما چکی تھیں۔ ہوسکتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبیلہ عامر ابن صعصعہ اور ان تمام قبائل سے قریبی تعلقات قائم کرنے کے خواہش مند ہوں جن کے سرداروں سے حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی بہنوں کی شادی ہو چکی تھی۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ ان دنوں اہل مکہ سے مسلمانوں کی صلح ہو چکی تھی۔ صلح کے معاہدہ کے مطابق آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ مکرمہ میں صرف 3 دن رہائش رکھ سکتے تھے چنانچہ جب یہ مدت ختم ہوئی تو مشرکین مکہ کا ایک وفد سرور کونین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور مطالبہ کیا کہ معاہدہ پر عمل درآمد کیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشرکین مکہ سے کہا ''اگر میں کچھ دیر اور یہاں قیام کر لوں تو اس سے تمہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں نے ابھی شادی کی ہے اور میں پورے شہر کو دعوت ولیمہ دینا چاہتا ہوں۔'' مگر کفار مکہ نے کہا کہ انہیں دعوت میں کوئی دلچسپی نہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مشرکین مکہ قائل نہ ہوئے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم 1500 مسلح مجاہدوں کی فوج کے ساتھ مکہ مکرمہ پر قابض تھے جبکہ اہل مکہ اپنے گھر بار چھوڑ کر شہر سے باہر نواحی پہاڑیوں اور وادیوں میں جا چکے تھے۔ کوئی اور سپہ سالار ہوتا تو شہر پر مستقل قبضہ کر لیتا اور شہر کے ''سابق'' باشندوں کو واپس اپنے گھروں میں آنے کی اجازت نہ دیتا۔ لیکن یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی تھے کہ جنہیں قرآن الحکیم نے ''رحمۃ للعالمین'' کا لقب عطا کیا ہے۔

[وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۝

(الانبیاء:107)

''رحمتِ عالم بنا کر ہم نے بھیجا ہے تمہیں'']

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انسانیت کے لئے کوئی معمولی مثال قائم نہیں کرنا چاہتے تھے۔ حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا 51 ہجری میں اللہ تبارک وتعالیٰ کو پیاری ہوئیں۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ اور نبوی دور کے حوالے سے کئی احادیث کی روایت کی ہے۔

(352) یہ رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گیارہ ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنھن ہیں۔ دو کا پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا تاہم ایک وقت میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنھن کی تعداد نو (9) سے زیادہ نہیں رہی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتی عادات:

(353) راویوں کا اس پر اتفاق ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جسم اور لباس کی صفائی اور طہارت کا ازحد خیال رکھتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ڈاڑھی رکھی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی (سر مبارک کے) بال بڑھا بھی لیتے تھے مگر بالوں کو انتہائی صاف ستھرا اور کنگھی سے سنوار کر رکھتے تھے۔

(354) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قدرے تیز چلتے تھے حتیٰ کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ قدم ملانے میں دقت ہوتی تھی مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گفتگو انتہائی ٹھہر ٹھہر کر کرتے تھے۔ ایک راوی کے مطابق ''نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس قدر ٹھہر ٹھہر کر بولتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہر لفظ کا ایک ایک حرف آسانی کے ساتھ گِنا جا سکتا تھا۔'' چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منہ سے نکلنے والا ہر لفظ قانون تھا لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سادہ اور باوقار مگر بناوٹ و تصنع سے پاک زبان استعمال کرتے تھے چاہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی فرد سے گفتگو فرما رہے ہوں یا مسلمانوں کے اجتماع سے خطاب فرما رہے ہوں۔

(355) گھر میں رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادات انتہائی سادہ تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے جوتوں کی اپنے ہاتھوں سے مرمت کرتے۔ اپنی بکریوں کا دودھ خود دوہتے اور اس کام کے لئے اپنے خادم کو تکلیف دینا گوارا نہ فرماتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذاتی خادم حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کہنا ہے کہ ''میں نے 10 سال سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں گزارے مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے ایک بار بھی نہیں پوچھا کہ تم نے یہ کام کیوں کیا ہے؟ یا کیوں نہیں کیا؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھ

پر ہمیشہ مہربان رہے"۔

(356) آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ننھے بچوں سے بہت پیار فرماتے تھے جہاں کہیں بچوں کو دیکھتے تو خوش ہو جاتے اور بچوں کو ہنسانے کے لیے ان سے مذاق بھی کرتے۔ فطری طور پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے نواسوں حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی از حد محبت کرتے تھے۔ بعض اوقات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز کے دوران بھی ان میں سے ایک کو اپنے بازوؤں میں اُٹھا لیتے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سجدہ میں جاتے تو نواسے کو پاس کھڑا کر لیتے اور سجدہ سے اُٹھ کر اُسے پھر گود میں اُٹھا لیتے۔ جب دونوں بچے قدرے بڑے ہوئے تو وہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حتیٰ کہ نماز کے دوران اِدھر اُدھر دوڑتے رہتے۔ اور کبھی کبھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ٹانگوں میں سے گزر جاتے۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں وہ کچھ کرنے دیتے جو وہ چاہتے۔

(357) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر ایک سے شفقت و محبت بھرا سلوک کرتے حتیٰ کہ عمر رسیدہ خواتین آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لمبی لمبی اور غیر متعلق باتیں بھی کرتیں مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی بھی اکتاہٹ محسوس نہ کرتے۔ ایک خاتون نے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بازو سے پکڑ کر ٹھہرا لیا اور جانے نہ دیا مگر آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُس سے انتہائی شفقت اور وقار سے پیش آئے۔

(358) دوران سفر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قافلہ کے ہر فرد کے ساتھ رابطہ رکھتے اور بار بار لوگوں کے پاس جاتے تاکہ وہ خوش رہیں۔ ایسے ہی ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ایک وفادار دوست حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گئے جو اپنے بوڑھے اونٹ پر سوار ہو کر جا رہے تھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود پر سنجیدگی طاری کر لی مگر کوئی بھی دیکھنے والا سمجھ سکتا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مزاح فرما رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا:

"کیا تم اپنا اونٹ میرے پاس فروخت کرنا چاہتے ہو؟"

"جی ہاں! مگر ایک شرط ہے کہ میں یہ اونٹ مدینہ منورہ جا کر ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے کروں گا۔"

"اس کی قیمت کیا لو گے؟"

"آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی بتائیے!"

"ایک درہم میں فروخت کرو گے؟"

"اے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ! کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے لوٹنا چاہتے ہیں؟"

"پھر دو درہم لے لو۔"

"ہرگز نہیں۔"

"پھر تین، چار، پانچ.................."

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قیمت بڑھاتے گئے اور آخر کار کہا:

"چالیس درہم"

اس قیمت پر حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ راضی ہو گئے پھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور قافلے میں کسی اور شخص سے ملاقات کے لئے چلے گئے۔ مدینہ منورہ پہنچ کر حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی زوجہ کو تمام ماجرا سنایا اور بتایا کہ سفر کے دوران کس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خوش گوار گفتگو ہوئی تھی۔ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیوی کچھ زیادہ ہی محتاط تھیں۔ اُس نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اصرار کیا کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات کو مزاح نہ سمجھیں بلکہ اونٹ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر لے جائیں۔ جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس بات کی اطلاع ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسکرائے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے خزانچی کو حکم دیا کہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو 40 درہم ادا کر دیئے جائیں جبکہ اونٹ بھی ان کی طرف سے بطور تحفہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دے دیا جائے۔ یہ اونٹ اس کے بعد بھی کئی سال تک حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس رہا۔ جب بھی حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس واقعہ کو یاد فرماتے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یادگار تحفے کو دیکھتے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یاد میں محو ہو جاتے۔

(359) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جانوروں پر بھی بہت مہربان تھے۔ ایک روز ایک جنگی مہم پر جاتے ہوئے راستے میں ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کسی پرندے کے کئی چھوٹے چھوٹے بچوں کو اُن کی ماں سمیت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لایا۔ اُس نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دریافت کرنے پر بتایا کہ "میں نے ان بچوں کو ایک گھونسلے میں دیکھا۔ جب میں قریب پہنچا تو ان کی ماں اُڑ گئی۔ میں نے تمام بچوں کو اپنے رومال میں لپیٹ کر چلا تو

ان کی ماں میرے سر پر منڈلانے لگی۔ میں نے رومال کو زمین پر رکھ کر کھول دیا تو ماں بھی بچوں کے پاس آ گئی۔ چنانچہ میں نے اسے بھی رومال میں ڈھانپ لیا اور اب یہ تمام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے ہیں۔" رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُسے حکم دیا کہ وہ واپس جائے اور اُن سب پرندوں کو ان کے گھونسلے میں چھوڑ آئے۔ ایک اور موقع پر آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلامی فوج کے ہمراہ جاتے ہوئے ایک جنگلی کتیا کو دیکھا جس کے بچے اپنی ماں کا دودھ پی رہے تھے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو وہاں مقرر کر دیا اور اُسے ہدایت دی کہ اسلامی فوج کے کسی سپاہی کو کُتیا کو تنگ نہ کرنے دے اور اس وقت تک وہاں کھڑا رہے جب تک تمام اسلامی فوج وہاں سے گزر نہیں جاتی۔ ایک دن مدینہ منورہ میں ایک اونٹ دوڑتا ہوا آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے گھٹنے ٹیکنا شروع کر دیئے۔ فوراً ہی وہاں چند افراد اس کے پیچھے آ گئے جو اونٹ کو پکڑ کر واپس لے جانا چاہتے تھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دریافت کرنے پر انہوں نے بتایا کہ "یہ اونٹ بہت بوڑھا ہو گیا ہے اور اب کنوئیں سے پانی کھینچنے کے قابل نہیں رہا چنانچہ ہم اسے ذبح کرنا چاہتے ہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اونٹ پر ترس آ گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "اسے چراگاہ میں چھوڑ دو۔ اتنے لمبے عرصے تک تمہاری خدمت کرنے کے بعد اس کا حق بنتا ہے کہ اسے "پنشن" پر ریٹائر کر دیا جائے۔ اونٹ کے مالک اس بات سے متفق ہو کر اونٹ کو واپس لے گئے۔

(360) ایک سفر کے دوران آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چند دوستوں کے ہمراہ تھے۔ انہوں نے صحرا میں سے گزرتے ہوئے ایک گڈریئے سے ایک بھیڑ خریدی۔ ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا "میں اسے ذبح کروں گا" دوسرے نے کہا "میں اس کی کھال اُتاروں گا۔" تیسرے نے اسے پکانے اور کھانا تیار کرنے کی ذمہ داری لی۔ اس طرح سب نے کام سنبھال لیا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "جہاں تک میرا تعلق ہے میں اِدھر اُدھر جاؤں گا اور آگ جلانے کے لئے خشک لکڑیاں جمع کر کے لاؤں گا۔" سب نے کہا "نہیں نہیں! یہ کام بھی ہم ہی کریں گے۔" لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "میں یہ کام ضرور کروں گا۔ یہ مناسب نہیں ہے کہ تم کام کرو اور میں کوئی مدد نہ کروں۔"

(361) سرورِ کونین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مزاح پسند فرماتے تھے اور ہر کوئی اس سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ سردارِ دو جہاں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک صحابی

رضی اللہ تعالیٰ عنہ انتہائی سادہ لوح تھا اور زیادہ خوش شکل نہیں تھا۔ ایک دن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُسے مدینہ منورہ کے بازار میں دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیچھے سے اُس کے پاس جا کر اُسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور قدرے اونچی آواز میں فرمایا "اس غلام کو کون خریدے گا؟" صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پیچھے مڑا تا کہ یہ دیکھے کہ اُسے کس نے بازوؤں میں جکڑا ہوا ہے اور جب اُس نے سرورِ کونین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا تو وہ بہت ہی زیادہ خوش ہوا۔ اُس نے اپنی پشت آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سینے کے ساتھ دباتے ہوئے کہا "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! مجھے فروخت کر کے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کچھ زیادہ رقم نہیں ملے گی۔" پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے چھوڑ دیا اور فرمایا "لیکن رب تعالیٰ جل شانہٗ کی نظروں میں تمہاری قیمت بہت زیادہ ہے۔"

(362) ایک دفعہ ایک اجنبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی خاطر داری اور مہمان نوازی کی اور اُسے رات گزارنے کے لئے بستر لگا دیا۔ وہ کوئی بے وقوف دشمن تھا۔ وہ بستر خراب کر کے صبح سویرے چلا گیا۔ اس طرح وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنی اس دشمنی کا انتقام لینا چاہتا تھا جو اس نے اپنے خیال و تصور میں قائم کی ہوئی تھی۔ کچھ دور جا کر اُسے احساس ہوا کہ وہ اپنی تلوار تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر پر ہی چھوڑ آیا ہے۔ چنانچہ وہ چپکے سے خفیہ طور پر واپس آیا تو اُس نے دیکھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسی بستر کو خود اپنے دست مبارک سے دھو رہے ہیں۔ جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "مہمان" کو دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا "یہ رہی تمہاری تلوار" آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کچھ بھی کہے بغیر اُس کی تلوار اُسے واپس کر دی۔ اکھڑ مزاج بدو پر ہادیٔ کون و مکاں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس اخلاق کا اس قدر اثر ہوا کہ اس نے خلق مجسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معافی مانگی اور کلمہ شہادت پڑھ کر مشرف بہ اسلام ہو گیا۔

(363) ایک روز مسجد میں پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا جو بہت میلا کچیلا تھا۔ اس کی ڈاڑھی الجھی ہوئی تھی اور سر کے بالوں میں کنگھی نہیں کی ہوئی تھی۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے اشارہ کیا کہ وہ باہر جا کر نہا دھو کر صاف ہو کر آئے۔ کچھ دیر بعد وہ حجام کی دکان سے واپس آیا تو رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا

”کسی خوفناک شیطان کی طرح نظر آنے سے کیا یہ بہتر نہیں ہے؟“ ایک اور موقع پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مسلمان کو بہت غربت کی حالت میں دیکھا۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے وغیرہ وغیرہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دریافت کرنے پر اس نے بتایا ”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں کوئی غریب شخص نہیں۔ میں ایک امیر آدمی ہوں مگر میں سب کچھ اللہ تبارک وتعالیٰ کی راہ میں خیرات کرنے کو ترجیح دیتا ہوں اور خود پھٹے پرانے لباس پر گزارا کرتا ہوں۔“ اس پر معلم کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ”یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ رب رحمٰن ورحیم اپنے بندے پر اپنی دی ہوئی نعمتوں کے نشانات دیکھنا پسند فرماتے ہیں۔“

(364) ہادیٔ کون ومکاں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایسی معنی خیز اور روحانی اصلاح کرنے والی باتوں پر صفحات کے صفحات لکھے جا سکتے ہیں۔ تاہم ان چند باتوں سے بھی پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بحیثیت انسان شخصیت اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قابلِ تقلید مثالی معاشرتی رویہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

باب 13

عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا معاشرہ

(365) موجودہ دور کی اقوام درحقیقت پرانے دور کے قبائل تھے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں قبیلہ ازم (قبائلیت) سب سے بڑی حکمران قوت تھی۔ حسب نسب ہی انسان کا شناختی کارڈ، پاسپورٹ اور قانونِ وقت تھا۔ ہر جگہ قبیلہ ہی تسلیم شدہ حقیقت تھی اور فرد اپنے رہائشی علاقے کی بجائے اپنے قبیلے کے ذریعے پہچان رکھتا تھا۔ ان کی سوچ بالکل منطقی تھی کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ زمین انسان کے لیے بنائی گئی ہے مگر انسان زمین کے لیے نہیں وجود میں لایا گیا۔

(366) قبیلوں کی دو قسمیں تھیں ایک ترقی یافتہ آباد قبائل تھے جبکہ دوسرے غیر ترقی یافتہ خانہ بدوش قبائل تھے۔ شروع میں تمام قبیلے خانہ بدوش ہی رہے ہوں گے تاہم جس جس قبیلہ کو ایسا خطۂ زمین میسر آتا گیا جہاں وافر مقدار میں پانی اور مستقل چراگاہیں موجود تھیں اُسے ان بنیادی سہولتوں کی تلاش کے لیے مزید صحرانوردی یا خانہ بدوشی کی ضرورت نہ رہی۔ جن قبائل کو صحرائے عرب میں یہ بنیادی ضرورتیں یعنی وافر پانی اور مستقل چراگاہیں میسر نہ آئیں وہ صحرانوردی یا خانہ بدوشی پر مجبور تھے۔ آباد اور غیر آباد دونوں قسم کے قبیلوں کے پاس مویشیوں کے ریوڑ تھے جن میں عام طور پر مختلف قسم کے اونٹ، بھیڑیں اور بکریاں شامل ہوتی تھیں مگر وادیوں میں آباد قبیلے زیادہ خوشحال تھے۔ ان کے پاس وافر وقت تھا جس میں وہ دوسری چیزوں کے ساتھ ساتھ کھجور کے درخت اور اناج اُگاتے تھے۔

(367) مختلف قبائل کا طرز زندگی مختلف تھا اور یہ بھی ضروری نہیں کہ سارا قبیلہ ہی آباد ہو یا سارا قبیلہ ہی غیر آباد یعنی صحرانورد اور خانہ بدوش ہو (یعنی ایک ہی قبیلہ کے بعض خاندان تو آباد تھے اور بعض خانہ بدوش یا غیر آباد)۔ میں خود 1946ء میں یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مشہور مکی قبیلہ قریش آج بھی مکہ مکرمہ کے نواح میں خانہ بدوش ہے اور بدوی زندگی گزار رہا ہے (شہری یا آباد قبیلہ کو ''حضری'' جبکہ خانہ بدوش کو ''بدوی'' یا ''اعرابی'' بھی کہا جاتا تھا) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ممتاز مؤرخ البلاذری نے اپنی کتاب ''الانساب الاشراف'' میں بنو قریش کی جو دو اقسام ''قریش البطاء'' (وہ قریش جو وادیوں میں آباد ہو گئے

تھے) اور ''قریش الظواہر'' (خانہ بدوش یا صحرانورد قریش) بیان کی ہیں وہ بالکل صحیح ہیں۔

(368) کوئی بھی قبیلہ چاہے وہ آباد ہو یا خانہ بدوش، ایک ہی جدامجد کے افراد پر مشتمل نہیں ہوتا تھا۔ ان میں غلام، لونڈیاں اور دوسرے قبائل کی وہ لڑکیاں بھی شامل ہوتی تھیں جن سے شادی کی جاتی تھی۔ ان فطری ''اجنبیوں'' کے ساتھ ساتھ کچھ اور لوگ بھی قبائل میں آ کر رہائش اختیار کر لیتے تھے۔ عرب فطرتاً مہمان نواز ہیں چنانچہ کوئی خوددار عرب اپنے مہمان کو یا کسی ایسے فرد کو جس کو اُس نے پناہ دی ہو اُس کے دشمنوں کے حوالے کرنے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ ''سیاسی پناہ'' تمام صحرائے عرب میں ایک مقدس و معزز اقدام تھا جسے واپس نہیں لیا جا سکتا تھا اور ایک شخص دوسرے کی عزت بچانے کے لیے رضا کارانہ طور پر اپنی جان قربان کر دیتا تھا۔ اس طرح بہت سے ''غیر ملکی'' بھی اپنے دشمنوں سے بچنے کے لیے کسی قبیلہ میں سیاسی پناہ لے لیتے تھے اور پھر اسی قبیلے کے ہی ہو کر رہ جاتے تھے۔ یہ پناہ گزیں، اتحادی و حلیف یا قبیلہ کی پناہ میں آنے والے دوسرے لوگ ہر قبیلہ میں، خواہ وہ آباد ہو یا خانہ بدوش، پائے جاتے تھے۔ وہ اپنے میزبان قبیلہ میں شادی بھی کر سکتے تھے اور یوں بتدریج اس قبیلہ کا جزو بن جاتے تھے۔ مکہ اور طائف میں ایسا ہونے کے ساتھ ساتھ مدینہ میں بھی یہی صورت حال تھی۔

(369) ایک تجسس آمیز عمل یہ تھا کہ مدینہ منورہ جو کہ صحرائے عرب کے شمال میں واقع ہے کے باشندوں کی اکثریت کا تعلق جنوبی عرب سے تھا اور وہ یمنی النسل تھے جبکہ مکہ اور طائف میں آباد قبائل اپنے آباء واجداد کا تعلق شمالی عرب سے جوڑتے تھے۔ اگرچہ شمالی اور جنوبی عرب کے ان باسیوں کے مابین تعصبات موجود تھے مگر وہ سب ایک ہی زبان عربی بولتے تھے۔ مزید یہ کہ دونوں فریقوں میں آپس میں شادی اور رشتہ داری عام تھی جن کی وجہ سے قبائلی رنجشوں اور رقابتوں میں کمی واقع ہو رہی تھی۔

(370) صحرائے عرب میں مقامی بولیاں بھی تھیں اور تلفظ کا اختلاف بھی تھا۔ چونکہ عام عرب اَن پڑھ تھے لہٰذا ظہور اسلام سے پہلے کی دستاویزات دستیاب نہیں البتہ اس دور کی بعض عبارتیں پتھروں پر کھدی ہوئی ملتی ہیں۔ ظہور اسلام کے بعد کے تاریخ دانوں نے قبل از اسلام کی بعض نادر و نایاب تحریریں فراہم کی ہیں جو کہ قدرے ناقابل فہم ہیں۔ ایک بات کا مجھے یقین ہے کہ عظیم شاعر امراۃ القیس جس نے بازنطینی شہنشاہ جسٹنین کے پاس پناہ حاصل کر رکھی تھی اور جس کا انتقال انقرہ میں ہوا تھا اس زبان سے ناواقف و ناآشنا تھا (ایک روایت کے مطابق شہنشاہ جسٹنین کی لڑکی امراۃ القیس پر عاشق ہو گئی تھی۔ شہنشاہ اس بات سے سخت ناراض ہوا اور

اُس نے امراۃ القیس کو انقرہ میں قتل کرا دیا) جو کہ سبعہ معلقاتِ کعبہ میں استعمال کی گئی تھی۔(سبعہ معلقات وہ سات قصیدے تھے جو کعبہ میں لٹکائے گئے تھے جن کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ امراۃ القیس نے لکھے تھے) امراۃ القیس یمن کے علاقہ کندہ کے بادشاہ کا بیٹا تھا۔ کندہ پر جب حبشہ والوں نے حملہ کر کے قبضہ کر لیا تو امراۃ القیس فرار ہو کر انقرہ پہنچ گیا۔ یمن کے گورنر ابرہہ نے جو شاہِ حبشہ کا ماتحت تھا مارب کے ڈیم پر ایک تحریر چھوڑی ہے جو یمنی زبان میں ہے حبشہ کی زبان میں نہیں۔ اب یہ شائع بھی ہو چکی ہے۔ یہ تحریر غیر ملکی زبان میں ہے اور اس عربی میں نہیں جو سبعہ معلقات میں استعمال کی گئی ہے۔

(371) عربوں میں تمام فطری چیزیں موجود تھیں یعنی شاعری، ضرب الامثال، لوک کہانیاں، مقامی تاریخ کے زبانی بیان کردہ واقعات وغیرہ۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ظہور اسلام سے پہلے گرائمر اور شعروں میں ردیف و قافیہ مکمل طور پر ترقی یافتہ شکل میں موجود تھے اور گزشتہ 1400 سال میں ان میں عملی طور پر کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ قرآن الحکیم نے عربی زبان، گرائمر، ہجوں اور تلفظ کو ایک معیار اور وقار بخشا۔ قرآن پاک کی زبان بالکل ویسی ہے جیسی ہم عربی اخبارات و رسائل میں پڑھتے ہیں یا ریڈیو کی نشریات میں سنتے ہیں۔ یہ بات بڑی اہم ہے کہ عربی جاننے والا ہر شخص قرآن الحکیم کی زبان سمجھ سکتا ہے اور دوسری قدیم یا جدید زبانوں، یونانی، عبرانی، سنسکرت اور انگریزی وغیرہ کی کتابوں کی طرح قرآن الحکیم کے معانی اور وضاحت کے لیے کسی مفروضے یا قیاس کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ظاہر ہے ایک ابدی دین اور ایک ایسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کے لیے کہ جس کے بعد کوئی اور نبی پیدا نہیں ہو گا ایسی ہی ابدی اور مستقل زبان چاہیے تھی۔

معاشرتی معاملات:

(372) کسی تربیتی اسکول کی غیر موجودگی میں خاندان کی بڑی بوڑھیاں ہی ضرورت کے وقت دایہ کا کام سرانجام دیتی تھیں اور یہ فرض بہتر اور احسن طور پر ادا کرتی تھیں۔ جونہی بچے کی پیدائش ہوتی تو گھر کا کوئی مرد حتیٰ کہ بعض اوقات خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامہ کہتے (ان دونوں میں توحید و رسالت کے اعلان کے ساتھ ساتھ دونوں جہانوں میں فلاح کے لیے اللہ تبارک و تعالیٰ کی عبادت کی تلقین کی گئی ہے) اس طرح پہلی آواز جو نئے پیدا ہونے والے بچے کے کان میں پڑتی تھی وہ یہی اچھا مشورہ ہوتا تھا ممکن ہے یہ رسم زمانہ جاہلیت کی کسی اسی قسم کی رسم کی اصلاح شدہ شکل ہو لیکن اس

ضمن میں کوئی معلومات میسر نہیں ہیں۔

(373) مدینہ منورہ میں نئے پیدا ہونے والے بچے کو ماں کے دودھ پلانے سے پہلے کھجور چبا کر دی جاتی تھی اور کبھی شہد بھی چٹایا جاتا تھا۔

(374) نئے پیدا ہونے والے بچے کا نام رکھنے کے لیے ایک مختصری تقریب منعقد کی جاتی تھی۔ اس موقع پر رکھا گیا نام بعد میں تبدیل کیا جا سکتا تھا یا اس میں کئی لفظوں کا اضافہ بھی کیا جا سکتا تھا۔ دراصل عرب لڑکے یا لڑکی کو اس کے والد کے نام پر پکارا جاتا تھا مثلاً ''اے فلاں کے بیٹے'' یا ''او فلاں کی بیٹی''۔ بچے کا اصل نام بمشکل ہی کبھی استعمال کیا جاتا تھا۔ مزید یہ کہ عربوں میں کنیت کا رواج تھا مثلاً ''اے فلاں کے والد'' یا ''اے فلاں کی والدہ''۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ شادی کے بعد یا اولاد کی پیدائش کے بعد ہی کسی کو فلاں کا باپ یا فلاں کی ماں کہہ کر پکارا جائے بلکہ ابتدائی عمر ہی میں بچوں کو بھی اسی طرح پکارا جاتا تھا۔ عموماً کنیت پہلے بیٹے کے نام سے رواج پاتی تھی۔ لڑکی کے نام پر کنیت کہیں کہیں تھی۔ مثال کے طور پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ابوحفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہہ کر پکارا جاتا تھا (حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ان کی بیٹی تھیں جو رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ مطہرہ تھیں) اگرچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لڑکے بھی تھے مگر ان کی کنیت اُن کی فضیلت والی بیٹی کے نام پر رواج پائی۔ بعض کنیتیں فرضی بھی تھیں مثلاً حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ابوتراب (مٹی کا باپ) کی کنیت خود سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے عنایت ہوئی تھی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دن حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو زمین پر سوتے دیکھا۔ ان کے بدن پر مٹی لگی ہوئی تھی۔ اس پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں ''ابو تراب'' کہہ کر پکارا تھا۔ اسی طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک صحابی کو ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ (چھوٹی بلی کا باپ) کہا جاتا تھا۔ روایت ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک دن جنگل سے ایک چھوٹی سی بلی پکڑ لائے۔ ان کے اہل خاندان، دوستوں اور ملنے والے انہیں ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہہ کر بہت خوش ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ خود انہوں نے اپنے اصلی نام کی بجائے اپنے آپ کو ابو ہریرہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کہنا شروع کر دیا (حالانکہ ان کا اصلی نام حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور کنیت ابو عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھی) اگر کسی کو کسی دوسرے شخص کے باپ کا نام معلوم نہ ہوتا تو وہ اُسے بلانے کے لیے اس کے قبیلہ کا نام استعمال کرتا مثلاً ''اے قریش کے بیٹے'' یا ''اے قریش کی بیٹی'' یا حتیٰ کہ ''اے قریش کے بھائی'' یا ''اے

قریش کی بہن'' کہہ کر بھی پکارا جاتا تھا۔ اس کا یہ مفہوم ہرگز نہیں تھا کہ جس کو پکارا جارہا ہے وہ اس قبیلہ کے جدامجد کا کوئی حقیقی بھائی یا بہن ہے۔

(375) عرب میں بچوں کے نام محض خیالی یا مادی چیزوں کے ناموں پر بھی رکھے جاتے تھے۔ ظہور اسلام کے بعد بھی اگر چہ اس رواج میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی تاہم کچھ نام دینی بنیادوں پر ترک کر دیئے گئے۔ ظاہر ہے اسلام میں عبدالشمس (سورج کا بندہ)، عبدالکعبہ (کعبہ کا بندہ)، عبدالجن (جن کا بندہ) جیسے نام ناقابل برداشت تھے حتیٰ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا بندہ یعنی ''عبدالمحمد'' جیسا نام رکھنے کی بھی اجازت نہیں دی جاسکتی تھی وغیرہ۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ناموں میں معاشرتی اور جمالیاتی (خوبصورتی، اوصاف) بنیادوں پر تبدیلی کی سفارش کی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے پیروکاروں کو ظالم، غاوی (گمراہ) کلب (کتا) وغیرہ نام جوان دنوں عام تھے رکھنے پر سختی سے منع فرمادیا تھا۔ (آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی بنیاد پر بعض علاقوں کے نام بھی تبدیل فرمادیے تھے) درختوں، پتھروں اور جنگلی جانوروں کے نام پر رکھے جانے والے نام البتہ جاری رہے جو ظہور اسلام سے پہلے بھی رائج تھے مثلاً طلحہ، سمورہ، عوسجہ، ثمامہ اور ہرملہ مختلف پودوں کے نام ہیں جبکہ اسد، بکر، ثعلبہ اور ارقم جانوروں کے نام ہیں اور حجر کے معنی ہیں پتھر۔

عقیقہ:

(376) بچے کی پیدائش کے چند روز یا چند ہفتے بعد ایک خاندانی تقریب منعقد کی جاتی جس میں بچے کے سر کے بال پہلی بار کٹوائے جاتے۔ اس موقع پر ایک بھیڑ ذبح کی جاتی۔ اس کا کچھ گوشت تو مستحق افراد میں تقسیم کر دیا جاتا جب کہ باقی گوشت سے دعوت کی جاتی۔ بچے کے بالوں کے برابر چاندی (کبھی کبھار سونا) خیرات کی جاتی۔ ظہور اسلام سے پہلے اس موقع پر ذبح کیے جانے والے جانور کا خون بچے کے سر پر ملا جاتا تھا مگر اسلام نے ایسا کرنے سے منع کر دیا تاہم اس کے متبادل کے طور پر بچے کے سر پر کوئی خوشبو خاص طور پر زعفران کا پانی مل دیا جاتا (ابوداؤد، مالک)

(377) بچوں کی ایک اور رسم ختنہ ہے جو صرف لڑکوں کے لیے ہے اس رسم کی ادائیگی کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں تاہم یہ رسم اول عمر ہی میں ادا کی جاتی ہے جب بچے کو ابھی ننگے پن کا احساس نہیں ہوتا۔ انجیل کے مطابق یہ رسم حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رب تعالیٰ جل شانہٗ کی

اطاعت ورضا کے معاہدہ کی علامت کے طور پر شروع کی تھی۔ مگر اسلام تو کیا اسلام سے پہلے کی عربی لوک کہانیوں میں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اسے صحت وصفائی کے حوالے سے ایک اقدام خیال کیا جاتا ہے۔

(378) اسلامی عہد میں بعض دوسری رسمیں بھی موجود تھیں مثلاً جب بچہ لکھنا پڑھنا شروع کرتا یا پہلی بار قرآن پاک ختم کرتا یا پہلی دفعہ روزہ رکھتا اور اسی طرح کے دوسرے موقعوں پر خاندان میں خوشی کی تقریب کا انعقاد کیا جاتا (فطری طور پر ختم قرآن الحکیم کی تقریب خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کے بعد ہی شروع ہوئی ہو گی کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ میں قرآن پاک کا نزول آخر وقت تک جاری رہا)۔

(379) شادی نہ صرف شادی والے خاندان بلکہ معاشرہ کے لیے بھی سب سے اہم تقریب ہوتی ہے۔ اسلام سے پہلے کے دور میں عرب میں شادی کی خوشیوں بھری تقریب منائی جاتی تھی۔ ظہور اسلام کے بعد بھی یہ تقریب بدوؤں اور شہری خاندانوں میں اسی طرح رائج رہی۔ اس حوالے سے خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ سے بعض واقعات بیان کئے جا سکتے ہیں۔ ایک روز طائف سے ہجرت کر کے آنے والے ایک مسلمان حضرت المغیرہ ابن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتایا کہ وہ مدینہ منورہ کی ایک لڑکی سے شادی کی خواہش رکھتے ہیں۔ رسول رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا ''کیا تم نے لڑکی کو دیکھ رکھا ہے؟'' حضرت المغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا ''جی نہیں! یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''شادی سے پہلے لڑکی کو دیکھ لو کیونکہ یہ اس سے بہتر ہے کہ بعد میں پچھتایا جائے۔'' سرور کونین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک اور صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خود اپنا واقعہ بیان کیا ہے۔ اُس صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک لڑکی کو علم ہوئے بغیر چوری چھپے اُسے دیکھ لیا اور پھر اسے شادی کی پیش کش کی۔

(380) مدینہ منورہ میں پیشہ ور گلوکارائیں (شاید لونڈیاں) موجود تھیں جو دف اور جھانجھ بھی بجاتی تھیں۔ ایک روز ایک گلوکارہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آتے دیکھ لیا تو اس نے وہ نظم جو وہ کسی جنگ کے سپاہیوں کے بارے میں گا رہی تھی چھوڑ دی اور کہنے لگی ''اور ہم میں ایک پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم موجود ہیں جو بتا سکتے ہیں کہ کل کیا ہو گا۔'' اس پر رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس سے کہا ''تم وہی گاؤ جو پہلے گا رہی تھی۔'' روایت ہے کہ جب دلہن دلہا کے گھر جاتی تھی تو اس وقت رات کو مشعل بردار جلوس نکالا جاتا تھا۔ ایک دن سرور کونین صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زوجہ محترمہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو بتایا "میں تمہارے عم زاد کی شادی میں شریک ہوا مگر وہاں موسیقی نہیں تھی کیا وجہ تھی؟ مدینہ منورہ کے لوگ تو موسیقی پسند کرتے ہیں!"

(381) یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ دلہنوں کا میک اپ کیا جاتا تھا اور بڑے محتاط انداز میں ان پر نقش و نگار بنائے جاتے تھے (ہاتھوں اور پاؤں پر) اور انہیں بہت اچھی طرح خوشبو لگائی جاتی تھی۔ میں نہیں جانتا کہ دارِم کا پودا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں مکہ مکرمہ یا مدینہ منورہ میں پہلے ہی سے متعارف ہو چکا تھا یا نہیں۔ ماہر نباتیات الدینوری کے زمانے میں خواتین اپنے ہونٹوں کو سرخ کرنے کیلئے دارِم کی ٹہنیوں سے بنی ہوئی مسواک استعمال کرتی تھیں چنانچہ کتابوں میں کئی عشقیہ نظموں میں دارِم سے سرخ کیے گئے لبوں کی تعریف میں اشعار ملتے ہیں۔ دولہوں کو بھی سنوارا جاتا تھا اور انہیں بھڑکیلے رنگوں کا لباس پہنایا جاتا تھا۔ بہت سے لوگ، رشتہ دار، دوست اور دوسرے لوگ شادی میں شریک ہوتے اور شادی کے بعد دعوت ولیمہ میں بھی شرکت کرتے۔ شادی عموماً دلہن کے گھر میں ہوتی۔ اس تقریب کے حوالے سے مسجد کا ذکر کہیں کہیں ملتا ہے۔ اگرچہ دلہن شادی کے وقت سامنے نہیں آتی تھی مگر اس کے قریبی رشتہ دار یعنی والد، چچا، ماموں یا بھائی وغیرہ اس کی رضامندی حاصل کرتے تھے۔ اس موقع پر نکاح خواں خطبہ پڑھتا تھا۔ وہ دلہن اور اس کے خاندان کی نمائندگی کرنے والے افراد کی رضامندی بھی حاصل کرتا۔ وہ دولہا کی رضامندی بھی حاصل کرتا۔ اس موقع پر کم از کم دو گواہوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس بات کی کوئی معلومات نہیں ملتیں کہ کیا اُن دنوں مدینہ منورہ میں شادی کی کوئی تحریری دستاویز تیار کی جاتی تھی! محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کی شادی کے لیے مہر ضروری قرار دے دیا تھا جو صرف اور صرف دلہن کا حق ہوتا تھا۔ چونکہ اسلام میں بیوی کی جائیداد علیحدہ رہتی ہے اور شوہر کا اس پر کوئی حق نہیں ہوتا لہٰذا مہر کسی حد تک بلا جواز طلاق کی راہ میں ایک رکاوٹ ضرور بنتا ہے۔ نکاح خواں کی طرف سے نکاح کی تکمیل اور نئے جوڑے کے لیے دعائے خیر کے بغیر دولہا کے اوپر اور آس پاس چھوہارے، مصری کی ڈلیاں اور اسی طرح کی دوسری چیزیں پھینکی جاتی تھیں۔ ایک مرتبہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موجودگی میں جب چھوہارے وغیرہ پھینکے گئے تو بعض لوگوں نے انہیں "لوٹنے" میں حصہ نہ لیا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود ایسا کر کے اس پُرمسرت تقریب کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شادی کے بعد دلہن کے شوہر کے گھر پہنچنے کے بعد عموماً اگلی صبح کو دولہا کی طرف سے دعوتِ ولیمہ کی پُرزور سفارش کی ہے۔

(382) بچے کی پیدائش فطری طور پر خوشیوں بھری تقریب کا موقع فراہم کرتی ہے۔ اس موقع پر بچے کو لڑکا یا لڑکی ہونے کی بنیاد پر کھلونے تحفتاً دیئے جاتے ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی جب شادی ہوئی اور آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر تشریف لائیں تو اپنے کھلونے بھی ساتھ لائیں۔ ان میں پروں والے گھوڑے بھی تھے۔ جب بھی لڑکیاں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ملنے کیلئے آتیں تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اُن کو یہ گھوڑے دکھاتیں۔ ایک دفعہ رسول مکرم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو یہ گھوڑے لڑکیوں کو دکھاتے ہوئے دیکھ لیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا "عائشہ! یہ بتاؤ کہ کون سے گھوڑوں کے پر ہوتے ہیں؟" حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فوراً جواب دیا "حضرت سلیمان علیہ السلام کے گھوڑوں کے پر ہوتے ہیں۔" شاید مٹی سے چیزیں بنانے کی صنعت اس دور سے بھی پہلے موجود تھی۔ لڑکوں کو تحفتاً چھوٹی چھوٹی کمانیں اور تیر دیئے جاتے تھے۔ مدینہ میں کرک کا ذکر ملتا ہے جو ایک قسم کا گیند تھا اور کپڑے کے ٹکڑوں وغیرہ سے تیار کیا جاتا تھا۔ اس دور کا ایک مقبول کھیل درکالہ تھا جو نیزوں کی مدد سے کھیلا جاتا تھا۔ کشتی، پیراکی، مردوں کی دوڑ، گھڑ دوڑ، اونٹوں اور شاید گدھوں کی دوڑ بھی اس دور کے مشہور و مقبول کھیل تھے۔ عیدوں کے موقع پر حبشی لڑکے نیزے پکڑ کر جو ناچ کرتے تھے وہ اس قدر مقبول تھا کہ ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنھن بھی دیکھا کرتی تھیں۔

(383) آنخضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کھانے میں ثرید بہت پسند تھا جو شاید روٹی کو گوشت اور سوپ میں اُبال کر بنایا جاتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھنا ہوا گوشت بھی شوق سے نوش فرماتے تھے۔ اس دور کے کھانوں میں شترمرغ کے انڈوں کا بھی تذکرہ ملتا ہے جو جنگل میں ملتے تھے۔ ساحل سمندر پر آباد لوگ مچھلی بھی کھاتے تھے مگر مدینہ منورہ میں صرف خشک مچھلی ملتی تھی۔ تازہ مچھلی نہیں ملتی تھی۔ اسی طرح خشک گوشت بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ قربانی کے موقع پر اگر مکمل گوشت استعمال نہ ہو پاتا تو باقی گوشت کو دھوپ میں خشک کر لیا جاتا تھا اور یوں وہ کافی مدت تک قابل استعمال ہو جاتا تھا۔ آنخضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سرکہ بھی پسند فرماتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زیتون اور پنیر بھی استعمال کرتے تھے۔

(384) ظہور اسلام سے پہلے عربوں میں رواج تھا کہ وہاں کے عمر رسیدہ لوگ بالوں کو رنگتے تھے۔ یمن کی زرخیز زمین میں ایک طرح کا سیاہ رنگ پیدا ہوتا تھا جو آنخضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے دادا حضرت عبدالمطلب کی زندگی میں بھی استعمال ہوتا تھا۔ایک پودے کُتم کے پتوں سے سرخ رنگ پیدا ہوتا تھا۔خواتین حنا سے اپنی انگلیوں کو پینٹ کرتی تھیں۔انگوٹھیاں، بازو بند، نکلس (ہار) بُندے اور کئی دوسرے زیورات خواتین استعمال کرتی تھیں۔

(385) مدینہ میں ایک ریس کورس (گھڑ دوڑ کا میدان) بھی تھا جہاں عموماً باہر سے آنے والے قافلے ٹھہرتے تھے جس مقام پر بیٹھ کر آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھڑ دوڑ دیکھا کرتے تھے اس جگہ اب مسجد السباق (دوڑوں والی مسجد) موجود ہے۔

(386) عرب کے سالانہ میلے صرف تجارتی منڈیوں تک محدود نہ تھے بلکہ ان میں عوامی دلچسپی کے بھی کئی پہلو تھے۔مکہ مکرمہ کے قریب عکاظ کا جو میلہ لگتا تھا وہ خصوصاً پورے عرب میں مشہور و معروف تھا۔اس میلہ میں عظیم شعراء شرکت کرتے تھے جو اپنی برجستہ اور فی البدیہہ نظموں سے سامعین کو لطف اندوز کرتے تھے۔شعلہ بیاں مقرر اپنے زبان و بیان سے حاضرین سے داد وصول کرتے تھے۔اس میلہ میں اس دور کی ''بین الاقوامی عدالت انصاف'' کا اجلاس بھی ہوتا تھا جس میں غیر جانبدارانہ فیصلوں کے لیے دُور دُور سے لوگ آکر اپنے مقدمات پیش کرتے تھے۔کاہن اور نجومی لوگوں کو قسمت کا حال بتا کر پیسہ کماتے تھے۔وہ دوسروں کے مستقبل کا حال بتاتے تھے اگرچہ انہیں اپنی قسمت اور اپنے مستقبل کا قطعی کوئی علم نہیں ہوتا تھا۔

(387) موت کے موقع پر بھی بعض رسمیں ادا کی جاتی تھیں۔اس روز لوگ ہمیشہ کے لیے جدا ہونے والے رشتہ دار یا دوست کو عقیدت کے آخری کلمات پیش کرتے تھے۔میت کو کئی بار انتہائی احتیاط کے ساتھ غسل دیا جاتا تھا۔کپڑے کے کئی ٹکڑوں پر مشتمل کفن پہنایا جاتا تھا اور پھر نماز جنازہ پڑھی جاتی تھی۔اگر مرنے والے پر قرضوں کا بوجھ ہوتا اور اس کے ترکہ سے اس کے زیادہ قرضے نہ اتارے جاسکتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسے شخص کی نماز جنازہ نہیں پڑھاتے تھے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر مسلمان کی چاہے وہ مرد ہو یا عورت نماز جنازہ خود پڑھایا کرتے تھے۔نماز جنازہ کے بعد میت زمین میں دفن کردی جاتی اور اوپر مٹی ڈال دی جاتی۔اس کے بعد قبر پر دعا مانگی جاتی جس میں مرنے والے کو تلقین کی جاتی کہ اسے دوسری دنیا میں نئی زندگی کا سامنا کرنا ہوگا۔مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق جیسے ہی مسلمان کو مرنے کے بعد قبر میں دفن کیا جاتا ہے تو دو فرشتے (منکر نکیر) قبر میں آتے ہیں اور مرنے والے سے مذہب اور یوم حشر کے بارے میں سوالات کرتے ہیں۔پس مرنے والے کو تلقین کی جاتی ہے کہ وہ ان فرشتوں کو بتائے کہ اللہ وحدہٗ لاشریک اس کے معبود ہیں۔محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے

رسول ہیں۔ قرآن اس کی کتاب ہے۔ کعبہ اس کی نماز کی سمت ہے۔ وہ یوم حساب پر یقین رکھتا ہے۔ وہ دوزخ اور جنت پر بھی ایمان رکھتا ہے وغیرہ۔

(388) مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے قبرستانوں میں چند سال بعد قبریں ہموار کر دی جاتی ہیں اور پھر انہی جگہوں پر لوگ تدفین کرتے ہیں۔ اس طرح قبرستان زیادہ وسیع نہیں ہونے پاتے۔ گزشتہ 14 صدیوں سے ان دونوں متبرک و مقدس شہروں میں صرف ایک ایک ہی قبرستان ہے۔ جب سے کعبۃ اللہ کو مسلمانوں کے لیے نماز کی سمت ٹھہرایا گیا ہے دنیا بھر میں مسلمان اپنے مُردوں کو بائیں شانے کی جانب سے ذرا بلند کر کے قبر میں رکھتے ہیں تاکہ مردہ کا رُخ قبلہ کی طرف رہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف ممالک میں قبروں کی سمت مختلف ہے۔ مدینہ منورہ کے قبرستان میں قبر مشرق سے مغرب کی جانب کھودی جاتی ہے کیونکہ یہاں کعبۃ اللہ جنوب میں ہے لیکن اسی قبرستان میں چند پرانی قبریں ایسی بھی موجود ہیں جو شمالاً جنوباً ہیں اور پہلی صدی ہجری کے ابتدائی ایام کی ہیں جب کعبۃ اللہ کو نماز کی سمت متعین نہیں کیا گیا تھا۔

(389) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تجویز و تلقین کے مطابق مرنے والے کے خاندان کے افراد کو ایک یا دو روز تک اس کے ہمسائے (رشتہ دار وغیرہ) کھانا دیتے ہیں۔ اس دور میں مُردے پر رونے کے لیے پیشہ ور ماتمی خواتین مل جایا کرتی تھیں۔ معلم کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان پیشہ ور ماتمی خواتین کی اتنی زیادہ حوصلہ شکنی کرتے تھے جس قدر زیادہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کر سکتے تھے۔

معاشرے کی خصوصیات:

(390) یہ معاشرہ کسی بھی دوسرے انسانی معاشرہ ہی کی طرح تھا جس میں اچھے اور بُرے لوگ موجود تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس دور میں بھی جرائم یعنی قتل، قانون کی خلاف ورزی اور چوری وغیرہ بھی تھے۔ چاہے ان کی تعداد کتنی ہی کم کیوں نہ ہو اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ معاشرہ بھی عام انسانوں کا معاشرہ تھا اور اس میں صرف فرشتے یا محض شیطان نہیں رہتے تھے۔ جو قابل ذکر بات ہے وہ یہ کہ ہر شخص کے ذہن میں یہ نقش تھا کہ وہ نیکی کو نیکی اور برائی کو برائی سمجھے۔ کوئی شخص اپنے گناہوں اور جرموں پر فخر نہیں کرتا تھا۔ معاشرہ اور عوامی رائے کا دباؤ ہر شخص کو اچھے عمل کی تعظیم پر مجبور کرتا تھا۔ پولیس کا کوئی وجود نہیں تھا مگر لوگ از خود پیش ہو کر ایسے جرموں کا بھی اعتراف کرتے تھے جن کی سزا موت ہوتی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ دنیا میں جرم کی سزا

برداشت کرنا آخرت کی سزا سے بہتر ہے۔

(391) شراب بالکل نہیں تھی۔ لوگوں کے گھروں میں اور بازاروں میں امن وسکون تھا۔ انسان جانتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے اور نشے میں جنگلی درندوں کی سطح تک کبھی نہیں گرتا تھا۔ سور کا گوشت نہیں کھایا جاتا تھا۔ نتیجتاً معاشرہ میں بے حیائی موجود نہیں تھی۔

(392) جواء نہیں کھیلا جاتا تھا اور نہ ہی کسی قسم کے سود کا وجود تھا۔ سود لینا اور دینا دونوں حرام تھے۔ بلاسود قرض حاصل کرنا آسان نہیں ہوتا۔ مسلمانوں کے لیے غیر مسلم سود خوروں کو سود کی ادائیگی کی ممانعت تھی چنانچہ مسلمان اپنے اخراجات قابو میں رکھتے تھے۔ سود کو حرام قرار دینے والے دانش مندانہ قانون نے سب سے پہلے ان چند انسان دشمن سود خوروں کا خاتمہ کر دیا جو سود کے ذریعے لوگوں کا خون چوس رہے تھے اور یوں بددیانتی کی کمائی کر رہے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ جوئے اور سود کے ذریعے لوگ بہت تیزی کے ساتھ دولت مند بن جاتے تھے۔ مسلمانوں کو اس امکان سے تو محروم کر دیا گیا تھا مگر اس سے مسلمانوں کی قرضوں میں جکڑے جانے کی رفتار بہت کم ہو گئی تھی۔ چنانچہ مسلمان اپنے وسائل کے اندر ہی رہتے ہوئے زندگی گزارنے کی عادت اپنا رہے تھے۔ اس طرح سرکاری افسروں اور عمال کو بدعنوان بنانے والی قوتیں بھی ناکارہ ہو کر رہ گئی تھیں اور یوں انتظامیہ بھی درست ہو گئی تھی۔

(393) ایسی ہی اصلاحات کی وجہ سے پولیس فورس کی ضرورت نہیں رہی تھی اور ان اصلاحات کی ضرورت لوگوں کے ذہنوں میں نقش ہو چکی تھی۔

باب 14

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کارناموں کی تحسین

(394) اس دنیا میں اَن گنت مذاہب ہیں۔ ان میں توحید پرست بھی ہیں۔ کئی مذاہب کے ماننے والے کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ ان تمام مذاہب میں اسلام سب سے کم عمر ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اسلام اپنے ماننے والوں کی تعداد کے حوالے سے سب سے بڑا مذہب نہ ہو مگر یہ ایک زندہ اور مسلسل ترقی کرتا ہوا مذہب ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب اور مشرک عناصر اس کے خلاف کام کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ چونکہ یہ ایک آفاقی دین ہے اور کسی خطے یا نسل تک محدود نہیں ہے اس لیے اسلام میں کسی بھی قومیت میں ''سرایت'' کرنے کی قوت و صلاحیت بہت زیادہ ہے تاہم ہمارا موضوع اسلام نہیں بلکہ اس عظیم دین اسلام کا بانی ہے۔

(395) دنیا کے مختلف مذاہب کی تاریخ میں یہ ایک قاعدہ و ضابطہ ہے کہ ہر شخص اپنے دین کے بانی کی زندگی اور کوشش و کاوش کے حوالے سے بہت کم واقفیت رکھتا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کی ان محترم و مکرم ہستیوں کو اپنی دنیاوی زندگی میں زیادہ کامیابی و کامرانی نہیں ملی۔ ان کے لائے ہوئے دین کو ان کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد ہی وسعت و وقعت نصیب ہوئی۔ مذاہب کے ان بانیوں کے ارشادات و احکامات اپنی اصل شکل کی بجائے حصوں اور ٹکڑوں میں ہم تک پہنچے ہیں کیونکہ ان مذاہب کے ماننے والوں نے تاریخی عمل کے دوران اپنے مذاہب کو وقت کی ضرورتوں اور تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کے لیے کئی اصولوں اور عملی پہلوؤں میں ترامیم و تبدیلیاں کیں۔

(396) نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی واحد ذات پاک ہے جن پر یہ قاعدہ و ضابطہ لاگو نہیں ہوتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کے حوالے سے چشم دید حالات و واقعات پر کتابوں کی بے شمار جلدیں ہیں جن میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ کے لمحے لمحے کی تفصیل تحریر کی گئی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور اور معاشرہ کی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی بیان کردی گئی ہے۔ پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حیات مبارکہ ہی میں عظیم ترین کامیابیاں اور کامرانیاں حاصل کیں۔ مختلف علاقوں سے حج کا فریضہ ادا کرنے کیلئے مکہ معظمہ میں آئے ہوئے حجۃ الوداع کے موقع پر ایک لاکھ چالیس ہزار سے زائد فرزندانِ توحید کے عظیم ترین اجتماع سے جب معلم کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی

اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خطاب فرمایا تو اُس وقت اس تعداد سے کئی گنا جانثاران حق اپنے گھروں میں موجود تھے کیونکہ ایک تو مسلمانوں پر ہر سال حج کرنا فرض نہیں دوسرے یہ بھی فرض نہیں کہ وہ کسی خاص سال کے موقع پر لازماً حج کو جائیں۔ یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ شافع محشر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس دارفانی سے کوچ کر جانے کے بعد بھی دین اسلام کو زبردست کامیابی وکامرانی نصیب ہوئی اور یہ کامیابی وکامرانی تسلسل کے ساتھ جاری وساری بھی ہے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات و ارشادات کو جو کامیابی وکامرانی حاصل ہوئی تاریخ انسانی میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ جہاں تک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات واحکامات کا تعلق ہے قرآن الحکیم لفظ بہ لفظ مکمل حالت میں ہم تک پہنچا ہے۔ اس کی زبان وہی ہے جس میں اس کا نزول ہوا تھا اور جس انداز وامتیاز سے ہم تک پہنچا ہے وہ قابل اعتماد ہے۔ چودہ صدیاں گزر جانے کے باوجود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جائے ولادت (مکہ معظمہ) یا دنیا میں کسی اور جگہ قرآن الحکیم میں کسی قسم کی تبدیلی وترمیم کرنے کی کسی نے کوئی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ہمیں علم ہے کہ سردار دوجہاں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کس انداز میں نماز ادا فرماتے تھے۔ کس طریقہ سے روزہ رکھتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کس عاجزانہ ومنکسرانہ سج دھج کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ کے گھر کا حج کیا تھا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام پیروکار آج بھی ان روحانی ولاثانی فرائض کو بالکل اسی ہی طرح سرانجام دیتے ہیں جس طرح معلم کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انجام دیئے تھے۔ دوسرے کئی مذاہب کے ماننے والوں کی طرح مذہب اسلام کے ایسے ماننے والوں کی بھی کمی نہیں جو اپنے دین پر کسی طور عمل نہیں کرتے بلکہ بعض تو بس نام ہی کے مومن ومسلمان ہیں۔ اس کے باوجود کسی مومن ومسلمان نے چاہے وہ محض نام ہی کا مسلمان کیوں نہ ہو اسلام کو ''وقت کے تقاضوں اور ضرورتوں کے مطابق ڈھالنے کے لیے'' اس میں ترمیم وتنسیخ کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ خود ہمارے دور میں تمام مذاہب میں اصلاح کی تحریکیں چل رہی ہیں مگر یہ عجیب حقیقت ہے کہ دوسرے مذاہب کو تو جدید دور کے چیلنجوں اور تقاضوں کا مقابلہ کرنے کے اہل بنانے کی خاطر ان میں ترمیم وتنسیخ کی ضرورت پڑ رہی ہے مگر مسلم مبلغین ومصلحین بیک آواز وبیک زبان اس بات کی تبلیغ وتلقین کر رہے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات واحکامات پر مکمل طور پر عمل کیا جائے۔ کسی مذہب کے بانی کی اس سے بڑی تعریف وتوصیف اور تحسین وتکریم اور کیا ہوسکتی ہے کہ اس کے ارشادات و احکامات آج بھی متحرک وقابل عمل ہیں اور ان میں تھوڑی سی بھی ترمیم وتبدیلی کی ضرورت

محسوس نہیں کی جا رہی۔

(397) سردار دو جہاں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ پر دنیا کی مختلف زبانوں میں ہزاروں کتابیں موجود ہیں۔ ان کتابوں کے لکھاریوں میں اسلام کے دوست بھی ہیں اور دشمن بھی۔ تمام مصنفین اس بات کو متفقہ طور پر تسلیم کرتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک بہت ہی عظیم انسان ہیں چاہے غیر مسلم مصنفین اس بات کو ناپسند کریں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مذہب اُن کے مذہب کے مخالف ہے۔ جن لکھاریوں نے ارادتاً جان بوجھ کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات و تعلیمات کو اپنی مرضی کے معانی و مفہوم کا غلط رنگ دے کر پیش کیا ہے وہ بھی درحقیقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بالواسطہ خراج تحسین پیش کر رہے ہیں اور ایسے لکھاریوں کی ایک معقول تعداد موجود ہے۔ ایسے لکھاری محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات و ارشادات کو اس لیے مسخ کر کے بیان کرتے ہیں کیونکہ وہ اس بات سے خوفزدہ ہیں کہ اگر انہوں نے دین اسلام کی صحیح تصویر پیش کر دی تو ان کے ہم مذہب ''گمراہ'' ہو جائیں گے جنہیں وہ مشرف بہ اسلام ہونے سے روکنے کے لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں فرضی اور من گھڑت کہانیاں و قصے بتاتے رہتے ہیں۔ اس طرح کی ذہنی و تحریری بددیانتی آج بھی جاری و ساری ہے۔ یہ بات حیرت آفریں ہے کہ جدید مغرب کے بے انتہا مادی و اشتہاری وسائل کے باوجود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پاک کے خلاف پراپیگنڈہ مخالفین کے مطلوبہ نتائج کے حصول میں ناکام و نامراد رہا ہے کہ جس کی توقع اتنی کثیر تعداد میں کتب کی اشاعت، ریڈیو، ٹی وی کی نشریات اور فلموں کی نمائش کے بعد کی جا سکتی ہے۔ ہمیں اس بات کا اندازہ نہیں کہ اگر اسلام کو اتنے وسائل حاصل ہوتے جس قدر عیسائی مذہبی مبلغین اور کمیونسٹوں کو میسر ہیں تو پھر دنیا کا رُخ کیا ہوتا!! لیکن ان تمام باتوں کے باوجود یہ حقیقت واضح ہے کہ مسیحی اور کمیونسٹ مغرب دونوں میں اسلام انتہائی تیزی کے ساتھ پھیل رہا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد 30 سال کے عرصہ کے دوران ہی انگلستان میں 100 سے زائد مساجد کی تعمیر ہوئی ہے۔ جرمنی اور فرانس میں بھی یہی صورت حال ہے۔ سفید فام امریکیوں کے مشرف بہ اسلام ہونے کے واقعات بھی بڑھ رہے ہیں۔ دائرہ اسلام میں داخل ہونے والوں میں سفیروں اور پروفیسروں کے ساتھ ساتھ دوسرے معزز پیشوں سے متعلق افراد بھی شامل ہیں۔ یہ کوئی حیران کن امر نہیں کہ ہر سال سینکڑوں کی تعداد میں سیاح صرف استنبول میں ہی مشرف بہ اسلام ہوتے ہیں حالانکہ یہاں اناطولیہ کی نسبت مذہبی جوش و خروش زیادہ نہیں ہے۔

(398) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات و ارشادات کی ایک اور منفرد خوبی یہ

ہے کہ یہ احکامات زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق ہیں بلکہ وہ محض مافوق الطبیعیات عقائد تک ہی محدود نہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انسان کی روحانی زندگی کے ساتھ ساتھ دنیاوی زندگی کے لیے بھی قاعدے اور ضابطے بیان کئے ہیں حتیٰ کہ سیاست بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات میں شامل ہے۔ یوں اسلام انسان کی تمام زندگی کی تعمیر وتشکیل میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ دوسرے مذاہب کی طرح صرف روحانی پہلو پر ہی توجہ نہیں دیتا اور نہ ہی سیاست کو محض حکمرانوں وحاکموں کے لیے مخصوص ومختص کرتا ہے۔

(399) یہ بات انتہائی آسانی کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ دوسرے مذاہب کی نسبت دین اسلام کے اثرات اس کے پیروکاروں کی ذاتی زندگیوں اور ذاتی رویوں پر زیادہ گہرے ہیں۔ دوسرے مذاہب آفاقیت کے دعوے دار ہونے کے باوجود اپنے پیروکاروں میں نسل ونسب اور شکل ورنگ کے تعصب تک کے خاتمہ میں بُری طرح ناکام رہے ہیں۔ میں نے 1932ء میں انگلستان کی ایک مسجد میں ایک انگریز مؤذن دیکھا۔ اُس نے بڑے اعزاز وافتخار کے ساتھ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حبشی مؤذن حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام کے حوالے سے اپنا نام بلال رکھا ہوا تھا۔ یہ کس قدر نرالی وتجسس آمیز بات ہے کہ سویڈن میں آباد فن لینڈ کے ایک عقیل نامی شخص نے محض مطالعہ کر کے اسلام قبول کر لیا حالانکہ اس سے پہلے اس کا کسی مسلمان سے تعارف تک نہ تھا۔ اُس نے پھر ایک فرانسیسی شخص گینن کو بھی دائرہ اسلام میں داخل کیا۔ گینن کے پیروکار فرانس، سوئٹزرلینڈ اور دوسرے علاقوں میں موجود ہیں اور سینکڑوں افراد کو تصوف کے ذریعے مشرف بہ اسلام کر چکے ہیں۔ درحقیقت مغرب والوں کو محض فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ ہی نے نہیں بلکہ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ازحد متاثر کیا ہے۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ کافر ہلاکو خاں نے اسلامی ممالک کو فتح کیا اور عباسیوں کے بغداد کو ملیامیٹ کر دیا مگر چند درویشوں نے اُس کے پوتے غزن خان کو مشرف بہ اسلام کر کے اسے اور دوسرے دشمنان اسلام کو دین اسلام کا عظیم علمبردار بنا دیا۔

(400) دوسرے مذاہب کے بانیوں نے ایک دوسرے پر بعض انسانی خوبیوں میں اگر سبقت حاصل کی ہے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس قدر شعبوں میں سبقت و فضیلت حاصل کی ہے کہ طالب علم حیران وحیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک عظیم اور اعلیٰ صفات کے حامل قانون ساز تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام قانونی سوالات کے جوابی قاعدے اور ضابطے مرتب کئے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک عظیم منتظم تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خاک کی مٹھی سے ایک عظیم سلطنت کو وجود دیا اور آپ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود ہی اس کے منتظم اعلیٰ تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلامی افواج کی سپہ سالاری کی اور اکثر اوقات اپنی رضا کار فوج سے تین سے پندرہ گنا زیادہ تعداد کی دشمن فوج کو واضح شکست سے دوچار کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اخلاقی تعلیمات عام شخص کی سمجھ میں آنے والی فہم وفراست سے لبریز ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات میں مبالغہ کا کوئی عنصر نہیں جو انہیں مثالی مگر نا قابل عمل بنا دے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ نہیں کہا کہ اگر کوئی تمہارے دائیں رخسار پر تھپڑ مارے تو بایاں رخسار بھی اس کے سامنے کردو بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ ''اگر تم حقیقی اور جائز بدلہ لو تو یہ درست اور صحیح ہے لیکن اگر تم معاف کردو تو یہ رب رحمٰن ورحیم کے نزدیک زیادہ اچھا اور احسن ہے۔'' یوں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات عام آدمی کے ساتھ ساتھ کسی ولی کے لیے بھی ایک جیسی قابل عمل ہیں۔ یہ تعلیمات عام آدمی کو گناہ کرنے سے روکتی ہیں اور انسان کو معقول و مناسب حدود کے اندر رکھتی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مذہبی تعلیمات ''بندہ اللہ کا ہے اور اللہ بندے کا ہے'' کا سبق دیتی ہیں۔ یوں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تبارک وتعالیٰ اور بندے کے مابین بغیر کسی واسطے کے براہ راست تعلق ورابطہ قائم کرا دیا ہے۔ رب تعالیٰ جل شانہٗ اور بندے کے درمیان کسی واسطے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی کسی کی اجارہ داری ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات میں رب تعالیٰ جل شانہٗ کی وحدانیت کے ساتھ ساتھ لامحدود و لاتعداد صفاتِ الٰہی اور اپنی مخلوق کیلئے رب تعالیٰ جل شانہٗ کی محبت ورحمانیت کا کوئی دوسرا مذہب نہ تو مقابلہ کرسکتا ہے اور نہ ہی مثال پیش کرسکتا ہے۔ دین اسلام میں اللہ تبارک وتعالیٰ ''رب العالمین'' ہیں۔ وہ ودود (محبت) ہیں۔ وہ رحیم (مکمل رحم کرنے والے) ہیں۔ وہ غفور (مکمل مغفرت کرنے والے) ہیں۔ وہ (قیامت کے روز) سزا دینے میں حق بجانب ہیں مگر رب تعالیٰ جل شانہٗ کی رحمت اُن کے غضب پر سبقت رکھتی ہے۔

سبقت رحمتی علی غضبی

(حدیث قدسی)

(401) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نوع انسانی کو اخلاق کا مکمل درس دیا اور جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس بات سے مطمئن ہو گئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا مشکل ترین مشن احسن طریقے سے تعمیل و تکمیل فرمالیا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تبارک وتعالیٰ جل شانہٗ کی اعلیٰ رفاقت وقربت کو ترجیح دی۔ (مع الرفیق الاعلیٰ)

اللّٰھمّ صلِّ علٰی محمّد وبارک وسلّم

باب 15
عالم فنا سے عالم بقا کی جانب سفر

(402) رب ذوالجلال جو مشن اپنے پیغمبروں کے ذمہ لگاتے ہیں وہ ہمیشہ اور ہر جگہ انتہائی کٹھن ہوتے ہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مشن اس لحاظ سے اور بھی مشکل تھا کہ اس میں انسان کی مکمل شخصیت کو "نشانہ" بنایا گیا تھا۔ اس کے پرانے اعتقادات، طریق عبادت، خاندانی زندگی، معاشرتی اخلاقیات و آداب، سیاست غرض یہ کہ زندگی کے کسی بھی پہلو کو نہیں چھوڑا گیا تھا۔ خوش بختی سے پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کافی اور معقول عرصہ بقید حیات رہے۔ اگرچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے مشن کا آغاز 40 سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے تک نہیں کیا تھا تاہم پھر بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس اپنے مشن کی تکمیل کے لیے قوت و طاقت سے معمور اور جوش و جذبہ سے بھرپور مزید 23 سال موجود تھے۔ پیغمبر اور نبی کبھی نہیں مرتے۔ وہ دنیاوی زندگی سے علیحدگی اختیار کر لیتے ہیں لیکن وہ ایسے لوگوں کے ذریعے جو اُن کی نبوت و رسالت اور مشن پر ایمان رکھتے ہوں معاشرہ میں اپنا اثر و رسوخ جاری و ساری رکھتے ہیں۔ اگر انہیں موت آتی بھی ہے تو وہ کسی دوسرے نبی یا پیغمبر کی آمد پر ہی واقع ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت نوح علیہ السلام کا مشن ختم کیا۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مشن ختم کیا۔ آخرکار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مشن بھی اختتام پذیر ہوا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، رب تعالیٰ جل شانہٗ کے آخری نبی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں۔ تاریخی اعتبار سے دین اسلام کا کوئی بھی شخص ایسا پیدا نہیں ہوا جس نے دین اسلام سے بہتر عقائد پیش کئے ہوں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات سے بہتر تعلیم دی ہو۔

(403) اب نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر مبارک 63 برس ہو چکی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو 23 سالہ غیر معمولی تبلیغی جدوجہد نے تھکا دیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زندگی کی طاقت و توانائی کی آخری حدت و حرارت کو بروئے کار لاتے ہوئے مکہ مکرمہ کا کٹھن طویل سفر طے کیا۔ اونٹ کی پیٹھ پر 12 دن مکہ مکرمہ جانے میں اور اتنے

ہی دن واپس آنے میں صرف ہوتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حج بیت اللہ کا فریضہ ادا کرنے کیلئے پہنچے تھے۔ دورانِ حج جب سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر رب کائنات جل شانہٗ نے یہ آیت نازل فرمائی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خوشی و مسرت قابل دید تھی۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ
وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا

(المائدہ:3)

"(لو) تمہارا دین ہم نے آج کامل کر دیا
آج ہے تم پر ہماری نعمتوں کا تکملا
کی پسند اسلام کی ملت تمہارے واسطے"

یہ نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عالم فنا سے عالم بقا کی جانب روانہ ہونے کا اعلان تھا جو آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے خوشی و مسرت اور اطمینان وسکون کا باعث تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس مادی دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے رنج وملال نہیں بلکہ مسرت و انبساط کا اظہار فرما رہے تھے۔ درحقیقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہ آیات بھی نازل ہوئیں۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۙ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ
اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۙ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۟

(النصر: 1 تا 3)

"(اے پیغمبرؐ) جب کہ آ پہنچی مدد اللہ کی
اور (مکہ ہو گیا ہے) فتح (ٹوٹا کفر بھی)
اور تم نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ (دیر آشنا)
جوق جوق (اب) ہو رہے ہیں داخلِ دینِ خدا
پس کرو تسبیح اپنے رب کی، اور حمد (وثنا)
اور گناہوں کی معافی اُس سے مانگو (برملا)
یاد رکھو، وہ معافی دینے والا ہے بڑا"

﴿یہ سورۃ نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آخر عمر میں نازل

ہوئی جبکہ مکہ مکرمہ فتح ہو چکا تھا اور لوگوں کے غول کے غول اسلام میں داخل ہو رہے تھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ "میں دنیا میں جس کام کے لیے آیا تھا وہ پورا ہو چکا۔ اب سفرِ آخرت کی تیاری کا حکم ہے"۔

کس قدر معقول اور عقلمندانہ تعلیم ہے کہ خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی رب غفور و رحیم سے لازماً مغفرت اور معافی طلب کرنے کا کہا جا رہا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے آپ کو رب رحمٰن و رحیم کا بندہ ہونے پر فخر کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدا کا، یا خدا کا بیٹا ہونے کا، کوئی دعویٰ نہیں کیا۔

(404) اس فتح آمیز حج کے بعد خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب مدینہ منورہ پہنچے تو جلد ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیمار ہو گئے۔ شروع میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سر مبارک میں درد ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اچھی طرح جانتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کچھ کیا ہے وہ کس طرح کیا ہے! چنانچہ ایک رات شدید بیماری کے وجود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بستر سے اُٹھ کر قریبی قبرستان پہنچے جسے جنت البقیع کے وبصورت نام سے پکارا جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ نہم کی قبروں پر فاتحہ خوانی کی جن کی مدد اور شراکت سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنی نوع نسان کو اس کی منزل کی جانب جانے والی ایک نئی اور آخری جہت سے آشنا کرایا تھا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیماری میں شدت آ گئی اور جلد ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس قابل نہ رہے کہ کھڑے ہو کر اپنے پیروکاروں کی نماز باجماعت کی امامت کرا سکیں۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وفادار قریبی دوست حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نماز باجماعت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جگہ امامت کے فرائض سنبھالیں۔ پھر ایک روز سردار الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طبیعت بہتر ہو گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے حجرہ سے باہر تشریف لائے اور بیٹھ کر نماز کی امامت کی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مرض میں شدت لوٹ آئی۔

(405) انہی ایام میں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مقامی کہاوت کے مطابق اپنا علاج اس طرح کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سات مختلف کنوؤں کا پانی منگوا کر اُس سے غسل فرمایا جس سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیماری میں کافی فرق پڑا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دو افراد کے سہارے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تشریف لے گئے اور منبر پر انتہائی متاثر کن خطبہ ارشاد فرمایا جسے سن کر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی آنکھوں سے آنسوؤں

کے موتی گرنے لگے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ اُحد کے شہیدوں کے لیے رب رحمٰن ورحیم سے رحمت کی دعا کی اور ان کی دین پر ثابت قدمی اور دین کے فروغ کے لیے کوشش وکاوش میں شراکت پر ان کے لیے شکریہ کا اظہار کیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعلان کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عالم فنا سے رخصت ہونے والے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کے ایک بندے کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے انتخاب کا اختیار دیا تو اُس نے ''مع الرفیق الاعلیٰ' کا انتخاب کر لیا۔'' اس کے بعد ختم الرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بڑے شاندار الفاظ میں تعریف وتحسین کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمات اور اسلام کے فروغ کیلئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تعاون کا تفصیلی ذکر کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنا بھائی اور قابل ترجیح دوست قرار دیا۔ (یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے دبے لفظوں میں اشارتاً سفارش تھی کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھلے لفظوں میں یہ حکم نہیں دے سکتے تھے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جانشین منتخب کیا جائے تاکہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشن کو جاری رکھ سکیں) پھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکی مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے اُن پر مدنی مسلمانوں کے فضائل واضح کیے کہ جن کی میزبانی اور امداد وشراکت کے بغیر اسلام اس تیزی سے ترقی نہیں کر سکتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کافی دیر تک اُن کی خوبیاں بیان فرمائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زور دیا کہ اسلام کے لیے مدنی مسلمانوں کی خدمات کو کسی صورت نہ بھلایا جائے۔ پھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مثال قائم کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر شخص کو اجازت دی کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنا حق بیان کرے۔ اس میں تمام لوگ شامل تھے چاہے وہ اس موقع پر موجود تھے یا نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ''اگر میں نے کسی کو دُکھ پہنچایا ہو تو میں اس سے معافی چاہتا ہوں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ان باتوں پر اس قدر زور دیا کہ ایک دو افراد کھڑے ہوئے۔ ایک نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یاد دلایا کہ ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس سے تین درہم قرض لئے تھے مگر واپس کرنا بھول گئے۔ اس شخص کو فوری طور پر رقم کی ادائیگی کر دی گئی۔ رسول رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر اپنی بات پر زور دیا اور کہا کہ کسی کا جان ومال اور عزت ووقار کے حوالے سے مجھ پر کوئی حق بنتا ہو تو وہ کسی ہچکچاہٹ کے بغیر بیان کرے پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا کہ کسی بھی شخص، حکومت یا مملکت پر کسی کا کوئی

حق بنتا ہو تو وہ بھی بیان کرے۔ بعد ازاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیغمبروں کی قبروں کو پوجنے کے حوالے سے سخت الفاظ میں منع فرما دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا "میرے بعد میری قبر کو بت میں نہ بدل دینا کہ لوگ جس کی پرستش شروع کر دیں۔" انہی ایام میں اسلامی فوج کی ایک مہم سابقہ غلام حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بیٹے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی سپہ سالاری میں روانہ ہونے والی تھی۔ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یہ مہم ضرور جانی چاہیے حتیٰ کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دار فانی سے چلے بھی جائیں۔ (اس فوجی مہم میں بعض جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم رضا کارانہ طور پر شامل تھے۔ بعض افراد نے یہ تجویز دی کہ اس مہم کا سپہ سالار حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو نہ بنایا جائے مگر رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ تجویز سختی کے ساتھ رد کر دی۔)

(406) محبوب خدا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھک کر واپس اپنے بستر پر تشریف لے گئے۔ ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طبیعت بہتر محسوس فرمائی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک نماز کے وقت بستر سے اُٹھ کر حجرہ سے باہر آئے اور نمازیوں سے بھری ہوئی مسجد میں نمازیوں کو انتہائی انہماک واشتیاق کے ساتھ نماز پڑھتا دیکھ کر از حد مسرور و مطمئن ہوئے۔ عاشقانِ رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب اپنے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیماری میں افاقہ دیکھا تو وہ خوشی ومسرت سے جھوم جھوم گئے مگر انہوں نے کوئی ایسی حرکت نہ کی جو نماز کے آداب کے خلاف ہو۔ تاہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آگے تشریف نہ لے جا سکے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس اپنے بستر پر تشریف لے آئے۔ لوگ دھوکہ کھا گئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضری دی اور مدینہ کے نواحی علاقہ میں واقع اپنے گھر جانے کی اجازت چاہی کیونکہ وہ کافی دنوں سے اپنے گھر والوں سے نہیں ملے تھے۔ کچھ اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے بھی آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضری دی۔ ظاہراً ان میں سے کسی نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وصیت تحریر کرا دیں۔ اس پر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کاغذ اور قلم لانے کا حکم دیا۔ پھر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے مابین اختلاف رائے پیدا ہو گیا کہ آیا آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس حالت میں وصیت تحریر کرانے کی زحمت دی جائے یا نہیں جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلے ہی ہر وہ بات اپنی اُمت کو بتا چکے ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتانا تھی۔ (دراصل صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو جنگ

اُحد کے دوران محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ناراضی یاد تھی کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وہ کام کرنے کو کہا گیا تھا جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کرنا نہیں چاہتے تھے۔ نتیجتاً جنگ میں پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اپنے خطاب کے دوران آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ اُحد کا تفصیلی ذکر بھی کیا تھا) جب خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو بحث کرتے دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب کو چلے جانے کا حکم دے دیا۔

(407) ابھی چند ہی گھنٹے گزرے تھے کہ بیماری شدید سے شدید تر ہو گئی۔ رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بے ہوش ہو گئے مگر جلد ہی ہوش میں آ گئے۔ اب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بات نہیں کر سکتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ملاقات کے لیے آنے والے ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ میں مسواک دیکھی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسواک کی طرف اس طرح نگاہ کی کہ لوگ سمجھ گئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دانت صاف کرنا چاہتے ہیں چنانچہ نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دانت مبارک صاف کرائے گئے جس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرۂ اقدس پر اطمینان وسکون محسوس ہونے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین بار کہا ''لا الہ الا اللہ! موت کس قدر تکلیف دہ ہے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے آخری الفاظ ''نہیں لیکن مع الرفیق الاعلیٰ'' ادا ہوئے۔ ایسا دکھائی دیتا تھا کہ سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو انتخاب کرنے کی پیش کش کی گئی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ مطہرہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی آغوش میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سر مبارک تھا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روایت کرتی ہیں کہ ''یہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عالم فنا میں آخری لمحہ تھا مگر میں کم عمر تھی چنانچہ مجھے علم نہ ہوا کہ کیا ہو چکا ہے۔ جب دوسرے لوگ رونے لگے تو پھر مجھے احساس ہوا کہ کیا کچھ ہو گیا ہے۔ میں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سر مبارک آہستہ سے تکیہ پر رکھ دیا اور خود بھی رونے لگی۔''

(408) محبوب خدا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پشت مبارک پر (دونوں کندھوں کے درمیان) ایک اُبھار تھا جسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مہر نبوت قرار دیتے تھے۔ سیرت نگاروں کے مطابق امام کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عالم فنا سے عالم بقا کی جانب کوچ کر جانے کے بعد کسی نے دیکھا تو وہ اُبھار غائب ہو چکا تھا۔

باب 16

تدفین اور جانشینی

(409) امام الانبیاء، محبوب خدا، محمد مصطفےٰ، عظیم الشان اسلامی سلطنت کے سالار اعظم، اسلام کی رفیع الشان عمارت کے معمار اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا واقعی اس دارفانی سے جہان جاودانی کی جانب جا چکے تھے؟ کوئی اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ یہ انتہائی غیر متوقع صورت حال اور ناقابل یقین بات تھی۔ ہر مسلمان غم والم کے آنسوؤں میں بھیگی چادر اوڑھے ہوئے تھا۔ دکھوں کا وسیع وعریض پہاڑ تھا جو سب پر آ گرا تھا۔ کچھ لوگ تو جیسے ہوش وحواس ہی کھو چکے تھے اور ایک نے تو تلوار میان سے نکال لی تھی اور اعلان کیا تھا "نہیں! رب ذوالجلال کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال نہیں ہوا۔ وہ زندہ ہیں۔ انہیں موت نہیں آ سکتی۔ اگر کسی نے کہا کہ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رحلت فرما گئے ہیں تو میں اُس کی گردن اُڑا دوں گا!!'' نبی آخرالزماں محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کی خبر انتہائی تیزی کے ساتھ مسلم سلطنت کے چہار جانب پھیل گئی۔ معتبر ترین روایت کے مطابق وہ سوموار، 2 ربیع الاول 11 ہجری (25 مئی 632 عیسوی) دن کا وقت تھا۔ (تاہم 12 ربیع الاول زیادہ مشہور ومعروف ہے)۔

(410) جیسے ہی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کی خبر ملی تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فوراً ہی (مدینہ منورہ کے نواحی علاقہ میں واقع اپنے گھر سے) واپس لوٹے۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تیزی سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر میں داخل ہوئے۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی لخت جگر اور سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ مطہرہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے وہ کپڑا اٹھا دیا جس سے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جسد مبارک ڈھانپا گیا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انتہائی عقیدت ومحبت سے امام کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشانی مبارک پر بوسہ دیا اور پھر کپڑا سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسد مبارک پر ڈال دیا۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سیدھے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہنچے۔ جونہی آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ منبر رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تشریف فرما ہوئے مسجد میں موجود سب لوگ خاموش ہو گئے۔ ہر شخص حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سننا چاہتا تھا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی

تقریر کا آغاز قرآن الحکیم کی اس آیت سے کیا:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاۡىِٕنْ مَّاتَ
اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ
فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ

(آل عمران:144)

''اور محمدؐ (اس سے بڑھ کر اور کیا ہیں) اک نبی
ان سے پہلے بھی نبی (دنیا میں) آئے ہیں کئی
پھر اگر مارے گئے یا (وقت پر) اپنے مرے
کیا تم اُلٹے پاؤں (سوئے کفر) پھر، پھر جاؤ گے؟
کفر کی جانب جو اُلٹے پاؤں پھر کر جائے گا
(یاد رکھو) کچھ بگاڑے گا نہ وہ اللہ کا
شکر کرنے والوں کو (بے شک) خدا دے گا جزا

اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مزید کہا:

''جو کوئی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پرستش کرتا تھا وہ یہ جان لے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جسمانی طور پر زندہ نہیں ہیں مگر جو رب تعالیٰ جل شانہٗ کی پرستش کرتا ہے اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ زندہ ہیں اور انہیں کبھی موت نہیں آئے گی۔''

آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی تقریر اس تجویز پر ختم کی کہ امت کے امیر کی جگہ خالی نہیں رہنی چاہیے اور کسی ایسے شخص کا انتخاب کر لیا جانا چاہیے جو خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جانشین بنے۔

(411) ہر شخص نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تجویز سے اتفاق کیا اور کہا ''جی ہاں! ہم اس پر کل (رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسد مبارک کی تدفین کے بعد) بات کریں گے۔ اس کے بعد افسردہ وغم زدہ لوگ اِدھر اُدھر چلے گئے۔ اب تمام خیالات و خدشات ختم ہو چکے تھے۔ یہ سانحۂ عظیم تھا مگر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طاقتور شخصیت نے ہر فرد کو سہارا دیا اور لوگ بھی آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گرد جمع ہو کر آپ رضی اللہ

تعالیٰ عنہ سے رہبری و رہنمائی حاصل کرنے لگے تاہم امت مسلمہ کو بے شمار مسائل کا سامنا تھا۔

(412) سب سے پہلا مسئلہ یہ تھا کہ رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تدفین کس جگہ کی جائے؟ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ بتا کر یہ مسئلہ بہت آسانی سے حل کر دیا کہ ''مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ رب تعالیٰ جل شانہٗ کے پیغمبر بالکل اسی جگہ دفن ہوتے ہیں جہاں وہ آخری سانس لیتے ہیں۔'' (اب رہا یہ مسئلہ کہ) آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر مبارک کس طرز کی ہو گی؟ قبر کھودنے کا ایک مکی طریقہ تھا جبکہ دوسرا مدنی طریقہ تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: ''مکی طرز کی اور مدنی طرز کی قبریں کھودنے والے دو افراد کو بلا بھیجو اور معاملہ رب علیم وخبیر پر چھوڑ دو۔ ان دونوں میں سے جو بھی پہلے موقع پر پہنچے وہ اپنے انداز کی قبر کھودے''۔ اس کے بعد خواتین ایک طرف چلی گئیں اور رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عم زادوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسد اطہر کو کپڑے سے ڈھانپ کر ہی غسل دیا۔

(413) اس دوران ایک انتہائی سنگین واقعہ رونما ہوا جس نے اسلام کی ممتاز اور جلیل القدر شخصیات کو بھی خبردار و ہوشیار کر دیا۔

(414) رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی علالت کے آخری ایام میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک دن اپنے بھتیجے حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس تشریف لائے اور کہنے لگے ''محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موجودہ بیماری سے صحت یابی کی کوئی زیادہ توقع نہیں مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابھی تک اپنے جانشین کے حوالے سے کوئی واضح بات نہیں کی۔ آؤ ہم آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کر لیں۔ اگر سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان میں سے کسی کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جانشین بننا ہے تو ہمیں اس بات کا علم ہو جائے گا اور اگر ایسا نہیں تو ہم دونوں رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خواہش کے گواہ ہوں گے۔'' اس پر حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا ''نہیں! میں آپ کے ہمراہ نہیں جاؤں گا کیونکہ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس وقت ہمیں اپنی سیاسی جانشینی عطا نہ کی تو بعد ازاں کوئی بھی ہمیں کبھی بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جانشین تسلیم نہیں کرے گا۔'' جب رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم کا وصال ہوا تو حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ پھر حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس تشریف لے گئے اور بولے "ہم رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سب سے قریبی رشتہ دار ہیں (میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چچا اور پہلا وارث ہوں جبکہ تم چچازاد ہو) میری مدد واعانت کرو۔ میں تمہاری محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین کے طور پر بیعت کر لوں گا۔ دوسرے لوگ میری پیروی کریں گے اور کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔ اگر تم نے انکار کر دیا تو یہ موقع ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ضائع ہو جائے گا۔" مگر حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نظم وضبط کے اس قدر پکے اور بااصول تھے کہ دوسروں کے سامنے کسی بھی بات کو پہلے سے طے شدہ امر کے طور پر پیش کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا "نہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے کیونکہ عام مشاورت کے دوران کوئی بھی ہماری جانشینی کے حق سے انکار نہیں کرے گا۔"

(415) نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے اگلے روز مدینہ منورہ کے بنوخزرج نے اپنی مجلس مشاورت قائم کی۔ یہ ایک طرح کا نیم خفیہ اجلاس تھا جس میں خاص طور پر جان بوجھ کر کسی مکی کو نہیں بلایا گیا تھا۔ شاید بنوخزرج والے کوئی قطعی فیصلہ نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ وہ ایسی عمومی پالیسی تیار کرنا چاہتے تھے کہ جسے اجلاس عام میں اختیار کیا جا سکے۔ بنوخزرج کی مجلس مشاورت میں اس رائے کا اظہار کیا گیا کہ چونکہ مدینہ منورہ میں وہ بھاری اکثریت میں ہیں اس لیے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانشینی انہیں ملنی چاہیے (اور یہ حقیقت ہے کہ بنواوس والے بنوخزرج سے تعداد میں محض ایک تہائی تھے) ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بنوخزرج کی اس مجلس مشاورت میں موجود ہر فرد اس بات پر متفق تھا کہ بنوخزرج کے سردار حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جانشین مقرر کیا جانا چاہیے۔

(416) بنواوس کے کسی شخص کو (اس مجلس مشاورت کی) خبر ملی تو وہ مسجد کی طرف تیزی سے دوڑا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اطلاع دی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بنوخزرج کو یاد دلانا چاہتے تھے کہ اُن کی یہ خفیہ مجلس مشاورت مسلمانوں کے باہمی فیصلے کے منافی ہے اور یہ کہ دوسروں کی غیر حاضری میں اس طرح کی مجلس مشاورت منعقد نہیں کرنا چاہیے تھی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پھر یہ خدشہ بھی پیدا ہوا کہ اگر انہوں نے کوئی اقدام نہ کیا اور کوئی فیصلہ کر لیا گیا تو بعدازاں اس فیصلے کو بدلنا مشکل ہو جائے گا چنانچہ حضرت

ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے ساتھیوں حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ (دونوں مکی تھے) کے ہمراہ تیزی کے ساتھ بنو ساعدہ کے ڈیرے (ثقیفہ) پر پہنچے جہاں یہ خفیہ مجلس مشاورت منعقد تھی۔ انہوں نے بلند آواز کے ساتھ السلام علیکم کہا اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ کسی نے ان کی شرکت پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ ان کے بعد کچھ اور مکی صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم بھی وہاں پہنچ گئے۔

(417) بعد ازاں جلد ہی بنوخزرج کے حضرت ثابت ابن قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے انصار مدینہ کی خوبیاں گنوا کر تجویز پیش کی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیاسی قوت کا جانشین کسی انصاری کو ہونا چاہیے۔ پھر انہوں نے اہل مکہ سے ان کا ردِ عمل دریافت کیا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سیاسی جانشین کے سوال پر غوروفکر شروع ہو چکا تھا اور اب اس معاملہ سے علیحدگی ممکن نہیں تھی۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اُٹھے اور کہا "میری رائے میں کوئی مکی ہی پورے عرب کے لیے قابل قبول ہو سکتا ہے۔" آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ (ابن جراح) کی عظیم صلاحیتیں گنوائیں اور حاضرین کو تجویز پیش کی کہ ان دونوں اصحاب میں سے کسی ایک کو جانشین منتخب کر لیا جائے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جانشینی کا امیدوار بننے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ اس معاملہ پر بحث زیادہ سے زیادہ جذباتی ہوتی گئی۔ اس پر بنوخزرج کے حضرت الحباب ابن المنذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کھڑے ہوئے اور انہوں نے ایک مصالحتی تجویز پیش کی کہ "ٹھیک ہے پھر دو امیر ہونے چاہئیں۔ ایک ہم میں سے ہو اور ایک تم میں سے۔" یعنی ایک مدنی ہو اور ایک مکی ہو۔

(418) درج ذیل تفصیلات سے اس وقت کی پیچیدہ صورت حال کی کچھ وضاحت ہوتی ہے۔

ابن سعد (1/III صفحہ 151) کے مطابق اس حوالے سے جو اصل تجویز پیش کی گئی اس کے الفاظ یہ تھے "محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب بھی تم (مکی) میں سے کسی کو گورنر (عامل) مقرر کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم (مدنی) میں سے بھی کسی کو لازماً اُس کے ہمراہ کر دیا۔ چنانچہ ہم سمجھتے ہیں کہ اب مسلمانوں کے امیر بھی دو افراد ہی ہونے چاہئیں جن میں ایک تم میں سے ہو اور ایک ہم میں سے ہو۔" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس تجویز کے

حوالے سے یہ کہا گیا تھا کہ اگر دو امیروں میں بعض اوقات کسی معاملہ پر اتفاق رائے نہ ہو سکا تو پھر امت مسلمہ کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ الدیار بکری (169, 168/II) کی روایت دوسری اور ترمیم شدہ تجویز معلوم ہوتی ہے۔ اس روایت کے مطابق انصار کا یہ کہنا تھا کہ "اگر آج آپ (مکی) اپنے میں سے کسی کو امیر نامزد کرتے ہیں تو اُس کی وفات پر ہم (مدنی) انصار میں سے کسی کو امیر نامزد کریں گے اور جب یہ امیر بھی فوت ہو جائے تو پھر ہم مکی مہاجرین میں سے کسی امیر کا انتخاب کریں گے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری و ساری رہے گا جب تک مسلم مملکت قائم ہے۔" حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کے مطابق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ تجویز قبول نہ کرتے ہوئے جوابی تجویز یہ پیش کی کہ "نہیں! امیر ہم میں سے ہوگا اور وزیر تم میں سے ہوں گے۔" حضرت امام ابن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کے مطابق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خصوصاً بنو خزرج کے امیدوار حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مخاطب ہو کر کہا "سعد! کیا تمہیں یاد نہیں کہ ایک دن جب آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس میں موجود تھے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ امارت کے حقدار قریش (مکی) ہی ہیں اور عوام میں اچھے لوگ قریش کے اچھے لوگوں کی پیروی کرتے ہیں جبکہ عوام میں بُرے لوگ قریش کے بُرے لوگوں کی پیروی کرتے ہیں؟" حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ کی تصدیق کی اور کہا "یا ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ! آپ نے صحیح کہا ہے لہٰذا ہم لوگ وزیر ہوں گے اور آپ لوگ امیر ہوں گے۔"

(419) جانشینی کے لیے ابھی تک کسی بھی فرد کا انتخاب عمل میں نہیں آیا تھا۔ حاضرین پر خاموشی طاری تھی چنانچہ اس صورت حال میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اُٹھ کر معاملہ نمٹا دیا۔ انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا "ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بہتر کوئی شخص نہیں ہو سکتا۔" حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ باضابطہ طور پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بیعت کرنے ہی والے تھے کہ بنو خزرج کے حضرت بشیر ابن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ اُٹھے (واقدی کے مطابق انہوں نے اپنے عم زاد حضرت الحباب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دو امیروں کے تقرر کی تجویز کی مخالفت کی تھی) اور بولے "ٹھہریئے! ہم

سب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بطور جانشین تسلیم کرنے پر متفق ہیں مگر مجھ سے پہلے کسی کو ان کی بیعت نہیں کرنی چاہیے'' (یہ رب تعالیٰ جل شانہٗ کا نیک بندہ یہ چاہتا تھا کہ ایک مکی کے جانشین منتخب ہونے پر کہیں اہل مدینہ دلی طور پر محسوس نہ کریں چنانچہ اُس نے اہل مدینہ کی طرف سے بیعت کرنے میں پہل کر کے اسلام سے لگاؤ اور بے لوثی کی شاندار مثال قائم کی) چنانچہ حضرت بشیر ابن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دست مبارک پر بیعت کی۔ اس کے بعد دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم بھی بیعت کرنے لگے اور یوں مشاورت کے لیے مقررہ کردہ وقت سے بھی پہلے اس اہم معاملے کا فیصلہ ہو گیا۔

(420) چونکہ یہ فیصلہ جلدی میں اور منتشر مجلس میں کیا گیا تھا (اگرچہ اس کا اختتام بڑے پُرسکون اور تسلی بخش انداز میں ہوا) اس لیے سرور کائنات حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل خاندان کو جو کہ اس وقت تدفین کے انتظامات میں مصروف تھے اس مجلس مشاورت میں شامل نہ کیا جا سکا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس فیصلہ کو قطعی اور آخری خیال نہیں کرتے تھے اور اس معاملہ کو دوبارہ اٹھانا چاہتے تھے۔ تاہم ثقیفہ بنو ساعدہ سے لوگ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر پہنچے۔ جس حجرہ میں نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آخری سانس لیے تھے وہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جسد مبارک قبر کے قریب رکھا ہوا تھا جو اسی دوران تیار کر لی گئی تھی۔ اس حجرہ میں اس قدر گنجائش نہیں تھی کہ تمام مسلمان اکٹھے ایک ساتھ اپنے محبوب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز جنازہ ادا کر سکیں اور کسی میں یہ حوصلہ نہیں تھا کہ رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسد مبارک کو کسی کھلی جگہ لے جائے جہاں مدینہ منورہ کی تمام آبادی سما سکے۔ چنانچہ لوگ چھوٹے چھوٹے گروپوں کی شکل میں حجرے میں داخل ہوتے اور انفرادی طور پر دعا کرتے۔ قدرتاً اس طرح کافی دیر لگ گئی اور تمام رات گزر گئی۔ جب آخری مسلمان بھی حجرہ میں سے ہو کر باہر آ گیا تو پھر تدفین کی گئی۔

(421) پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لوگوں کو عام اجتماع کے لیے اکٹھا ہونے کو کہا۔ وہاں آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ثقیفہ کے فیصلہ کو قطعی اور آخری خیال نہیں کرتے اور اب ہر شخص جانشینی کے مسئلہ پر آزادی کے ساتھ رائے

دے سکتا ہے۔آپ لوگ جسے چاہیں جانشینی کے لیے منتخب کر لیں۔قدرتی طور پر کسی نے مخالفت نہ کی بلکہ حاضرین نے متفقہ طور پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیعت کا اعادہ کیا۔

اس موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک مختصر مگر انتہائی بامعنی تقریر کی:

"لوگو! مجھے تمہارا سربراہ منتخب کیا گیا ہے۔اگرچہ میں تم سے افضل نہیں ہوں۔اس لیے اگر میں صحیح اور درست کام کروں تو میری مدد کرو اور اگر میں غلط چلوں تو مجھے درست کرو۔سچ کا مفہوم سربراہ پر اعتماد کا اظہار ہوگا جبکہ جھوٹ کا مطلب غداری ہوگا۔آپ میں سے کمزور (مظلوم) میری نظر میں اس وقت تک طاقتور ہے جب تک میں اُسے اس کا حق نہ دلا دوں اور طاقتور (ظالم) میری نظر میں اس وقت تک کمزور ہے جب تک میں اس سے دوسروں کا حق نہ لے لوں۔یہ سب کچھ رب تعالیٰ جل شانہٗ کے حکم کے مطابق ہی ہوگا۔سنو! ایسی کوئی قوم نہیں جس نے رب تعالیٰ جل شانہٗ کی راہ میں جہاد کو نظر انداز کیا ہو اور رب ذوالجلال نے اُسے ذلیل نہ کیا ہو۔کسی قوم میں جب بداخلاقی رواج پا جاتی ہے تو رب ذوالجلال اس پر قہر نازل کرتے ہیں۔اُس وقت تک میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ تبارک وتعالیٰ اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کروں۔جیسے ہی میں اللہ تبارک وتعالیٰ اور اللہ تبارک و تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی کروں تم میری اطاعت بالکل نہ کرو۔آؤ اب نماز ادا کریں۔رب رحمٰن ورحیم تم سب پر اپنی رحمتیں نازل فرمائیں۔"

ISBN 969-534-047-4
(سیرت)
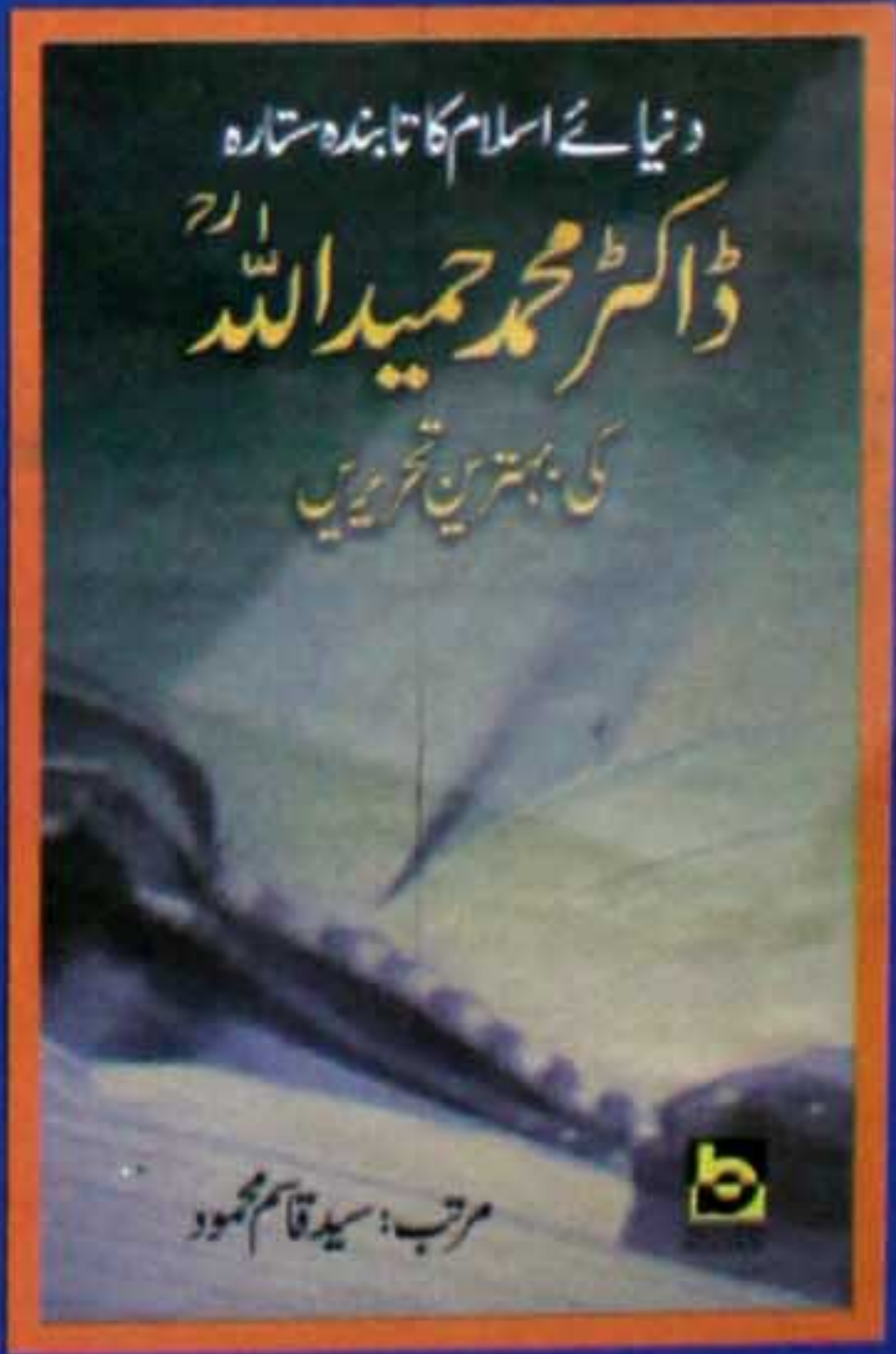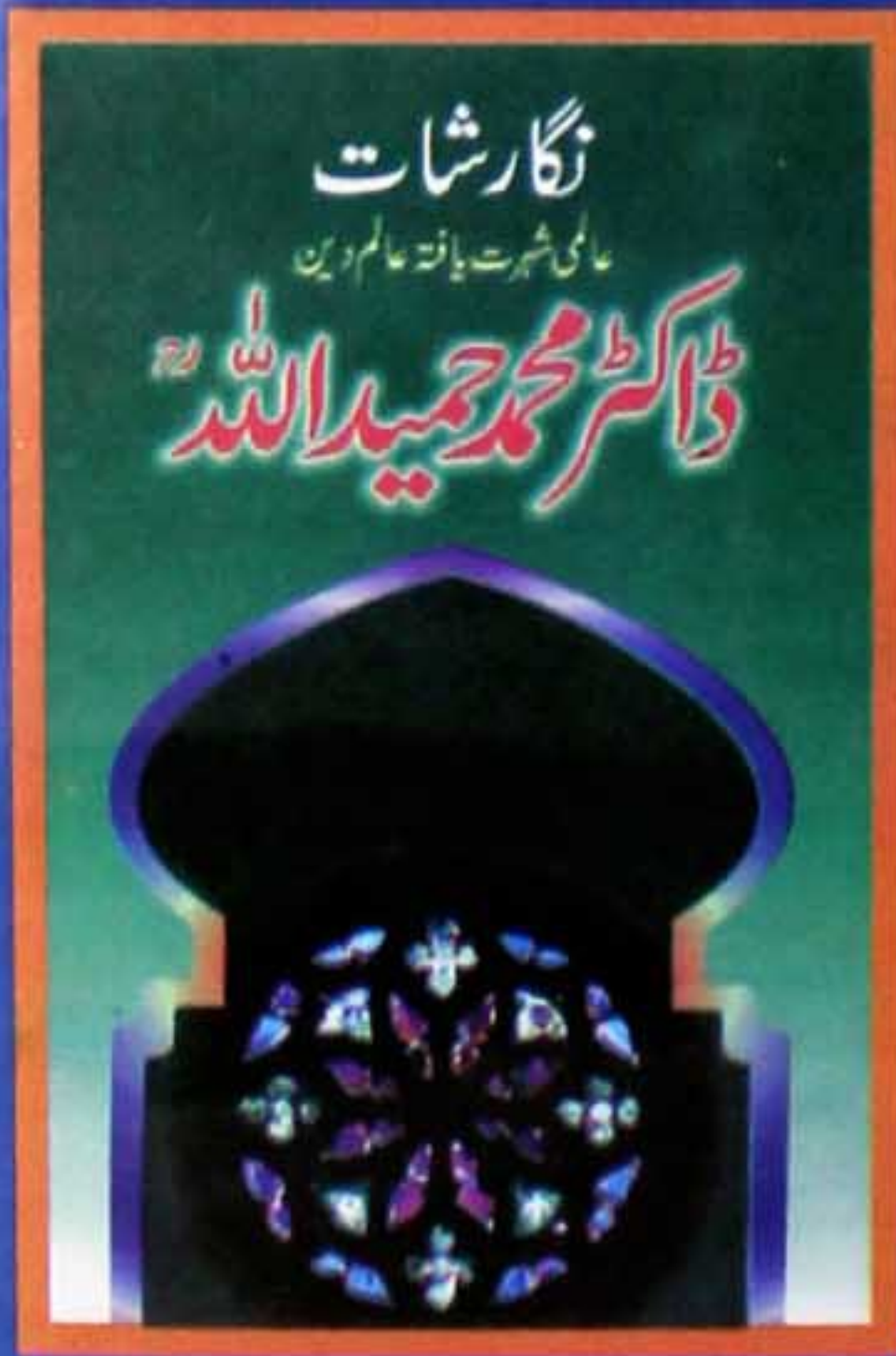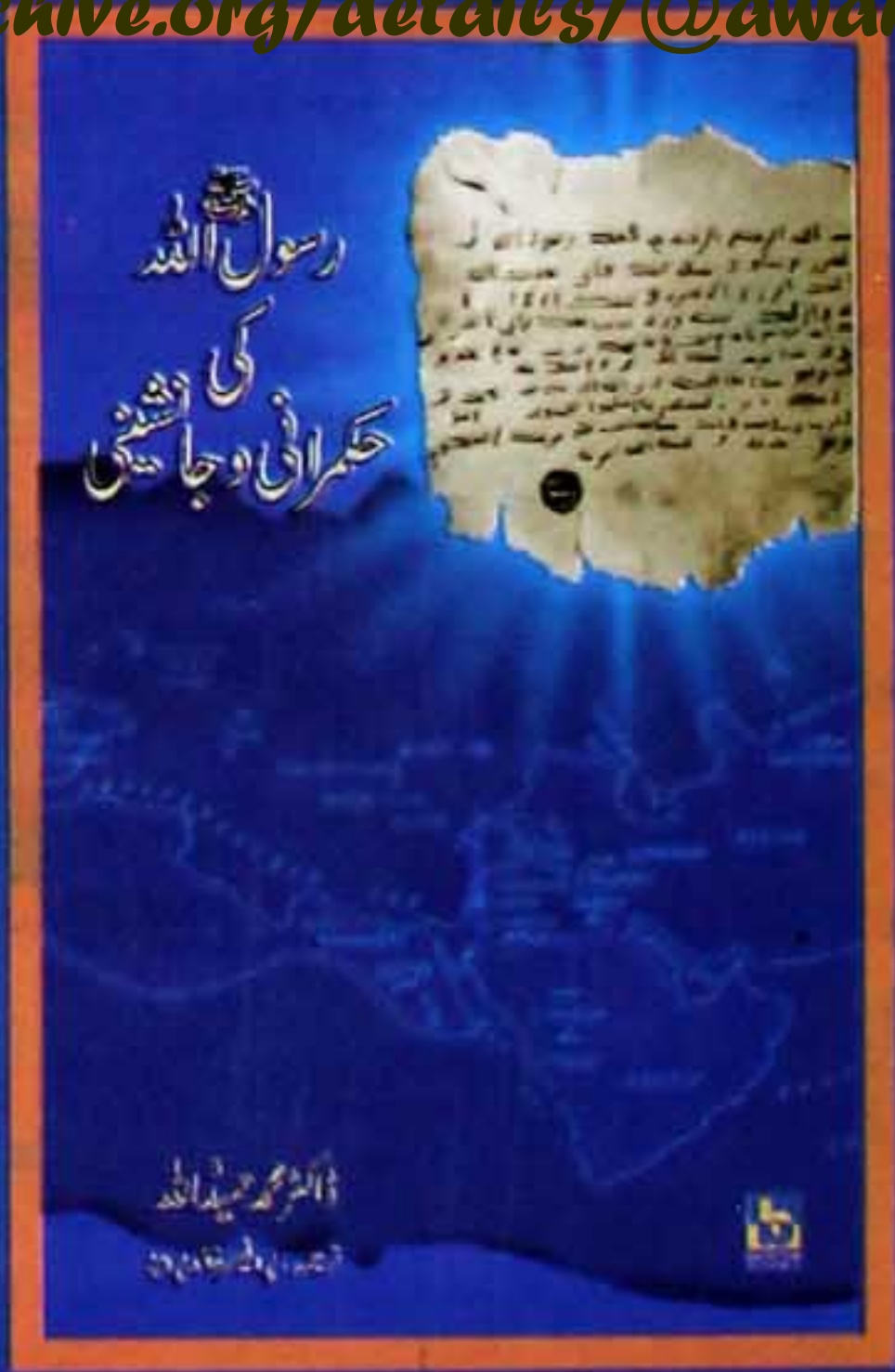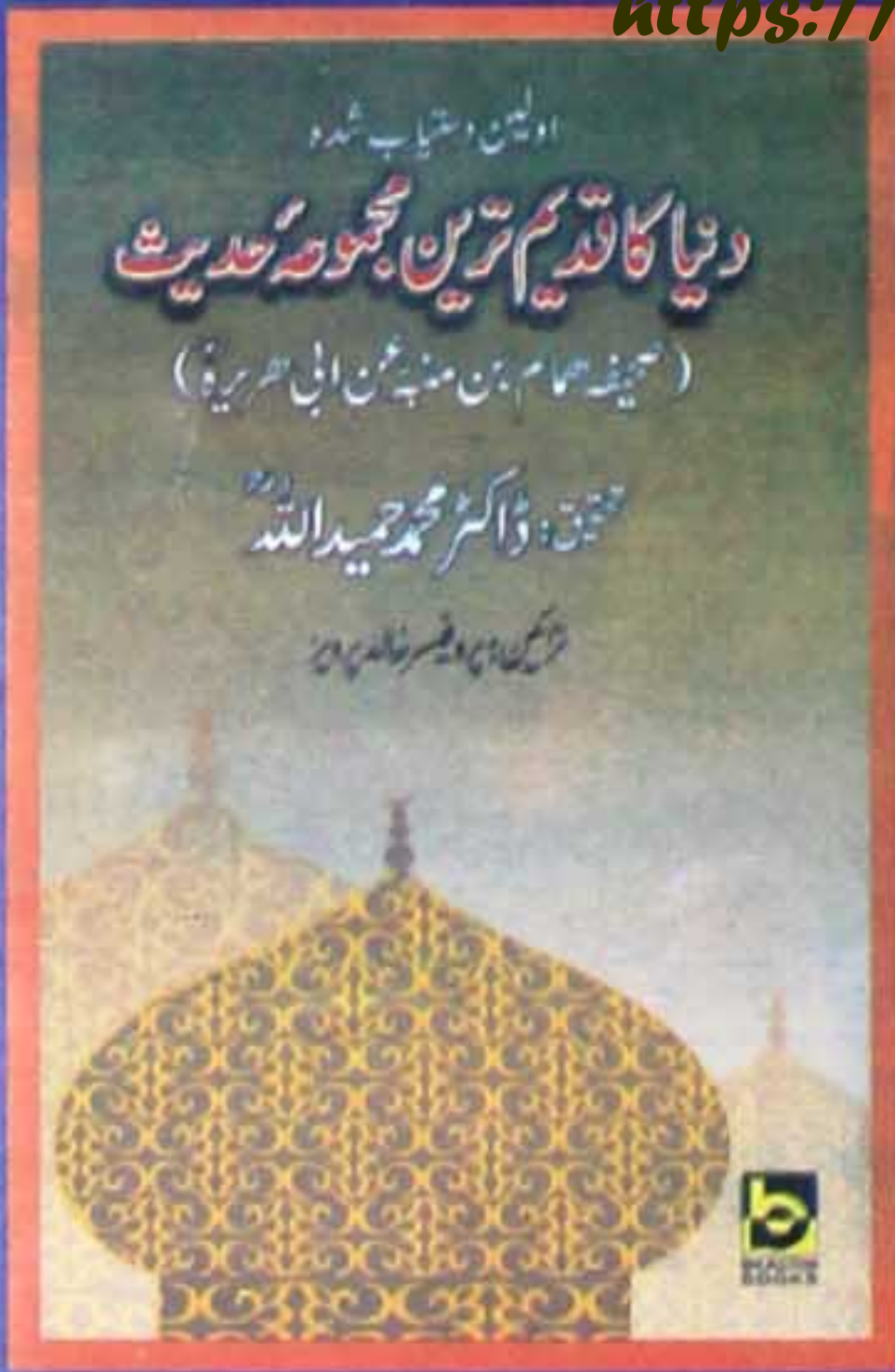
بیکن بکس
BEACON BOOKS
• غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور فون: 042-37320030
• گلگشت، ملتان فون: 061-6520790, 6520791
info@beaconbooks.com.pk
www.beaconbooks.com.pk